رجسٹرڈ نمبر اے ۔ ایل ۔ ٹی ۔ ایم ۔ ایل ۔ پی ۴۳ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

﴿مرتبہ﴾

ضیاء الدین اصلاحی

قیمت چالیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

۱. مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ۲. ڈاکٹر نذیر احمد علی گڑھ

۳. پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ ۔ ۴. ضیاء الدین اصلاحی

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف ستمبر ۸۲ء سے لے کر ستمبر ۸۳ء تک سلسلہ وار شائع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپیے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شائع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپیے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۲ روپیے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"

معارف اعظم گڈھ
کی
۱۴۷ویں جلد

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات	نمبر شمار	مضمون نگار	صفحات
۱	جناب ابوسفیان اصلاحی شعبہ عربی	۴۴، ۲۵۵	۷	جناب رام لعل نابھوی ماچھیواڑہ پنجاب	۲۰۹
	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ		۸	جناب ریاض الدین احمد صاحب	۴۳۴
۲	مولانا افتخار فریدی، مراد آباد	۳۹۳		جنرل سکریٹری، دینی تعلیمی کونسل	
۳	جناب حکیم الطاف احمد اعظمی	۴۳		یوپی، الہ آباد۔	
	جامعہ ہمدرد، دہلی		۹	پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی	۲۴۵
۴	جناب انعام الحق علی عثمان دان	۴۶۲		سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات	
	فودیو نیورسٹی، سیکوٹو، نائیجیریا			کشمیر یونیورسٹی سری نگر	
۵	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی	۱۱۰، ۱۹۲، ۲۸۶	۱۰	جناب شاکرہ صاحبہ وجیا نگر	۳۷۹
۶	مولانا حبیب ریحان خاں ندوی	۴۲۱		کالونی، حیدر آباد۔	
	معتمد تعلیم دارالعلوم تاج المساجد		۱۱	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی،	۸۵
	بھوپال			اسلام آباد، پاکستان	

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۷

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۴۷ ماہ جمادی الاخری سالہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ جنوری سالہ ۱۹۹۱ء عدد ۱

مضامین

معارف کی ڈاک

ادبیات

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں — فی شمارہ ۴ روپئے — سالانہ چندہ :- ۴۰ روپئے

پاکستان میں — سالانہ چندہ — سو روپئے

چندہ بھیجنے کا پتہ :- حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس. ایم کالج اسٹریچن روڈ کراچی پاکستان

بیرونی ملکوں میں — ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر
بحری ڈاک " " ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر

[illegible]

گزشتہ کئی مہینوں سے بابری مسجد کے تنازعہ کی وجہ سے پورے ملک میں ... [illegible]
اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہوئی ہے ... [illegible]
امن پسندی اور تمام مذاہب کے ساتھ عدم امتیاز کے بارے میں شک و شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے، خود
ملک میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے، کوئی شعبۂ زندگی بھی لاقانونیت اور انتشار سے خالی نہیں،
ہر جگہ خوف و دہشت کا ماحول ہے، پُرامن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، مسلمانوں کے لیے اپنے
گھروں سے نکلنا اور ناگزیر سفر کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، اترپردیش میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس کے
شعلے رہ رہ کر بھڑکتے اور پورے پورے خاندانوں کو بھسم کر دیتے ہیں، معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں
سے باہر پھینک دینا اور گاڑیوں کو روک کر بے گناہوں کا قتل عام کرنا فرقہ پرستوں کا معمول ہوتا
جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان میں کوئی مروت و شرافت رہ گئی ہے اور نہ تہذیب و شائستگی
جو ہندوستان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ہندوستان جنت نشان کہلاتا تھا، یہاں انسان تو درکنار جانوروں کو مارنا اور انھیں
ایذا دینا گناہ سمجھا جاتا تھا، لوگ نفرت و عداوت، ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت سے ناآشنا
اور ہمدردی، رحم دلی، صلح و آشتی اور الفت و محبت کے دلدادہ تھے، عفو و درگذر سے کام لینا،
اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا ان کی خصوصیت تھی، بدھ جی سے لے کر گاندھی جی تک کے
تمام رشیوں منیوں کی تعلیم و تلقین یہی تھی اور گاندھی جی نے تو ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو خون خرابہ سے
بچانے کے لیے اپنی جان ہی دے دی تھی، لیکن اب قومی ایکتا اور ہندو مسلم اتحاد خواب و خیال ہوگیا
ہے، اور ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے،
کسی کی جان و مال، عزت و آبرو اور عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں، دوسروں کی دلآزاری، اور
ان کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے میں خوشی محسوس کی جا رہی ہے اور کبھی اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ

[illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible] اکثریت کے [illegible]

[illegible] سر جھک گئے [illegible] کی حیثیت [illegible] تھی، چنانچہ بابری مسجد کے [illegible] میں، حکومت نے ہمیشہ آئین و قانون کی پاسداری [illegible] خود [illegible] کرنے والوں کی [illegible] نرم رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش کی، اس نے متعدد بار اس پر زور دیا کہ باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے ہو یا عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا جائے اور امن و امان کو باقی رکھا جائے، لیکن فرقہ پرستی کا امنڈتا ہوا سیلاب بابری مسجد سے ٹکرا کر رہا اور نفرت و تشدد کی آگ بھڑکانے والوں نے اسے نقصان پہونچا کر اور اس کے تقدس کو پامال کر کے ہی دم لیا، اس غیر آئینی اور سراسر جارحانہ اقدام کے خلاف حکومت کو حرکت میں آنا پڑا، جس کے نتیجے میں چند افراد ہلاک ہو گئے۔

یہ امر افسوسناک ضرور ہے، لیکن حکومت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا، جب اس کی ہر فہمائش رد کر دی گئی تو تشدد اور بغاوت پر آمادہ لوگوں کے خلاف وہ اس کے سوا اور کون سا قدم اٹھاتی، جو لوگ قانون کی بالادستی کو ختم کر کے اور ملک کو برباد کر کے اپنی قیادت چمکانے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں تھے، کیا وہ کسی نرمی اور رعایت کے مستحق تھے مگر اس کے باوجود انھیں بے قصور کہا جا رہا ہے اور ایودھیا کے واقعات کی عدالتی تحقیقات اور "شہیدوں" کو معاوضہ دیے جانے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے، یہ مطالبہ فرقہ پرستوں کی جانب سے ہوتا تو تعجب نہ ہوتا، لیکن ان کے سُر میں سُر ملانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن کو اپنی انصاف و معقولیت پسندی پر ناز ہے کیا بابری مسجد کو ڈھا کر چین ملتا؟

ملک میں آئے دن فسادات ہوتے ہیں جن میں بے شمار بے گناہ مارے جاتے ہیں، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، خود بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کے نتیجہ میں گھر کے گھر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گزشتہ کئی مہینوں سے بابری مسجد کو مندر بنانے کی جو مہم پورے زور و شور سے جاری ہے، پتہ نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہو رہی ہے اور اس کی رواداری، امن پسندی اور تمام مذاہب کے ساتھ عدم امتیاز کے بارے میں شک وشبہ ظاہر کیا جارہا ہے، خود ملک میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے، کوئی شعبۂ زندگی بھی لاقانونیت اور انتشار سے خالی نہیں، ہر جگہ خوف و دہشت کا ماحول ہے، پُرامن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، مسلمانوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلنا اور ناگزیر سفر کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، اترپردیش میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس کے شعلے رہ رہ کر بھڑکتے اور پورے پورے خاندانوں کو بھسم کردیتے ہیں، معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں سے باہر پھینک دینا اور گاڑیوں کو روک کر بے گناہوں کا قتل عام کرنا فرقہ پسندوں کا معمول ہوتا جارہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان میں کوئی مروت و شرافت رہ گئی ہے اور نہ تہذیب و شائستگی جو ہندوستان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ہندوستان جنت نشان کہلاتا تھا، یہاں انسان تو درکنار جانوروں کو مارنا اور انھیں ایذا دینا گناہ سمجھا جاتا تھا، لوگ نفرت و عداوت، ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت سے ناآشنا اور ہمدردی، رحم دلی، صلح و آشتی اور الفت و محبت کے دلدادہ تھے، عفو و درگذر سے کام لینا، اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا ان کی خصوصیت تھی، بدھ جی سے لے کر گاندھی جی تک کے تمام رشیوں منیوں کی تعلیم و تلقین یہی تھی اور گاندھی جی نے تو ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو خون خرابہ سے بچانے کے لیے اپنی جان ہی دے دی تھی، لیکن اب قومی ایکتا اور ہندو مسلم اتحاد خواب و خیال ہوگیا ہے، اور ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، کسی کی جان و مال، عزت و آبرو اور عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں، دوسروں کی دلآزاری، اور ان کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے میں خوشی محسوس کی جارہی ہے اور کبھی اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ

ان مجنونانہ حرکتوں سے آزاد ہندوستان کی تصویر کتنی بدنما ہوتی جارہی ہے۔

یہ بجا ہے کہ ایودھیا کے واقعات کی مذمت بھی ہو رہی ہے، ان سے اکثریت کے انصاف پسند، معقول اور سنجیدہ لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے ہیں اور وہ اس کھلی جارحیت اور انتہا پسندانہ رویہ کی مخالفت کررہے ہیں، حکومت نے بھی آئین و قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خود ہر کاروائی کرنے والوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری نباہنے کی کوشش کی، اس نے متعدد بار اس پر زور دیا کہ باہمی گفت وشنید سے معاملہ طے نہ ہو تو عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا جائے اور امن وامان کو باقی رکھا جائے، لیکن فرقہ پرستی کا امنڈتا ہوا سیلاب بابری مسجد سے ٹکرا کر رہا اور نفرت وتشدد کی آگ بھڑکانے والوں نے اسے نقصان پہونچا کر اور اس کے تقدس کو پامال کرکے ہی دم لیا، اس غیر آئینی اور سراسر جارحانہ اقدام کے خلاف حکومت کو حرکت میں آنا پڑا، جس کے نتیجے میں چند افراد ہلاک ہو گئے۔

یہ امر افسوسناک ضرور ہے، لیکن حکومت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا، جب اس کی ہر فہمایش رد کردی گئی تو تشدد اور بغاوت پر آمادہ لوگوں کے خلاف وہ اس کے سوا اور کون سا قدم اٹھاتی، جو لوگ قانون کی بالادستی کو ختم کرکے اور ملک کو برباد کرکے اپنی قیادت چمکانے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں تھے، کیا وہ کسی نرمی اور رعایت کے مستحق تھے مگر اس کے باوجود انھیں بے قصور کہا جارہا ہے اور ایودھیا کے واقعات کی عدالتی تحقیقات اور "شہیدوں" کو معاوضہ دیے جانے کے لیے اصرار کیا جارہا ہے، یہ مطالبہ فرقہ پرستوں کی جانب سے ہوتا تو تعجب نہ ہوتا، لیکن ان کے سُر میں سُر ملانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن کو اپنی انصاف و معقولیت پسندی پر ناز ہے کیا بابری مسجد کو ڈھا کر چین ملتا؟

ملک میں آئے دن فسادات ہوتے ہیں جن میں بے شمار بے گناہ مارے جاتے ہیں، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، خود بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کے نتیجہ میں گذرے کچھ

اور بستی کی بستی کا صفایا ہوگیا، بارہ بنکی میں معمولی احتجاج کرنے پر لوگ گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے مگر نہ ان کے معاوضہ کی بات ہوئی اور نہ عدالتی تحقیقات کے مطالبہ نے زور پکڑا، اگر ایودھیا میں ظلم و زیادتی کا راستہ اختیار کرنے والے تحسین و آفریں اور انعام و اکرام کے مستحق ہیں تو پنجاب اور کشمیر کے دہشت گردوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک اس وقت بہت نازک اور بحرانی دور سے گذر رہا ہے، فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر نے مذہب کے نام پر سیاست کا کاروبار شروع کرکے ملک کو بہت پیچھے کر دیا ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ملک کی وحدت و سالمیت باقی نہیں رہ جائے گی اور اسکی دیرینہ نیک نامی اور ہزاروں برس پرانی روایات خاک میں مل جائیں گی، اس وقت محب وطن دانشوروں اور اخلاق و اقدار کے پاسبانوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور ملک کے وسیع تر مفاد میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور نفرت و تشدد کے بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے، یہ صرف ایک مسجد اور مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ملک و قوم کی بربادی کا پیش خیمہ ہے، ایسے اہم اور نازک معاملہ میں خاموشی و بے پروائی جرم ہے، جس کی تلافی ممکن نہ ہوگی ارباب سیاست سے سیدھے سادے لوگ گھبرا اٹھے ہیں، ان کے خطرناک کھیل سے نیک طینت اور دوراندیش دانشور ہی ملک کو بچا سکتے ہیں ؎

زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے پرانی سیاست گری خوار ہے

شذرات کی کتابت ہوچکی تھی کہ پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ کے مکتوب گرامی سے قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کے انتقال کی خبر ملی، ان پر آئندہ نمبر میں پروفیسر صاحب کا مضمون شائع ہوگا، ڈاک کا نظام اتنا خراب ہے کہ خطوط بہت تاخیر سے اور اکثر سرے سے نہیں ملتے۔

مقالات

دیوان معین الدینؒ کے بارے میں کچھ گذارش

از

پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

یہ دیوان جس کا ذکر اس مقالے میں آرہا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے نام سے نول کشور پریس میں شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں طبع ہوا تھا، اس کے کچھ قلمی نسخے بھی حضرت خواجہ کے نام سے ملتے ہیں، اور گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے بعض تذکروں میں حضرت کے نام سے اور بعض میں معین مسکین ہروی کے نام سے یہ دیوان منسوب ہوا ہے، لیکن اس کا انتساب حضرت کی طرف غلط ہے، یہ معین مسکین ہروی کا ہے جیسا کہ حافظ محمود شیرانی نے رسالۂ اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۲۴ء میں واضح دلائل سے ثابت کر دیا ہے، معین الدین فراہی ہروی کا لقب ملا مسکین تھا جو معین الدین واعظ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، معین الدین شاعر تھے اور معین، معین مسکین، معینی، مسکین معینی تخلص کرتے تھے، وہ بڑے درجہ کے واعظ تھے، اور زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے وعظ و تلقین میں صرف کر دیا تھا، علاوہ دیوان کے وہ متعدد تصانیف کے مالک ہیں جن میں معارج النبوۃ سب سے زیادہ مشہور[1] ہے، مصنف اس کتاب کی تصنیف میں ۸۹۱ھ

[1] یہ کتاب کم از کم چار بار لکھنؤ، لاہور، کانپور اور بمبئی سے طبع ہو چکی ہے۔

سے ۸۹۶ھ تک مصروف رہا، ۸۹۶ھ کے اس کے ایک نسخے کا ذکر C.A. Storey نے پرشین لٹریچر میں کیا ہے، ان کی دیگر تصانیف میں تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ یوسف بنام حدائق الحقائق، اعجاز موسوی جو تاریخ موسوی وغیرہ ناموں سے مشہور ہے" قابل ذکر ہیں،

معین ہروی نے اپنی اکثر تصانیف کا ذکر اپنی کتابوں کے مقدمے میں کر دیا ہے، ان کی تصانیف کی منجملہ اور خصوصیات کے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ اپنے کافی اشعار نقل کرتے ہیں، کبھی "لمؤلفہ" کبھی "فقیر گوید"، کبھی "فقیر تو گوید" کے فقرات کے ساتھ، جن سے ان اشعار کی نسبت خود ان کی طرف مسلم ہو جاتی ہے، حافظ محمود شیرانی نے ان کی چند کتابوں میں ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو "دیوان معین الدین" میں شامل ہیں۔

یہ وہ زبردست قرینہ ہے جس سے یہ بات یقین کے درجے پر پہونچ جاتی ہے کہ یہ دیوان معین ہروی کا ہے، اور چونکہ آخر الذکر نے ایک دو بار نہیں بیسیوں بار دیوان کی متعدد غزلیں اپنی نثری تصانیف میں اپنے نام سے درج کی ہیں تو ان کے دیوان معین الدین کے مالک ہونے میں کون سا شبہہ باقی رہ جاتا ہے، حد یہ ہے کہ صرف ایک دو کتابوں میں نہیں بلکہ ان کی جملہ تصانیف میں دیوان میں مندرج غزلیں نقل ہیں، اور ایسا بھی ہے کہ بعض غزلیں بتکرار درج ہوئی ہیں، ادبی تحقیق میں اس طرح کے شواہد کہ خود مصنف اپنی تصنیف کا شاہد[۱] ہو، بہت ہی شاذ ہیں۔

یہ تو رہی ایک بات، دوسری اہم بات یہ ہے کہ دیوان کی متعدد غزلوں میں وہ اپنے کو معین مسکین کے نام سے یاد کرتے ہیں، مثلاً

مسکین معین در رہ ہر دم سے زان لعل دیگر گوں زند (دیوان مطبوعہ ص ۲۵)

---

[۱] دیوان میں شامل غزلوں کے بارے میں اپنی ملکیت کا بیان پورے دیوان کی ملکیت کا ثبوت ہے۔

جلوۂ مسکیں معین بر تاج و منبر کردہ اند (ص ۳۴)

مسکین معینی تاکنوں در شام غم ماندہ زبون (ص ۳۲)

گر دل مسکین معین از جادوو معذور دار (ص ۳۹)

از غمت مسکین معین ہر دم بدردے مبتلاست (ص ۶۶)

چوں دل مسکین معیں آئینہ تست اے کریم (ص ۷۶)

گنگ شد مسکین معین ہم خود ثنائے خود بگو (")

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل (ص ۸۰)

یہی فقرہ مسکین معین یا معین مسکین، معین الدین فراہی کی نثری تصنیف میں برابر ملتا ہے، مثلاً حدائق مطبوعہ تہران ص ۲ :

بندۂ ضعیف مسکین معین الدین

نسخۂ موزۂ ملی پاکستان کراچی

بندۂ ضعیف مسکین معین (دیکھیے فہرست ص ۱)

نسخۂ حدائق الحقائق = بحر الدرر، نسخۂ موزۂ ملی پاکستان کراچی

بعد ہمی گوید بندۂ ضعیف معین مسکین (فہرست ص ۵)

نسخۂ رسالہ نعت احمد، شیفتہ ۵/۱۴ کتابخانۂ دانشگاہ علی گڑھ۔

ورق ۱ ب : خلائق ہژدہ ہزار عالم از اہل آسمان و زمین

تخصیص معین مسکین غلام و چاکر اوست

تفسیر حدایق الحقایق کے سرورق پر ان کا نام اس طرح ملتا ہے : معین الدین فراہی ہروی مشہور بہ ملا مسکین۔

اس توضیح سے ظاہر ہے کہ معین مسکین جو مندرجۂ بالا کتابوں کا مصنف ہے وہی دیوان کا بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ متعدد غزل میں معین الدین کا تخلص معینی آیا ہے، مثلاً:

ہرچہ خواہی با معینی بیش بر از لطف و مہر (ص ۶)
تقصیر معینی کہ بنا بر کرم اوست (ص ۹)
بر معینی ہمہ معلوم بہ اعلام دلست (ص ۱۱)
گر معینی بیش ازیں گفتی ز حسنش شمۂ (۱۲)
خموش باش معینی و دم مزن ہمہ اوست (۱۳)
در باغ و بوستانم دیگر مخواں معینی (ص ۲۱)

یہی تخلص معینی بعض ان غزلوں میں آیا ہے، جو معین الدین فراہی کی نثری تصانیف میں درج ہیں، اور مطبوعہ دیوان سے خارج، مثلاً تاریخ موسوی (عبدالسلام کلکشن ۱/۱) کتابخانہ دانشگاہ علی گڑھ ورق ۲۷ ب پر یہ غزل درج ہے[1]:

اگر بوادی ایمن بروں بری راہی — تو ہم ز خود شنوی نعرۂ انا اللّٰہی!
ز قید تن بدر آ و فضائے عالم جان — ببیں ز روزن دل تا بحضرتش راہی
بظلمت شب ہجراں ز مطلع غیبی — عجب مدار کہ سر بر زند یکے ماہی
ز چشمۂ دلت آب حیات بر جوشد — چنانکہ طلعت یوسف بر آمد از چاہی
تو غافلی چہ شناسی ز سر نور وجود — کہ نیست مظہر آں جز ضمیر آگاہی
حجاب ظلمت نور از میان تو برداشت — اگر ہزار بود فی المثل یکی آہی

---

[1] یہ غزل مطبوعہ نسخہ میں نہیں، لیکن نسخہ دیوان عبدالسلام کلکشن ۵۵/۲۲ ورق ۵ الف پر موجود ہے

به باغ قدس بهر دم گلی دگر شگفد　　ازاں نفس که برآید ز دل سحر گاہی
برفت جان زمعینی و تن بکوئے تو ماند　　که تا یگان تو یادی کند گہی گاہی
مزید حشمت و جاه است اگر ز روئے کرم　　گہی تفقدی حال گدا کند شاہی

حدائق الحقائق ص ۶۸۴ پر معینی تخلص کی یہ بیت ملاحظہ ہو جو مطبوعہ[1] دیوان میں نہیں ہے؛

معینی دیدۂ غیرت ببست از دیدن غیرت　　مگر ایں چشم پر عبرت بدیدار تو بکشاید

ذیل میں معین فراہی کی چند کتابوں سے ان کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں سے متعدد نظمیں دیوان میں موجود ہیں:

رسالہ نعوت احمد

نسخۂ خطی، شیفتہ کلکشن $\frac{55}{143}$ ورق ۴۱، ۵ اسطری خط نستعلیق مائل بہ نسخ، ناقص الطرفین: ابتدا:

از شمائم رایحۂ روح پرور ... خلائق ہژدہ ہزار عالم از اہل آسمان و زمین بتخصیص معین مسکین غلام و چاکر اوست .. صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین۔

ورق ۱۷۔ ای تو سلطانِ دارِ ملک وجود ہمہ عالم طفیل تو مقصود

یہ غزل مطبوعہ دیوان ص ۲۱ - ۲۲ پر موجود ہے، خطی نسخے میں ایک بیت زیادہ ہے، مقطع میں دونوں میں تفاوت ہے:

می فرستد معین بخدمت تو	می فرستد معین درود بتو
صد ہزاراں درود نا معدود	حق تعالیٰ شود ز من خوشنود

[1] قلمی نسخے میں بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

ورق ۱۹ اب۔ عالم نمی از رشحہ بحر کرم اوست ؛ آدم کف خاکی ز غبار قدم اوست

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں ص ۸۔۹ پر ہے، اس کی دوسری بیت :

آدم شدہ بیدار و ہنوز او بہ شکم خواب　　شاباش وجودی کہ طفیل عدم اوست

خطی نسخے میں نہیں ہے، مقطعے دونوں کے ایک ہیں :

داریم امیدی کہ نپرسند بہ محشر　　تقصیر معینی کہ بنا بر کرم اوست

ورق ۲۶و　در دل چو کرد منزل جاناں یا محمد　　صد در گشاد در دل از جان یا محمد

مطبوعہ کی حسب ذیل بیت خطی نسخے سے غائب ہے :

امروز خون عاشق در عشق اگر ہدر شد　　فردا ز دوست خواہد تاوان یا محمد

مقطع دونوں میں یہ ہے :

در باغ و بوستانم دیگر مخواں معینی　　باغم بس است قرآں بستان یا محمد

ورق ۳۰و :

پیش از آں کاستاد فطرت فرش ایوان ساختہ ؛ پایۂ قدرت فراز کون و امکان ساختہ

اس میں نسخۂ خطی میں دس شعر ہیں، جبکہ مطبوعہ میں پندرہ شعر ہیں، اس کے پانچ شعر زائد یہ ہیں : (ص ۸۱ ـ ۸۲)

ہمچو بسم اللہ بہ منشور قرآنت خدای　الخ

اہل راں عنوان درحمت کردہ ظاہر اندریں　الخ

دشمناں اندکیں تو بہ نار حرماں سوختہ　الخ

نار نمرودی بہ ابراہیم گر شد گلستاں　الخ

بہر فرزند خلیل ار گوسفند آمد فدا　الخ

مقطع یہ ہے:

رحمۃ للعالمینی بر معینی رحم کن — کز جہالت خویش را محکوم شیطان ساختہ

قصۂ حضرت موسیٰ / اعجاز موسوی

نسخۂ خطی، عبدالسلام کلکشن (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری)۔ ۱/۲ ورق ۱۲۰، تقطیع کلاں، ۲۱ سطری نستعلیق جدید، اس کے اور نام ہیں: اعجاز موسوی حالاتِ موسوی، یہ نسخہ چھپ چکا ہے، لیکن میرے پیش نظر قلمی نسخہ ہے:

ورق ۲۷ ب لمولفہ فی ہذا المعنیٰ

آتشی آمد پدید و جسم و جاں یکسر بسوخت — دل درون سینہ ام چوں عود در مجمر بسوخت

اس میں سات بیت ہیں، مطبوعہ نسخہ میں یہ غزل ص ۱۲-۱۳ پر ہے اور اس میں بھی سات ہی بیت ہیں، مقطع یہ ہے:

خلق گوید م معین ایں رمز بر منبر مگوی — آہ کیں آتش ہزاراں واعظ و منبر بسوخت

۱۴ ا ابیات لمؤلفہ:

آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت ؛ گفتم آہے بر کشم کام و زبان من بسوخت

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں ص ۱۱-۱۲ پر نقل ہے، مطبوعہ میں ۱۱ شعر اور قلمی میں چھ شعر ہیں، خطی نسخہ میں ورق ۲۹ ب پر یہی غزل دوبارہ نقل ہے، چنانکہ فقیر گوید: آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت الخ۔ یہاں آٹھ شعر ہیں، مقطع یہ ہے:

گر معینی بیش ازیں گفتی ز حسنش شمۂ — ایں زماں نور رخش شرح و بیان من بسوخت

۲۷ ا فقیر را نیز دریں معنی سرّی بر خاطر خطور کردہ است، عرضہ می دارم:

اگر بوادیٔ ایمن بروں بری راہے — تو ہم ز خود شنوی نعرۂ انا اللّٰہی

اس میں نو۹ شعر ہیں اور بیت تخلص یہ ہے :

برفت جان ز معینی و تن بکوئے تو ماند کہ تا سگان تو یادی کنند گہی گاہی

یہی غزل حدائق الحقائق مطبوعہ ص ۴۷ پر موجود ہے، اس میں سات شعر ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، البتہ قلمی دیوان، احسن گلکشن ۸۵/۲۲ ورق ۶۵ پر موجود ہے۔

ورق ۶۸ ر ابیات لمؤلفہ :

ترا می خواہم اے دلبر کہ می بینم توئی مقصود من در ہر کہ بینم

یہ مطبوعہ دیوان ص ۵۵ پر نقل ہے، قلمی اور مطبوعہ دونوں میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے :

معین امروز می خواہد وصالش ندارد صبر تا محشر کہ می بینم

۶۸ ر لمؤلفہ عفی عنہ :

محبوب خود ای عاشق از غیر چرا جوئی او را ہم از و بطلب گر مرد خدا جوئی

اس میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے :

در گوش دلم ہر دم از غیب ندا آید گم کرد معین در خود گر زانکہ مرا جوئی

یہی غزل حدائق الحقائق میں ص ۱۴۱ پر اس طرح آئی ہے :

چنانکہ نقیر گوید : محبوب تو اے عاشق از غیر چرا جوئی الخ، اس میں صرف ۲ بیت درج ہیں، لیکن یہ غزل مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے احسن گلکشن ورق ۶۵ پر موجود ہے۔

۶۸ ر لمؤلفہ :

من ازاں دیدہ کہ دیدار نہ بینم چہ کنم من ازآں یار کہ اغیار گزیند چہ کنم

اس غزل کے صرف چار شعر یہاں نقل ہیں، اور یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے (احسن گلکشن ورق ۴۲ و) میں نقل ہے۔

۷۰ و لمؤلفہ عفی عنہ:

خزینہ ہاست مرا پُر ز نقد علم و ادب کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب

اس کے تین شعر نسخۂ خطی میں آئے ہیں، دو بیت یہ ہیں:

مباش تشنہ لب اندر بہ وادیٔ عصیاں الخ

نظر بہ رحمتِ ما کن مخور فریب عمل الخ

مطبوعہ نسخے میں ۱۱ ابیات ہیں، گویا ۸ بیت زائد (دیکھیے دیوان ص ۷-۸)

۷۲ و ہر کرا روز ازل رزقی بمقدر کردہ اند ؛ در برائے ہر کسی کاری مقرر کردہ اند

کل ۷ بیت ہیں، مطبوعہ (ص ۳۳) میں ۱۶ بیت، بیت موجودہ ۱، ۲، ۴، ۶، ۷، ۸، ۹ ہیں۔

۷۴ ب، مندرجۂ بالا غزل کے تین شعر یہاں درج ہیں ۱، ۲، ۹۔

۷۴ ب، چناں از روزن دل نور آں دلداری تابد

کہ خورشید جمالش از در و دیوار می تابد

خطی نسخہ میں صرف ۶ شعر، مطبوعہ دیوان ص ۳۵ میں ۱۴ شعر، خطی کے اشعار یہ ہیں: ۱، ۲، ۳، ۶، ۹، ۱۰۔

۷۵ و لمؤلفہ

یا رب ایں صورت کہ در مرآۃ جہاں پیدا کیست ؛ آنچناں حسنی دریں پردہ نہاں پیدا کیست

خطی نسخے میں ۵ بیت اور مطبوعہ میں ۷، خطی نسخے کی یہ بیت مطبوعہ نسخے سے خارج ہے

اے کہ حسن او نمی بینی مرا معذور دار   مہبط انوار حسنش در جہاں پیدا است کیست

مطبوعہ نسخے کی بیت سوم و پنجم و ہفتم خطی میں نہیں۔

۷۵ ب۔ لمؤلفہ

ہر نظر در خورِ دیدارش نیست   ہر دلی واقف دیدارش نیست

لمعۂ نور تجلی است قوی،   دیدہ را طاقت انوارش نیست

کہ کند در رخ خورشید نظر   گرنہ آئینۂ رخسارش نیست

چونکہ خورشید رخش جلوہ کند   ذرۂ کو کہ ہوا دارش نیست

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں، اور احسن گلکشن کے نسخۂ خطی اور دوسرے ایک اور خطی نسخے میں نہیں پائی جاتی۔

۷۵ ب، لمؤلفہ

سر زلف عنبریں را بہ کرشمہ تاب دادی   ز تنم قرار بردی بہ دل اضطراب دادی

ز نقاب تو بہ رشکم کہ برخ فرو گذاری   کہ چرا فروغِ رویت ہمہ با نقاب داری

ز فروغ نور رویت بہ جہاں خبر کہ دارد   کہ بہ اذاں نہ مرنمودی نہ بہ آفتاب دادی

یہ غزل مطبوعہ نسخے سے خارج ہے، لیکن نسخۂ خطی احسن گلکشن ورق ۳۴۲ الف پر موجود ہے

۷۶ الف لمؤلفہ

پردہ بکشای کہ جاں عزم تماشا دارد   نظری در رخت از دور تمنا دارد

دیدہ را خود چہ محل ہر کہ ترا می جوید   جان جدا سازد اگر دیدہ بینا دارد

مطبوعہ نسخے میں اسی ردیف و مشابہ قوافی کے ساتھ ایک دوسری غزل ہے جس کا

مطلع یہ ہے:

راہ بکشائے کہ دل میل بہ بالا دارد — پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد
(ص ۲۹)

اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی نے اس ردیف و قوافی میں دو[2] غزلیں لکھی تھیں، یہ غزل نسخۂ خطی میں بھی نہیں ہے۔

۱۱۴ ب ۔ لمولفہ

یاز[1] دور بررو‌ی اصحاب طلب بکشاد باز — صیت بل من تائب اندر جہاں در داد باز

شہر معمور دلم کز سیل ہجراں شد خراب — شد[2] ز معماری وصلت عاقبت آباد باز

از یمین وازیسار قلب من در تاخت عشق — عقل مغلوب آخر در غلاب افتاد باز

گفتمش عکس جمالت چوں مرا موجود کرد — تا بمانم زندہ زاں بویم[3] بباید داد باز

لمعۂ از پرتوِ نورِ تجلی زد علم — طورِ ہستی مرا برکند از بنیاد باز

گفت از ہستی من لات از وجود من مزن — کی تواں کردن وکان بالا ترازاستاد باز

مطبوعہ نسخے میں گیارہ بیت ہیں یعنی پانچ بیت زیادہ ہیں (ص ۴۰ ۔ ۴۱)

حدایق الحقایق

یہ سورۂ یوسف کی مفصل تفسیر ہے، جو احسن القصص کے نام سے بھی مشہور ہے، اس کے نسخے عام[4] طور پر ملتے ہیں، تین بار طبع ہو چکی ہے، پہلی بار تہران میں بنام احسن القصص جو بہ دستور بہرام میرزا، دوبارہ لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں، اور تیسری بار تہران میں ۱۳۶۴ شمسی میں، اس کے سرورق پر یہ عبارتیں ہیں:

---

[1] خطی میں بار [2] مطبوعہ: شاید از [3] مطبوعہ: تو تم [4] کتاب خانہ گنج بخش لاہور میں اس کے احسن القصص نام سے گیارہ نسخے ہیں، دیکھیے فہرست ج ۱ ص ۴۴ ـ ۵۔

اس میں ۹ شعر ہیں اور بیت تخلص یہ ہے:

برفت جان ز معینی و تن بکوئے تو ماند   کہ تا سگان تو یادی کنند گہی گاہی

یہی غزل حدائق الحقائق مطبوعہ ص ۴۷ پر موجود ہے، اس میں سات شعر ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، البتہ قلمی دیوان، احسن گلگشن ۵۴۵/۲۲ ورق ۵ الف پر موجود ہے۔

ورق ۶۸ ل ابیات لمؤلفہ:

ترا می خواہم اے دلبر کہ می بینم   توئی مقصود من در ہر کہ بینم

یہ مطبوعہ دیوان ص ۵۵ پر نقل ہے، قلمی اور مطبوعہ دونوں میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے:

معین امروز می خواہد وصالش   ندارد صبر تا محشر کہ می بینم

۶۸ ل لمؤلفہ عفی عنہ:

محبوب خود ای عاشق از غیر چرا جوئی   او را ہم از و بطلب گر مرد خدا جوئی

اس میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے:

در گوش دلم ہر دم از غیب ندا آید   گم کرد معین در خود گر زانکہ مرا جوئی

یہی غزل حدائق الحقائق میں ص ۱۴۱ پر اس طرح آئی ہے:

چنانکہ فقیر گوید: محبوب تو اے عاشق از غیر چرا جوئی الخ، اس میں صرف ۴ بیت درج ہیں، لیکن یہ غزل مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے احسن گلگشن ورق ۵ آ پر موجود ہے۔

۶۸ ل لمؤلفہ:

من ازاں دیدہ کہ دیدار نہ بینم چہ کنم   من ازآں یار کہ اغیار گزیند چہ کنم

اس غزل کے صرف چار شعر یہاں نقل ہیں، اور یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے (احسن گلگشن ورق ۴۲ و) میں نقل ہے۔

۷۰ و لمولفہ عفی عنہ :

خزینہ ہاست مرا پُر ز نقد علم و ادب   کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب

اس کے تین شعر نسخۂ خطی میں آئے ہیں، دو بیت یہ ہیں:

مباش تشنہ لب اندر بہ وادئ عصیاں الخ

نظر بہ رحمتِ ما کن مخور فریب عمل الخ

مطبوعہ نسخے میں ۱۱ ابیات ہیں، گویا ۸ بیت زائد (دیکھیے دیوان ص ۷-۸)

۷۲ و   ہر کرا روز ازل رزقی بمقدر کردہ اند ؛ در برائے ہر کسی کاری مقرر کردہ اند

کل ۷ بیت ہیں، مطبوعہ (ص ۳۳) میں ۱۶ بیت، بیت موجودہ ۱، ۲، ۴، ۶، ۷، ۸، ۹ ہیں۔

۷۴ ب ، مندرجۂ بالا غزل کے تین شعر یہاں درج ہیں ۱، ۲، ۶۔

۷۴ ب ، چناں از روزن دل نور آں دلداری تابد

کہ خورشید جمالش از در و دیوار می تابد

خطی نسخہ میں صرف ۶ شعر، مطبوعہ دیوان ص ۳۵ میں ۱۴ شعر، خطی کے اشعار یہ ہیں: ۱، ۲، ۳، ۶، ۹، ۱۰۔

۷۵ و لمولفہ

یارب ایں صورت کہ در مرآۃ جہاں پیداست کیست ؛ آنچناں حسنی دریں پردہ نہاں پیداست کیست

خطی نسخے میں ۵ بیت اور مطبوعہ میں ۷، خطی نسخے کی یہ بیت مطبوعہ نسخے سے خارج ہے

اے کہ حسن او نمی بینی مرا معذور دار   مہبط انوار حسنش در جہاں پیدا است کیست

مطبوعہ نسخے کی بیت سوم و پنجم و ہفتم خطی میں نہیں۔

۷۵ ب ۔ لمؤلفہ

ہر نظر در خور دیدارش نیست   ہر دلی واقف دیدارش نیست

لمعۂ نور تجلی است تو ی،   دیدہ را طاقت انوارش نیست

گر کند در رخ خورشید نظر   گرنہ آئینۂ رخسارش نیست

چونکہ خورشید رخش جلوہ کند   ذرۂ کو کہ ہوا وارسش نیست

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں، اور احسن گلکشن کے نسخۂ خطی اور دوسرے ایک اور خطی نسخے میں نہیں پائی جاتی۔

۷۵ ب ۔ لمؤلفہ

سر زلف عنبریں را بہ کرشمہ تاب دادی   ز تنم قرار بردی بہ دل اضطراب دادی

ز نقاب تو بہ شکم کہ برخ فرو گذاری   کہ چرا فروغ رویت ہمہ با نقاب داری

ز فروغ نور رویت بہ جہاں تحیر دارد   کہ بہ اذاں نہ منمودی نہ بہ آفتاب دادی

یہ غزل مطبوعہ نسخے سے خارج ہے، لیکن نسخۂ خطی احسن گلکشن ورق ۴۲ الف پر موجود ہے

۷۶ ا لمؤلفہ

پردہ بکشای کہ جاں عزم تماشا دارد   نظری در رخت از دور تمنا دارد

دیدہ را خود چہ محل ہر کہ ترا می جوید   جان جدا سازد اگر دیدہ بینا دارد

مطبوعہ نسخے میں اسی ردیف و مشابہ قوافی کے ساتھ ایک دوسری غزل ہے جس کا

مطلع یہ ہے :

راہ بکشائے کہ دل میل بہ بالا دارد　　پردہ برگیر کہ جاں عزم تماشا دارد
(ص ۴۹)

اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی نے اس ردیف و قوافی میں دو غزلیں لکھی تھیں، یہ غزل نسخۂ خطی میں بھی نہیں ہے۔

۱۱۴ ب۔ لمولفہ

یاز[1] ذرہ بر روی اصحاب طلب بکشاد باز　　حیف بل من تائب اندر جہاں دردادباز
شہر معمور دلم کز سیل ہجراں شد خراب　　شد[2] ز معماری وصلت عاقبت آباد باز
از یمین و از یسار قلب من در تاخت عشق　　عقل مغلوب آخر در قلاب افتاد باز
گفتمش عکس جمالت چوں مرا موجود کرد　　تا بمانم زندہ زاں رویم[3] باید داد باز
لمعۂ از پرتوِ نورِ تجلی زد علم　　طور ہستی مرا برکند از بنیاد باز
گفت از ہستی من لاف از وجود من مزن　　کی تواں کردن دکان بالاترانہ استاد باز

مطبوعہ نسخے میں گیارہ بیت ہیں یعنی پانچ بیت زیادہ ہیں (ص ۴۰ - ۴۱)

حدایق الحقایق

یہ سورۂ یوسف کی مفصل تفسیر ہے، جو احسن القصص کے نام سے بھی مشہور ہے، اس کے نسخے عام[4] طور پر ملتے ہیں، تین بار طبع ہو چکی ہے، پہلی بار تہران میں بنام احسن القصص جو بہ دستور بہرام میرزا، دوبارہ لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں، اور تیسری بار تہران میں ۱۳۶۴ شمسی میں، اس کے سرورق پر یہ عبارتیں ہیں :

---

[1] خطی میں بار [2] مطبوعہ : شاید از [3] مطبوعہ : تو تم [4] کتاب خانہ گنج بخش لاہور میں اس کے احسن القصص نام سے گیارہ نسخے ہیں، دیکھیے فہرست ج ۱ ص ۴ - ۵۔

تفسیر حدایق الحقایق
(قسمت سورۂ یوسف)

تالیف

معین الدین فراہی ہروی مشہور بہ ملا مسکین .

بکوشش

دکتر سید جعفر سجادی

موسسہ انتشارات امیر کبیر تہران ۱۳۶۴

حدایق ص ۱۷ :

چہ سود دست طمع گر کنی زخود کوتاہ		سزد کہ پای دریں انجمن دراز کنی

یہ بیت ایک غزل کی ہے جو مطبوعہ دیوان معین میں پوری موجود ہے، اس کا مطلع یہ ہے ؂

اگر ز مستی خود چشم دل فراز کنی		نخست دیدہ بدیدار دوست باز کنی

(ص ۸۹)

لیکن حدایق میں "لمؤلفہ" کی قسم کی کوئی علامت نہیں ہے .

ص ۲۷ ، ابیات موافق حال :

دلی چو[۱] یکی بیش نیست دوست یکی بس بود		وآں یکی[۲] بی اشتراک ذات مقدس بود

در صفت قدوسیاں آنکہ دریں تیرہ[۳] خاک		قبلۂ جان و دلش حضرت اقدس بود

بوالہوساں راز عشق لاف زدن کی سزد		طعمۂ عنقا کجا درخور کرگس بود

بر سر کیواں زند نوبت شاہنشہی		گنج نہانی عشق در دل ہر کس بود

---

۱ ص ۸۸ ؛ چو ۲ ص ۸۸ یک ۳ ص ۲۷ ؛ دیر

هر که ازیں سطح خاک پا سوئے بالا نهد — پایۂ اونامیؔ اوقات متفرنس بود ؟
گلخنی فقر را در تہ پہلو معین — بستر خاکستری مفرش اطلس بود

اسی غزل کے پہلے چار شعر ص ۵۰۰ پر "لمؤلفہ" کے عنوان سے درج ہیں، لیکن یہ غزل موجودہ دیوان سے خارج ہے۔ دیوان نسخہ خطی (احسن کلکشن ورق ۶۶ ا) میں شامل ہے

ص ۲۰۷ : لمولفہ۔

چوں چشمؔ از غیر بر بندی ہمہ دیدار او بینی — ز ذرات جہاں تاباں ہمہ انوار او بینی
ز مرآت جہاں باری تواں عکس رخش دیدن — اگر بے پردہ نتوانی کہ در رخسار او بینی
درون قصر دل در رو کہ تا از وی خبر یابی — بستر خود نکو بنگر کہ تا اسرار او بینی
توئی ظاہر توئی مظہر توئی ناظر توئی منظر — بجیب خود فرو کن سر کہ تا دیدار او بینی

یہ غزل دیوان معین سے خارج ہے، لیکن معین فراہی کی ملکیت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں، دیوان نسخہ خطی احسن کلکشن (ورق ۴۰ ب) میں پائی جاتی ہے۔

ص ۲۰۶، اس صفحے پر ایک غزل کے، جس کا مطلع حسب ذیل ہے تین شعر نقل ہیں، مگر یہاں کوئی علامت نہیں جس سے اس غزل کی نسبت معین فراہی کی طرف معلوم ہو، لیکن اسی غزل کے چار شعر ص ۳۴۹ - ۳۵۰ "لمولفہ" کی قید سے درج ہیں، پھر اسی غزل کے دو شعر ص ۵۰۴ پر "لمؤلفہ" کے عنوان سے درج ہوئے ہیں : مطلع :

مراد دل بغیر از دوست چیزے در نمی گنجد — بخلوت خانۂ سلطاں کسی دیگر نمی گنجد

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں موجود ہے (ص ۵ ۱۸) اور اس میں ۱۱ شعر ہیں، دیوان کے

۱؎ کذا فی الاصل نسخہ خطی : اوقار ۲؎ عرفی کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع یہ ہے :

ز خود گر دیدہ بر بندی چہ گویم کام جاں بینی — ہماں کز اشتیاق دیدنش زادی ہماں بینی۔

دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ص ۲۰۶ پہ پہلے تین شعر ص ۲۴۹ - ۲۵۰ پہ پہلے ۴ شعر اور ص ۵،۴ پہ پہلے ۲ دو شعر درج ہوئے، غزل میں آخری سات شعر زائد ہیں، ان اشعار کے بار بار معین الدین فراہی کی تفسیر میں خود ان کے نام سے درج ہونے کی بنا پر ان کا انتساب ہر قسم کے شبہہ سے پاک[1] ہے۔

ص ۲۵۶ :

گہی از رخ تاباں نقاب زلف کشائی[2]　　　ز عاشقاں بنگاہی ہزار دل .بربائی

اس غزل کی دو اور ابیات نقل ہیں، یہ تینوں ابیات ان کی ایک غزل کی مطبوعہ دیوان ص ۹۱ پہ درج ہیں، مطلع یہ ہے:

گہے از رخ تاباں نقاب زلف کشائی　　　ز عاشقاں بنگاہے ہزار دل بربائی

ص ۲۵۷ : چنانچہ نقیر تو می گوید :

از مطلع دل زد علم یک لمعہ از رخسار تو　　　شد ذرہ ذرہ ہستیم در پرتو[3] انوار تو

اس غزل کے یہاں دس شعر نقل ہیں، دیوان مطبوعہ (ص ۷۹ - ۸۰) میں اس کے ۵ اشعر منقول ہیں، مقطع یہ ہے:

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل؛ بشنو کلام لم یزل در کسوت گفتار تو

واضح ہے کہ یہ غزل معین مسکین کی ہے، اور یہ اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ دیوان معین مسکین فراہی ہروی کا ہے۔

ص ۳۱۹ لمؤلفہ :

---

[1] غزل کا مطلع ص ۷۰، ۶۰ حاشیہ میں درج ہے [2] مطبوعہ نسخے میں سارے قوافی بغیر یائے تنکیر کے ہیں (کشائے، ربائے وغیرہ) جو املا کے اعتبار سے غلط ہیں [3] مطبوعہ: پردہ

مژدگانی کہ مرا یار سوی خویش کشید — دست در گردن ما کرد و مرا بہ پیش کشید
با وجود ہمہ شاہان کہ گدایان وی‌اند — رقم عشق بنام من درویش کشید
ہر کس طالب یارند ولی چہ توان کرد — کہ دلش جانب این خستہ دلان بیش کشید

یہ غزل دیوان سے خارج ہے لیکن قلمی نسخے میں موجود ہے (رک، نسخۂ احسن گلکشن ورق ۲۶۲ و)

ص ۳۴۳ لمولفہ[1] :

بیا ساقی و مستان را بہ میخانہ صلا درده — من دردی کش دیرینہ را جام صفا درده
نمی خواہم می فانی کہ در آخر خمار آرد — اگر می می دہی باری ازان جام بقا درده
چو ساقی در خور ہر کس می اندر جام می ریزد — اگر دُرد است اگر صافی بدان قسمت رضا درده
گل شادی ہمی خواہی ز خار غم مکش دامن — قدم گر طالب گنجی بکام اژدہا درده
عروج جان اگر خواہی بر اوج طارم وحدت — قدم بر فرق ہستی زن دو عالم را صلا[2] درده

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں لیکن قلمی نسخے میں شامل ہے (ورق ۱۵۶ ا) لیکن بلاشبہہ معین ہروی کی ہے، اس کی تین بیت حدائق ص ۶۸۷ پر درج ہیں۔

ص ۳۷۸، چنانچہ فقیر تو می گوید :

گر کشائی دیدۂ دل حسن او بینی ہمہ — ور ببندی دیدہ بدبین نکو بینی ہمہ
آفتابی را کہ اندر روزنِ دل تافتہ است — با ہمہ ذرات عالم رو برو بینی ہمہ
ناظر حق باش در مرآت ذرات وجود — تا دریں آئینہ ہا دیدار او بینی ہمہ

---

[1] یہ غزل دیوان قلمی عبدالسلام ۴۲/۳۵، کتابخانہ علی گڑھ ورق ۵۶ پر ہے۔

[2] اصل: صفا، لیکن اسی کتاب میں ص ۶۸۷ میں صلا ہے۔

عکس روی است آنکہ می تابد ز آئینہ دلی — آئینہ بردار تا خود جملہ رو بینی ہمہ
زگلستان معانی یک گلت نامد بدست — بسکہ در گلزار صورت رنگ و بو بینی ہمہ
بادۂ وحدت بہر ظرفی نمی گنجد معین — نیست ایں زاں می کہ در خم و سبو بینی ہمہ

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، میرے مطالعہ کے دونوں قلمی نسخوں میں بھی نہیں ہے۔

ص ۳۸۴

بیا در بزم "او ادنیٰ" یکی رمزی[۲] ز من بشنو — وزاں اسرار "او اوحیٰ"[۳] عجب طرزی[۴] سخن بشنو

اس کی چار ابیات حدایق الحقایق میں آئی ہیں، دیوان میں ۷ بیت ہیں، ۴، ۶، ۷ حدایق میں نہیں، (دیوان مطبوعہ ص ۷۸)

ص ۴۷۰ : لمؤلفہ عفی عنہ

اگر بوادی ایمن بروں بری را ہی — تو ہم ز خود[۵] شنوی معنی انا اللہی

یہاں اس میں شات بیت اور اعجاز موسوی یا قصۂ موسیٰ، نسخہ کتابخانہ علی گڑھ، ورق ۲۷ (میں ۹ بیت ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، اس کو اس مقالے کے شروع میں نقل کر دیا گیا ہے، اسی حدایق ص ۴۴۲ میں اس غزل کے ۵ شعر منقول ہیں میرے مطالعے کے ایک قلمی نسخے میں موجود ہے (احسن گلگشن ورق ۶۴ ب)

ص ۴۸۰ :

من خود[۶] ز اہل ولم فانی نخواہم شد ز مرگ — چوں نوید وصل می آید[۷] چہ ترسم از اجل

---

[۱] قرآن ۵۳ : ۹ [۲] مطبوعہ : یکی حرفی [۳] قرآن ۵۳ : ۱۰ [۴] مطبوعہ : یکی طرز سخن۔
[۵] تاریخ موسیٰ یا اعجاز موسوی ۱۳۷ : نعرۂ [۶] دیوان : چوں از [۷] دیوان : می آرد۔

گر کند دست اجل قصر وجودم خشت خشت ٭ اصل بنیاد محبت ہیچ نپذیرد خلل

یہ دونوں بیت ایک غزل کی ہیں جو مطبوعہ دیوان (ص ۴۶ - ۴۷) میں اس مطلع کے ساتھ آئی ہے:

من دُرے بودم نہاں در قعر بحر لم یزل ٭ عشق غواصانہ ام آورد بیروں زاں محل

ص ۴۸۲ لمولفہ

از دلم صورت آں خوب ختن می نرود ٭ چاشنی شکر او ز دہن می نرود

باللہ ار شور کنم ہر نفسی عیب مکن ٭ گر برفت از دل تو از دل من می نرود

جان پروانۂ مسکین زپی شعلۂ شمع ٭ تا نہ سوزد پروبالش زلگن می نرود

ہمہ مرغان چمن ہر طرفی می پرّند ٭ بلبل از واسطۂ گل ز چمن می نرود

مرغ جان ہر نفسی بال کشاید کہ پرد ٭ بر امید نظر دوست ز تن می نرود

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، دونوں قلمی نسخوں میں بھی دکھائی نہ دی'

ص ۴۹۸ : لمولفہ

بہشت دیدن آں یار مہوش است مرا ٭ بہشت بی رخ او عین آتش است مرا

اگر وصال تو یابم بہر کجا کہ روم ٭ اگر چہ آتش دوزخ بود خوش است مرا

مگر وصال تو آبی چکاند م بر لب ٭ کہ از فراق تو جاں در کشاکش است مرا

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے، البتہ دونوں قلمی نسخوں میں موجود ہے (دیکھئے احسن گلشن ورق ۶۱ ب)

ص ۵۴۶ لمولفہ :

ہمچو خورشید کہ در آب زلالی دیدم ٭ اندر آئینۂ جان عکس جمالی دیدم

اس کے صرف تین شعر یہاں مدح [illegible]

ص ۴۸ پر موجود ہے، یہ تینوں شعر دیوان میں نمبر ۱، ۲، ۳ [illegible]

تا معین ذرہ صفت رفت پی نور ازل — نہ طلوع شد نہ غروب [illegible]

ص ۵۴۵ - لمؤلفہ

اگر از آئینۂ دل غلاف برخیزد — میان ظلمت و نور اختلاف برخیزد

اگر ز عکس رخت لمئہ فتد بہ دیر — زاہل کفر ہمہ اعتراف برخیزد

بیا ز پردہ بروں آ و جلوۂ بنمائے — کہ تا ز مومن و کافر خلاف برخیزد

بہر دلی کہ شود سر وحدتش مکشوف — حجاب ہا ہمہ زاں انکشاف برخیزد

عجب مدار کہ در وقت دیدن ساقی — تفاوت از قدح و درد صاف برخیزد

تو ہم[1] بہ بینی اگر آنچہ دیدہ سر معین — یقین ز سر تو ہم ایں گزاف برخیزد

معین بعاجز مسکیں اعانتی فرمای — گر ز عون تو ایں اعتساف برخیزد

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، یہ دونوں قلمی نسخوں میں بھی نہیں ملی۔

ص ۵۸۰ :

گر آہ آتش[2] بار من یک شعلۂ بیروں زند — ایں آتش گردوں علم بر گنبد گردوں زند

اس غزل کے تین شعر بدون ذکر شاعر یہاں موجود ہیں، یہ غزل سات بیت پر مشتمل مطبوعہ دیوان ص ۲۴ - ۲۵ پر موجود ہے، یہاں کے تینوں شعر ۱، ۲، ۵ نمبر پر ہیں۔

ص ۵۸۸ لمؤلفہ :

دل چہ یکے بیش نیست دوست یکی بس بود — و آں یکی بی اشتراک ذات مقدس بود

---

[1] آخری دو بیتیں حدائق کے دوسرے قلمی نسخے سے ماخوذ ہیں [2] دیوان: آتش پنہاں۔

[illegible] ان میں سے ۴ یہاں

[illegible] موجود ہے، دیکھئے نسخہ

[illegible] ص ۲۲۶

[illegible]

[illegible] بہم کرد [illegible] تنہا و قید زلف او زنجیر برپای دلم

یہ شعر ایک غزل کا ہے جو مطبوعہ دیوان میں [illegible] نقل ہے:

ای نور حقیقت تافتہ اندر سویدای دلم
بگرفتہ نور عشق تو پنہاں و پیدای دلم

اس میں نو شعر ہیں، اسی غزل کے حسب ذیل دو شعر حدائق الحقائق کے ص ۵۹۲

پر درج ہیں:

موجی ز دریای حدوثی کہ او ز لن ترانی زخم خورد
دل زیچ اندیشہ نکرد ای وای صد وای دلم

ہر کس ز خود آید بدر آن ز خویش آید بر جگر
دل غرق ز خود آمد بدر او کشت جریای دلم

ص ۶۱۱:

خزین باست مرا پر ز نقد علم و ادب
کجاست آہ سحرگاہ و نالہ دل شب

مباش تشنہ لب اندر بوادی عصیاں
کہ بحر رحمت ما موج می زند بر لب

یہ غزل ۱۱ شعر پر مشتمل دیوان (ص ۷-۸) میں موجود ہے، اس کے تین شعر

قصۂ حضرت موسیٰ یا اعجاز موسوی (ورق ۱۸۷) پر نقل ہیں۔

ص ۶۲۹ = لمولفہ:

محمد بوی نداشتم تا کہ این بود است این
بوی عشق است اینکہ می آید ز سعی خدا ایا

اس میں یہاں چھ ابیات ہیں (۵ متن، ایک حاشیہ)، مطبوعہ نسخہ میں اس میں

اس کے صرف تین شعر یہاں درج ہیں، پوری غزل سات شعر کی مطبوعہ دیوان ص ۴۸ پر موجود ہے، یہ تینوں شعر دیوان میں نمبر ۱، ۲، ۴ ہیں، مقطع یہ ہے:

تا معین ذرہ صفت رفت پی نور ازل ✻ نہ طلوعش نہ غروب و نہ زوالی دیدم

ص ۵۴۵ ۔ لمؤلفہ

اگر از آئینۂ دل علات برخیزد ✻ میان ظلمت و نور اختلاف برخیزد

اگر ز عکس رخت لمئہ فتد بہ دیر ✻ زاہل کفر ہمہ اعتراف برخیزد

بیا ز پردہ بروں آ و جلوۂ بنماے ✻ کہ تا ز مومن و کافر خلاف برخیزد

بہر دلی کہ شود سر وحدتش مکشوف ✻ حجاب ہا ہمہ زاں انکشاف برخیزد

عجب مدار کہ در وقت دیدن ساقی ✻ تفاوت از قدح و درد صاف برخیزد

توہم[1] بہ بینی اگر آنچہ دیدہ سر معین ✻ یقیں ز سر تو ہم ایں گزاف برخیزد

معین بعاجز مسکیں اعانتی فرمای ✻ مگر ز عون تو ایں اعتساف برخیزد

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، یہ دونوں قلمی نسخوں میں بھی نہیں ملی۔

ص ۵۸۰:

گر آہ آتش بار من یک شعلۂ بیروں زند ✻ ایں آتش گردوں[2] علم بر گنبد گردوں زند

اس غزل کے تین شعر بدون ذکر شاعر یہاں موجود ہیں، یہ غزل سات بیت پر مشتمل مطبوعہ دیوان ص ۲۴ ۔ ۲۵ پر موجود ہے، یہاں کے تینوں شعر ۱، ۲، ۵ نمبر پر ہیں۔

ص ۵۸۸ لمولفہ:

دل چہ یکے بیش نیست دوست یکی بس بود ✻ واں یکی بی اشتراک ذات مقدس بود

---

[1] آخری دو بیتیں حدائق کے دوسرے قلمی نسخے سے ماخوذ ہیں [2] دیوان آتش پنہاں۔

اس غزل کے چھ[1] شعر اسی کتاب کے صفحہ ۲۷ پر درج ہیں، ان میں سے ۴ یہاں ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان سے خارج ہے، البتہ قلمی نسخوں میں موجود ہے، دیکھئے نسخۂ دیوان احسن گلکشن ورق ۱۶۶ ل۔

ص ۵۸۹ :

دل در پی روی نکو میرفت ہر دم کو بکو بنہاد قید زلف او زنجیر برپای دلم

یہ شعر ایک غزل کا ہے جو مطبوعہ دیوان ص ۱۵ پر بمطلع ذیل نقل ہے:

ای نور عشقت تافتہ اندر سویدای دلم بگزشتہ نور عشق تو پنہان و پیدای دلم

اس میں نو شعر ہیں، اسی غزل کے حسب ذیل دو[2] شعر حدائق الحقائق کے ص ۵۹۲ پر درج ہیں:

موسیٰ دراں روزی کہ او از لن ترانی زخم خورد دل ہیچ اندیشہ نکرد ای وای صد وای دلم
ہر کس زخود آید بدر آن زخمش آید بر جگر دل خوں زخود آمد بدر او کشت جوہای دلم

ص ۶۱۱ :

حزین ہاست مرا پر ز نقد علم و ادب کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب
مباش تشنہ لب اندر بوادی عصیاں کہ بحر رحمت ما موج می زند بر لب

یہ غزل ۱۱ شعر پر مشتمل دیوان (ص ۷۔ ۸) میں موجود ہے، اس کے تین شعر قصۂ حضرت موسیٰ یا اعجاز موسوی ورق ۸۰ ل پر نقل ہیں۔

ص ۶۲۹ = لمولفہ :

می دمد بوی ندانم تاکدامیں بوستاں بوی عشق است اینکہ می آید ز سوی دوستاں

اس میں یہاں چھ بیت ہیں (۵ متن، ایک حاشیہ) مطبوعہ نسخہ میں اس میں

۷ بیت ہیں (ص ۷۰) آخرالذکر میں مقطع یہ ہے :

بادۂ ہو چوں ہیا ہو ریخت برجان معین   از دلش تا عرش صد جا نعرۂ یا ہوس این

جبکہ حدائق میں دوسرا مقطع ہے :

در ریاض عشق بازی رایض از عون معین   نکہت جاں بخش آید وہ چہ رنگ بوہست این

حدائق میں درج ہونا قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہ معین فراہی ہروی کی غزل ہے نہ کسی دوسرے کی۔ اسی غزل کی اول تین بیتیں اسی کتاب کے ص ۱۴۷ پر بدون انتساب شاعر مندرج ہیں :

ص ۶۴۱، چنانکہ فقیر گوید :

محبوب تو ای عاشق از غیر چرا جوئی   او را ہم از و بطلب گر مرد خدا جوئی

اس میں ۴ بیت ہیں، اسی غزل کے چھ اشعار قصۂ حضرت موسیٰ ورق ۶۸و پر درج ہیں یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں، البتہ صرف احسن گلشن والے نسخے میں موجود ہے، ورق ۶۵ب دوسرے نسخے میں نہیں۔

ص ۶۴۳ :

بہر بلا کہ تو خواہی بیازمای مرا   کہ در مشاہدۂ تو بلا نمی بینم

زمن بہر چہ کنی یاد را ضیم حقا   کہ ہرچہ از تو رسد جز عطا نمی بینم

یہ غزل دیوان (ص ۵۳) میں موجود ہے، اس میں ۸ بیت ہیں اور مطلع و مقطع یہ ہیں

صفات و ذات چو ہم از جدا نمی بینم   بہ ہرچہ می نگرم جز خدا نمی بینم

عروج جان معینی بر اوج "او ادنیٰ"   بجز متابعت مصطفیٰ نمی بینم

ص ۶۴۳ : درکوی بدنامی مرا پیوند شد با دلبری ؛ ای خرقہ ناموس من گو صد ہزاراں پارہ شو

یہ ایک غزل کی پانچویں بیت ہے، جو دیوان مطبوعہ ص ۷۷ پر پائی جاتی ہے، اس میں
کل ۷ ابیات ہیں، مطلع یہ ہے:

نور تجلی می رسد ای طور دل صد پارہ شو ای مرغ جان بشکن قفس زین خاکدان آوارہ شو

ص ۶۷۵

تو خاصہ زمن باش کہ ما نیز ترائیم در ہر دو جہاں مقصد و مقصود تو مائیم
گر یک قدم از کوی طلب سوی من آئی ما صد قدم از راہ کرم پیش تو آئیم

یہ معین کی ایک غزل کے دو شعر ہیں جو دیوان (ص ۷۵) میں درج ہے، اس میں
دس بیت ہیں اور مقطع یہ ہے:

از شش جہت کون گذشتست معینی از جا چو برونیم چہ گوئیم کجائیم

ص ۶۸۴ = لمولفہ:

معینی دیدۂ عبرت ببست از دیدن غیرت گر این چشم پر حیرت بدیدار تو بگشاید

یہ شعر مطبوعہ و قلمی دونوں نسخوں میں نہیں ہے۔

ص ۶۸۷:

گل شادی ہمی خواہی ز خار غم مکش دامن قدم گر طالب گنجی بکام اژدہا در دہ
وجودت چوں مس آمد کیمیائی عشق حاصل کن بکانون غمش بگداز و آنگہ کیمیا در دہ
عروج جاں اگر خواہی براوج طارم وحدت قدم بر فرق ہستی زن دو عالم را صلا در دہ

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں، البتہ دونوں خطی نسخوں میں شامل ہے (ورق:
۵۶ ل) اس کے پانچ شعر حدائق ہی کے ص ۳۴۳ پر "لمولفہ" کے عنوان سے
درج ہیں۔

ص ۴۲۷، لمؤلفہ :

چو چنگ می کشم این گوشمال وزغم فراق | مرا دم آنکہ بہ بزم وصل بنوازی

اس غزل کی ۶ ابیات یہاں نقل ہیں، یہ غزل دیوان مطبوعہ ص ۸۶ - ۸۷ پر درج ہے، اس میں ۱۱ ابیات ہیں، پہلی دو بیت اور آخری تین بیت دیوان میں زائد ہیں مطلع ومقطع اس طرح پر ہیں :

چو از جمال نقاب بطون بر اندازی | دران ظہور وجود مرا عدم سازی
معین بیک نظر از خاک بر گرفتہ تست | بدان امید کہ باز از نظر بیندازی

ص ۴۳۳، لمؤلفہ :

نفحۂ عشق کزان سوی جہان می آید | بہ مشام دلم از عالم جان می آید

اس غزل کی پانچ بیتیں یہاں نقل ہیں، دیوان میں ۱۷ ابیات ہیں (ص ۳۴-۳۵) مقطع دیوان میں آیا ہے :

آتش عشق تو در جان معین افتادست | وزدمش بوی دل سوختگان می آید

ص ۴۹ ۳، لمؤلفہ :

گر صبا ز سر کوی دوست می آید | کہ از زمین وزمان بوی دوست می آید

اس غزل کے تین شعر یہاں درج ہیں، یہ غزل دیوان مطبوعہ ص ۲۶ پر موجود ہے اور اس جگہ کی تین ابیات کا نمبر ۱، ۲، ۵ ہے۔

ص ۵۳ ۳، لمولفہ عفی عنہ :

بوئی ز زلفش می دمد ای عقل شیدا شو روان | باد بہاری می وزد چون گل بصحرا شو روان
زان اقرب[1] از حبل الورید یعقوب جان بوئی شنید | پیراہن یوسف رسید ای دیدہ بینا شو روان

[1] مستفاد از آیۂ قرآنی : نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

آہ جمالش جلوہ گر شد فاش اندر بحر و بر | چوں یافتی نور بصر سوئے تماشا شو رواں
زد آتش عشقش علم زاں جانب لوح و قلم | زیں فرش بر تر نہ قدم بر عرش بالا شو رواں
در گوش جاں آمد ندا از بارگاہِ کبریا | تو قطرۂ آبی بیا ہم سوئے دریا شو رواں
سوی نگار عشوہ گر، گر اتفاق افتد نظر | از عقل و دانش در گذر سرمست و شیدا شو رواں
از خویش و بیگانہ بہ چہ، دستی بہر یاری مدہ | با خودی از خود رہ نہ وز خویش تنہا شو رواں
از خویش چو تنہا روی از لا سوی الا روی | گر بایدت کانجا روی بیدست و بی پا شو رواں
چوں تو ز خود پنہاں شوی ہر چیز خواہی آں شوی | خواہی کہ تا جاناں شوی از غیر یکتا شو رواں
در روئے دریا چوں خسی گشتی تو بر گرداں بسی | خواہی معین گردی کسی زنہار با ما شو رواں

معین الدین فراہی ہروی کی جو غزلیں صفحات بالا میں نقل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر ان کے دیوان میں شامل ہیں، مطبوعہ میں البتہ بعض غزلیں نہیں ہیں جو قلمی نسخوں میں مل جاتی ہیں، اس سے یہ امر مسلم ہو جاتا ہے کہ دیوان جو حضرت معین الدین چشتی کے نام منسوب ہے وہ موصوف کا نہیں بلکہ ان کے ایک ہمنام معین فراہی ہروی کا ہے جو حضرت سے تقریباً تین صدی بعد کے بزرگ ہیں، اور یہ قطعی شہادت اتنی وقیع ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ میں اس طرح کی شہادتیں کبریت احمر کا حکم رکھتی ہیں۔

اس بحث مزید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مطبوعہ دیوان کامل نہیں، اس میں نہ جانے کتنی غزلیں شامل ہونے سے رہ گئیں، معین ہروی نے مثنویاں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں، کچھ مثنویوں کے اشعار ان کی نثری تصانیف[1] میں مل جاتی ہیں، لیکن جو سیکڑوں رباعیاں

---

[1] دیکھیے حدائق الحقائق ص ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۸۵، ۳۵۰، ۴۷۵، ۴۸۳ وغیرہ، نیز اعجاز موسوی یا قصہ حضرت موسیٰ نسخہ کتابخانہ علی گڑھ ورق ۱۰۶ ب، رسالہ نعوت اسمہ نسخہ علی گڑھ ورق ۴۲۔

ان میں پائی جاتی ہیں، ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ دیوان معین کے دو[2] نسخے مسلم یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہیں، پہلا عبدالسلام کلکشن ۸۹۱/۲۲ اوراق ۴۷، ۱۳ سطری، خط نستعلیق معمولی، تاریخ کتابت ۱۲۱۳ھ، دوسرا نسخہ جو ف ۲۲۲، اوراق ۸۸، سطریں مختلف، تاریخ کتابت ۱۲۳۹ھ جو مٹا دی گئی، پھر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

دونوں نسخوں کی ترتیب غیر الفبائی ہے، لیکن بالکل یکساں ہے، مطبوعہ نسخہ حروف تہجی سے ترتیب دیا گیا ہے، ان دونوں نسخوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ج ف والے نسخے میں پانچ غزلیں کم ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان دونوں قلمی نسخوں میں غزلوں کی تعداد مطبوعہ سے کہیں زیادہ ہے، تفصیل آگے آتی ہے اور جو غزلیں زیادہ ہیں وہ دو جگہ تسلسل کے ساتھ درج ہیں، ذیل میں دونوں مخطوطات کی اضافی غزلوں کے مطلعوں کے پہلے مصرعے درج کیے جاتے ہیں،

(از ورق ۳۹ ب تا ۴۳ ب۔ کل ۱۳ غزلیں)

۱۔ بوی ز زلفش می دہد ای عقل شیدا شو رواں

۲۔ ای آفتاب عرفان پر نور دار مارا

۳۔ ای ز عشقت ہر نفس در دل سرودی بیشتر

۴۔ ہر نکتہ کز دقائق اسرار جلوہ کرد

۵۔ چو چشم از غیر بربندی ہمہ دیدار او بینی

۶۔ چو استاد ازل برزد رقم بر صفحۂ جانم

۷۔ وقت شد کہ آید جمالش از نقاب معنی بروں

۸ ۔ سر زلف عنبریں را بہ کرشمہ تاب دادی
۹ ۔ من ازاں دیدہ کہ دیدار نہ بیند چہ کنم
۱۰ ۔ چو آیم بہ سر کویت کہ خواہم روی تو بینم
۱۱ ۔ عاقلان در کار خویش غافلان در کار دوست
۱۲ ۔ ای آفتاب طلعتت از مطلع جان تافتہ
۱۳ ۔ بنفشہ می دمد ای گلعذار بر رخ تو
(از ورق ۵۵ تا ۷۲ کل ۴۵ غزلیں)
۱۴ ۔ دل کشتی است بر سر دریای نیم شب
۱۵ ۔ دل قست جام جہاں نما و سرشک دیدہ جلای دل
۱۶ ۔ بیا ساقی و مستاں را بہ میخانہ صلا در دہ
۱۷ ۔ امروز من در عشق او بر نار ہجراں سوختم
۱۸ ۔ بہر چشمی کہ می بیند در آئینہ نگار من
۱۹ ۔ گرچہ ہر بد کہ تواں بر تن خود کردستم
۲۰ ۔ چنیں کہ عاشق اویم ز مرگ نندیشم
۲۱ ۔ ای گلستان دلم صد گل بہار از عشق تو
۲۲ ۔ توئی کہ از تتق آب و گل جمال نمودی
۲۳ ۔ تا ز خود بیگانہ گشتم آشنائی یافتم
۲۴ ۔ چو نور مطلع عرفاں ظہور خواہد کرد
۲۵ ۔ خبری می رسد از عالم غیبی بشنو

۲۶ ۔ کہنہ دلقی است وجود تو بینداز و برو

۲۷ ۔ حکایت غم ہجراں تو ز من بشنو

۲۸ ۔ بہشت دیدن آں یار مہوش است مرا

۲۹ ۔ سخن از عشق می گفتم نوید وصل در دادی

۳۰ ۔ آہ سوزندہ کہ از جان غم آلودہ گذشت

۳۱ ۔ مژدگانی کہ مرا یار سوی خویش کشید

۳۲ ۔ خبری فاش شد از سر نہانی بجہاں

۳۳ ۔ خبری می رسدم ہر نفس از غیب بگوش

۳۴ ۔ غافل منشیں و قدم اندر رہ حق نہ

۳۵ ۔ یارای آں چو نیست کہ در یار بنگرم

۳۶ ۔ منم بہ بزم بقا کز می بقای تو مستم

۳۷ ۔ نیست آں اشک کہ در چشم ترم می گردد

۳۸ ۔ ہر کس[لہ] کہ بدل ز آتش عشقش علمی نیست

۳۹ ۔ ہوای نظارگی کاندر جمال یار می بینی

۴۰ ۔ اگر بوادی ایمن براں بروں راہی

۴۱ ۔ محبوب خود ای عاشق از غیر چرا جوئی

۴۲ ۔ ازاں زماں کہ نقش تو گرفت دلم

۴۳ ۔ نیست ایں اشک کہ بر چہرہ دویدست فرو

۴۴ ۔ دل چو یکی بیش نیست یار یکی بس بود

لہ ۳۸ تا ۴۱ ، ۴ غزلیں علی گڑھ قلمی جز ف میں نہیں۔

۴۵ ۔ ہر دلی واقف اسرار تو نیست

۴۶ ۔ ساقی میِ ناب برگرفتہ

۴۷ ۔ ایں چہ بادہ است کاندر جام مستاں ریختی

۴۸ ۔ قدم چو بر رہِ گفت و شنو و خواہم زد

۴۹ ۔ عاشقان جمال حق مستند

۵۰ ۔ من کہ تا آمدہ زیں دائرہ بیرون رفتم

۵۱ ۔ عاشقاں در کشاکش افتادند

۵۲ ۔ من رفیق آب خضرم ز آب حیواں بیخبر

۵۳ ۔ اے کہ دلم شکستۂ قیمت دل چہ می دہی

۵۴ ۔ صبا رسید و بلبل زگل پیام آورد

۵۵ ۔ آمد خبری بگوش جانم

۵۶ ۔ نیست نزدیک عقل اگر دانی

۵۷ ۔ بنگر بہ اشک سرخ و رخ زرد عاشق

۵۸ ۔ من ز بالایم بہ بالا می روم

۵۹ ۔ طلبگار توایم و تو گریزانی زمن[1] (۱۶ ب) (ایک غزل)

۶۰ ۔ چشم سازای دل کہ شد محجوب تو سنگ بدن (۳۱، ب) (ایک غزل)

عبدالسلام کلکشن کے نسخے میں غزلوں کی تعداد ۱۷۹، دوسرے قلمی نسخے میں ۱۷۴ غزلیں اور مطبوعہ میں صرف ۱۲۲، عبدالسلام کلکشن میں مطبوعہ نسخے سے ساٹھ غزلیں

---

[1] یہ غزل بھی قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

جن کی تفصیل اوپر درج ہے، زائد ہیں، اس حساب سے کم ازکم تین غزلیں مطبوعہ دیوان میں ایسی ہیں جو قلمی نسخے میں نہیں، باوجود اس کے کہ میرے مطالعے کے تین نسخوں میں (ایک مطبوعہ اور دو قلمی) سب سے زیادہ غزلیات کا حامل عبدالسلام کلکشن والا ہی نسخہ ہے لیکن اس کو کامل نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں تین مطبوعہ نسخے کی زائد غزلیں، تین چار غزلیں جو حدائق الحقائق میں ہیں اور دیوان کے نسخوں میں نہیں، ایک غزل حبیب گنج کی "غزلیات معین الدین" میں نہیں ملتیں، آخر دو ماخذوں کی غزلوں کے مطلعے یہ ہیں :

گر گشائی دیدۂ دل حسن او بینی ہمہ (ص ۳۷۸)

از دلم صورت آں خوب ختن می نرود (ص ۴۸۲)

اگر از آئینۂ دل غلاف برخیزد (۵۴۵)

نسخۂ غزلیات معین الدین میں حسب ذیل غزل زیادہ ہے۔

حجاب از پیش خود بردار و بنما روی زیبا را (ورق ۱)

غرض غزلیات کے اعتبار سے نہ صرف مطبوعہ نسخہ ناقص ہے، بلکہ کوئی قلمی نسخہ بھی کامل نظر نہیں آتا، مثنویات، رباعیات اور دوسرے اصناف سخن کا کیا ذکر، دراصل معین ہروی کے دیوان کے ایک کامل انتقادی متن کی اشد ضرورت ہے، اور اس متن کی ترتیب اس طرح شروع ہو کہ دیوان کے قلمی نسخے جمع کیے جائیں، ان کے باہمی مقابلے سے غزلیات کا تعین کیا جائے، پھر معین ہروی کی نثری تصانیف کو اکٹھا کیا جائے اور ان میں سے خود ہروی کے اشعار جو ان تصانیف میں جا بجا ہوئے ہیں ان کو جمع کیا جائے ان میں کچھ اشعار تو مطبوعہ نسخے میں اور ان سے زیادہ قلمی نسخوں میں موجود ہیں، وہ سب جمع ہوں ان تصانیف میں خاصی تعداد میں مثنوی کے اشعار ہیں، وہ بھی جمع کر لیے جائیں معین ہروی کے

رباعیاں بھی لکھی ہیں، اور ان کی تصانیف میں ان کی بعض رباعیاں درج ہیں، مگر مصنف کے نام غائب ہیں، تحقیق کر کے ان میں سے معین ہروی کی رباعیوں کا تعین کر لیں، پھر سب دیوان میں شامل کریں، اس طرح یہ مجوزہ دیوان بڑی حد تک قابل اعتبار ہوگا

آخر میں اخلاق جہانگیری میں شامل معین الدین ہروی کی ایک غزل کے ذکر پر یہ گذارش ختم کی جارہی ہے۔

جہانگیر کے دور میں (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) نور الدین خاقانی نام کے ایک بزرگ گذرے ہیں، جنھوں نے اخلاق جہانگیری نام کی ایک ضخیم تصنیف یادگار چھوڑی ہے، اس کے دو[2] نسخے معلوم ہیں، ایک انڈیا آفس (فہرست ایتھے 2207) کے کتابخانے میں، دوسرا ٹونک میں صاحبزادہ محمد مصطفےٰ خان جوہر کے پاس، اس آخر الذکر نسخے کا تعارف رسالۂ معارف اعظم گڈھ ۱۹۶۴ء میں ہوا، انڈیا آفس کے نسخے کا عکس پروفیسر محمد اسلم، صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پاس ہے، اس کی روشنی میں پروفیسر صاحب نے ایک یادداشت مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ جلد ۱۳، نمبر ۱، ۲ صفحہ ۱۳-۱۴، ۱۷ درج کی ہے، راقم نے اسی سے استفادہ کیا ہے،

نور الدین خاقانی صاحب اخلاق جہانگیری ملا معین الدین الواعظ کے پوتے تھے، انھوں نے اپنی اس تصنیف میں جا بجا اپنے دادا کے اشعار درج کیے ہیں، جن کو وہ لجدہ کے اضافے سے ذکر کرتے ہیں، اخلاق جہانگیری میں اپنے دادا کے جو اشعار انھوں نے نقل کیے ہیں، وہ دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ میں موجود ہیں۔

حسب ذیل غزل اگرچہ مطبوعہ دیوان میں نہیں، لیکن غزلیات معینؒ الدین چشتی

---

[1] غزلیات کا انتخاب ہے، نمبر ۱۹۲۴ ورق ۶، سطر ۱۹، سائز "۵×۸" اس میں کل ۲۱ غزلیں ہیں

(بقیہ ص ۳۴ پر)

کتابخانۂ علی گڑھ حبیب گنج ۴۷/۱۹۴ میں موجود ہے :

حجاب از پیش خود بردار بنما روی زیبا را | وزاں رو مست گرداں عاقل و ہشیار را
زرویت شمۂ گویا قرین ابن مریم شد | وگر نہ قوت احیا کجا بودی مسیحا را
چہ جای پاک از کویش سلامت می تواں آمد | مگر مستش چناں گرداں کز فشانند سر پا را
تو چشم سر خود بکشا کہ تا دیدار او بینی | کہ چشم سر نمی بیند بغیر طور موسیٰ را
معین چشم حقیقت بین نظر بر ہر چہ اندازد | بذات حق بجا بیند وجود جملہ اشیا را

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جو دیوان حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے نام سے مدون ہوا اس کے بیشتر اشعار بقول خود معین ہروی کے، اس کے ہیں، ان میں سے بعض کے بارے میں ہروی کے پوتے نور الدین خاقانی کی شہادت ہے کہ وہ اس کے دادا کے ہیں، تو پھر اس دیوان کی نسبت حضرت خواجہ کی طرف بے بنیاد ہے، سارا دیوان معین ہروی کا ہے، بلکہ اس کے کافی اشعار مطبوعہ دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، غرض دیوان مذکور کو معین ہروی کی ملکیت سمجھنا چاہیے، خواجہ کی طرف اس کے انتساب کرنے کا کوئی قرینہ نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) جن میں حسب ذیل چند غزلیں مطبوعہ دیوان سے خارج ہیں :

(۱) حجاب از روی خود بردار بنما روی زیبا را الخ (۵ بیت)

(۲) ہر نظر محرم دیدار تو نیست | ہر دلی واقف اسرار تو نیست (۶ بیت)
آہ سوزندہ کہ بر جان غم آلود گذشت | آتشی بود کہ از سینۂ ملکش دود گذشت (۵ ء)
صبا رسید بہ بلبل ز گل پیام آورد | نوید تہنیت از بہر خاص و عام آورد (۱۲ ء)
آمد خبری بگوش جانم الخ (۱۹ بیت)
این چہ بادہ است کاندر جام مستان ریختی | بادۂ عشق است کاندر ساغر جان ریختی (۷ بیت)
بیا ساقی کہ مستان را شراب ناب در دادی | چو گشتم مست و لا یعقل نقاب از روئے بگشادی (۷ ء)

اسامہ بن منقذ کے حالات کا ایک اہم ماخذ
علامہ مقریزی کی کتاب المقفیٰ الکبیر

از پروفیسر مختار الدین احمد علی گڈھ

"گذشتہ شمارہ میں فاضل محترم پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا جو محققانہ اور پر از معلومات مقالہ اسامہ بن منقذ پر شایع ہوا تھا، یہ مقالہ اسی کا تتمہ اور فاضل موصوف کی وسعتِ علم و نظر کا ثبوت ہے" (معارف)

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اسامہ بن منقذ کے متعلق ایک ایسے ماخذ تک میری رسائی ہوئی جس سے اس مصنف پر کام کرنے والے محققین، وہ یورپ اور امریکہ کے ہوں، یا شرق اوسط کے کوئی واقف نہیں۔ یہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) کی ضخیم تصنیف کتاب المقفیٰ الکبیر کی ایک نایاب جلد ہے جو ترکیہ میں محفوظ ہے اور جس میں اسامہ کے مفصل حالات و اشعار درج ہیں۔

المقریزی، نویں صدی ہجری کے اہم مورخین میں ہیں، وہ ابن خلدون کے شاگرد ہیں اور ابوالمحاسن یوسف بن تغری بردی مصنف النجوم الزاہرۃ اور السخاوی صاحب الضوء اللامع جیسے مصنفین ان کے سلسلۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ تصانیف کی تعداد دو سو[۲] کے قریب بتائی جاتی ہے، ان میں پچیس[۲۵] تیس[۲۶] شایع ہو چکی ہیں، بقیہ غیر مطبوع ہیں یا مفقود۔

المقریزی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں کتاب المقفیٰ الکبیر اسلامی مصر کی تاریخ و تذکرے کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے، اس کے لکھے جانے کا انداز وہی ہے جو ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا ہے جو اسّی جلدوں میں مرتب ہوئی تھی۔ یان سات جلدوں میں اس کا اختصار بحذف اسانید بدران نے دمشق سے شایع کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ کتاب کے مکمل متن کا علمی اڈیشن تصحیحات و تعلیقات کے ساتھ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد اور دوسرے سوری علماء نے المجمع العلمی العربی (حال مجمع اللغۃ العربیۃ) دمشق سے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ڈاکٹر المنجد نے ۱۹۵۱ء میں شایع کی، دوسری جلد بعد کو شایع ہوئی پھر دوسرے علما اس کام میں لگے اور ترتیب و اشاعت کا کام جاری ہے لیکن ابھی تک ربع کتاب بھی شایع نہیں ہو سکی ہے۔

المقریزی بھی اسی وسیع پیمانے پر جس طرح بغداد اور دمشق کی تاریخیں خطیب بغدادی اور ابن عساکر نے لکھی ہیں، مصر کی ایک ضخیم تاریخ اسّی جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے لیکن وہ صرف سولہ جلدیں لکھ سکے تھے کہ وفات پا گئے۔ کتاب کی بعض جلدیں میرے خیال میں صرف مسودے کی شکل اختیار کر سکیں، اگر ان کے بیضات تیار ہوئے تو وہ مصنف کی وفات کے بعد اس طرح منتشر ہو گئے کہ ان کی نقلیں تیار نہ ہو سکیں اور عالم اسلام میں مروج نہ ہو سکیں، السخاوی اور السیوطی ایسے مصنفین ہیں جن کی کتابوں میں کتاب المقفیٰ کے حوالے مجھے ملے ہیں، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان اصحاب کے پاس اس تاریخ کا مکمل نسخہ تھا یا اس کے صرف چند مجلدات۔ السخاوی بہر حال سولہ جلدوں کا ذکر کرتے ہیں اور الضوء اللامع میں کتاب کی کچھ جلدوں سے ضرور انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ السیوطی نے کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں نحویوں کے تذکرہ طبقات النحاۃ میں

ن سے مدد لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے پاس المقفیٰ کی صرف ابتدائی جلدیں تھیں۔[۳]
افسوس یہ ہے کہ اب ان سولہ (۱۶) جلدوں میں نصف بھی موجود نہیں، غالباً ضایع ہو گئیں،
جو جلدیں ملتی ہیں وہ بھی کسی ایک کتاب خانے میں محفوظ ہونے کے بجائے دیار و امصار
میں منتشر ہو گئی ہیں۔

سب سے پہلے کتاب المقفیٰ کی ایک جلد کے وجود کی اطلاع مجھے ۱۹۵۳ء کے اواخر میں آکسفرڈ میں ملی، باڈلین لائبریری میں لبنان کے یسوعی علما کے علمی رسالے المشرق (بیروت) کے مکمل شمارے موجود ہیں۔ الاستاذ حبیب الزیات نے ایک شمارے میں مشہور نحوی ابوالعباس محمد بن یزید الثمالی الازدی المبرد (متوفی ۲۸۵ھ) کا ترجمہ کتاب المقفیٰ سے لے کر شایع کیا تھا۔ یہ کتاب المقفیٰ سے میرا پہلا تعارف تھا۔

۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء کے کچھ مہینے میں نے اپنے آکسفرڈ کے مقالہ تحقیقی کی تیاری اور اہم مخطوطات کی تلاش میں ہالینڈ، جرمنی اور فرانس میں گزارے، ایک دن لائیڈن یونیورسٹی لائبریری میں المقفیٰ کی تین (۳) منتشر جلدوں کے مسودات دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ دیکھ کر مزید مسرت ہوئی کہ یہ تینوں جلدیں خود المقریزی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ میں نے المقریزی کی متعدد تحریریں اور بعض مخطوطات پر ان کی تملیکات اور دستخط دیکھے تھے، فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ المقریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ہے، دوسرے قرائن بھی اس کے مؤید نکلے۔ کتاب المقفیٰ میں تراجم حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں، لیکن صلاح الدین الصفدی (متوفی ۷۶۴ھ) کی الوافی بالوفیات کی طرح ادب و احترام کے پیش نظر ان اصحاب کا پہلے ذکر کیا گیا ہے جن کا نام نامی محمد یا احمد ہے، لائیڈن کے مخطوطے میں انھیں کا ذکر ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابتدائی جلدیں ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد فرانس جانے کا اتفاق ہوا، وہاں پیرس کے کتب خانہ ملی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا، وہاں المقفیٰ کی ایک جلد ملی، یہ بھی مسودۂ مصنف تھا، اس انکشاف پر بہت مسرت ہوئی ساتھ ہی ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ مصر سے نکل کر ان مجلدات نے معلوم نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا ہوگا، اب تین جلدیں اس کتاب کی ہالینڈ کے ملک میں پہنچیں اور ایک جلد فرانس جا پہنچی۔

یورپ سے واپسی پر اپریل ۱۹۵۶ء میں چند دنوں کے لیے قاہرہ اترا، دارالکتب المصریہ گیا، وہاں بھی المقفیٰ کی ایک دو جلدیں دیکھیں۔ خیال ہے کہ حبیب زیات نے اسی نسخے کا مطالعہ کیا ہوگا، اس کی ترتیب و اشاعت کی طرف افسوس ہے کہ مصری عالم یا ادارے نے بھی توجہ نہیں کی۔ شاید ایک غیر مکمل کتاب کی ایک دو جلدوں کی اشاعت انھیں مفید نظر نہ آئی ہو۔

۱۹۶۸ء میں جب میں شعبۂ عربی کی پروفیسر شپ کے عہدے پر فائز ہوا تو ہالینڈ سے اس کتاب کی تینوں جلدوں اور فرانس کی ایک جلد کا عکس منگوا کر چاروں جلدوں کو پھر ایک ساتھ کر دیا، پھر اپنی نگرانی میں اپنے تین شاگردوں سے انھیں مرتب کرایا، جن پر ان حضرات کو علی گڈھ سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ نسخۂ لائیڈن کی پہلی جلد جسے میرے دوست ایک ایرانی اسکالر پروفیسر آقائے سید محمود اسداللہی جامعۂ مشہد (ایران) نے مرتب کیا ہے شایع ہونے والی ہے۔

۱۹۸۷ء میں عمان/اردن کی کانفرنس کے بعد عمرے کے لیے مکہ مکرمہ پہونچا تو عزیز گرامی محمد عزیر شمس ملے جو اس زمانے میں جامعہ ام القریٰ سے ایم اے کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ کے کتب خانے گیا اور متعدد مخطوطات و مصورات دیکھے۔ المقفیٰ کی

ہ جلدوں کی مائکرو فلمیں بھی دیکھیں، لیکن ان میں کوئی جلد ایسی نہ تھی جن کا علم مجھے پہلے سے نہ ہو
ور میری نظر سے نہ گزر چکی ہوں۔

اس سال ۱۴۱۱ھ/۱۹۸۹ء میں حج وزیارت حرمین شریفین زادہ اللہ شرفہما کی سعادت حاصل ہوئی۔ ڈیڑھ ماہ اس دیار پاک میں گذارے، واپسی سے ایک دو دن پہلے محمد عزیر صاحب ملنے آئے جو اب جامعہ ام القریٰ میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، انھوں نے ذکر کیا کہ المقفیٰ کی ایک جلد کا نسخہ مکتبہ سلیمیہ (ترکیہ) میں محفوظ ہے اس جلد میں ابراہیم تا خیثمہ کے تراجم ہیں اور اس کی مائکروفلم جامعہ کی لائبریری میں محفوظ ہے، میں نے س بنا پر کہ اس جلد میں اسامہ بن منقذ کا ترجمہ ہے عکس کی فراہمی کی ان سے فرمائش کی۔ اس کا عکس آج ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو موصول ہوا، اسامہ کے حالات واشعار دیکھ کر بہت سرور ہوا کسی کتاب میں اس قدر تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ اسامہ کے حالات نہیں ملتے جیسے المقفیٰ میں درج ہیں، اس میں ان کا پورا شجرہ نسب تحریر کیا گیا ہے، انکی زندگی کے بارے میں بعض اہم معلومات درج ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ ان کی تصانیف کی مکمل فہرست درج ہے جو المقریزی کے علم میں آسکی ہیں۔ ان میں ایسی کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کے متعلق آج تک کسی کو کچھ معلوم نہ تھا، اس میں اسامہ کی ۲۸ تصانیف کا ذکر ہے، جن کا ذکر دوسرے مصادر میں نہیں صرف کتاب المقفیٰ میں ملتا ہے ان کی تعداد پچیس ۲۵ ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔ اسامہ بن منقذ کی ان تصانیف کی اطلاع پہلی مرتبہ معارف میں شایع کی جارہی ہے:

(۱) کتاب الحنین إلی الاوطان (۲) کتاب رسائل السائل یتضمن الادعیة ووقاتها وما ورد فیها (۳) کتاب البشارات (۴) کتاب زجر عمرو بن بحر الجاحظ

فیہ النھی عن الزنا واللواط والفواحش (۵) کتاب فضائل الخلفاء الراشدین (۶) کتاب المحاسن (۷) کتاب نزھۃ الناظر فی املاء الخاطر (۸) کتاب ردع الظالم ورد المظالم (۹) کتاب مکارم الاخلاق، یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ یہ کتاب بیس[۲۰] جلدوں میں اسامہ نے قیام مصر کے زمانہ میں لکھی تھی اور اس پر ان کی عمر عزیز کے دس[۱۰] سال صرف ہوئے تھے۔ (۱۰) کتاب المنتخب من اشعار العرب (۱۱) کتاب المختار من محدث الاشعار (۱۲) کتاب المماثلۃ فی الشعر (۱۳) کتاب معونۃ المساعد علی حصر الشواھد فی الشعر (۱۴) کتاب الاقسام فی الشعر (۱۵) کتاب امان الخائفین فی الزھد (۱۶) کتاب فیہ شعر جماعۃ، سألہ ابن الزبیر عنھم (۱۷) کتاب المکارم والکرم ورعایۃ الرحم (۱۸) کتاب الفرق بین المحبۃ والھوی (۱۹) کتاب ... ابی العلاء؟ (۲۰) کتاب ضربۃ الولاء (۲۱) کتاب اختیار شعر ابی تمام (۲۲) مختار شعر ابی نواس (۲۳) کتاب لباب الالباب۔ (اس کا امکان ہے کہ یہ لباب الآداب کی تصحیف ہو اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اس نام کی کوئی علٰحدہ کتاب ہو (۲۴) کتاب استدراک المرتاب، یہ الشیب والشباب کا ملحق ہے جس میں اس موضوع پر اضافات کیے گئے ہیں۔ (۲۵) کتاب الحاسد والمحسود۔ یہ اسامہ کی ان کتابوں کی فہرست ہے جن کا ذکر پہلی بار المقریزی کے یہاں ملتا ہے اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ دوسرے مصادر ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لیے المقریزی کے اندراجات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اسامہ بن منقذ کی جن تصانیف کا ذکر ابتدا میں گزرا ان میں سے کچھ کے بارے میں کتاب المقفٰی میں بعض اضافی معلومات ملتے ہیں جن کا ذکر فائدے سے خالی نہیں۔

کتاب التاریخ البدری : یہ کتاب حروف تہجی پر پانچ ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے، جس میں اصحابِ بدر (غالباً مومنین و مشرکین دونوں) کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی تعداد تبائی ہے۔ اس میں مغازی النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک باب ہے جس میں جمیع احوال من اول أمرہ الی آخرہ درج ہیں۔

کتاب الشیب والشباب : اس میں خضاب پر بھی ایک فصل ہے اور اس کے بارے میں جو کچھ (نظم و نثر میں) وارد ہوا ہے سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں۔ اسی کا ملحق استدراک المرتاب کے نام سے اسامہ نے مرتب کیا تھا۔

کتاب اخبار النساء : اس کی ابتدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ اور حضرت مریم بنت عمران کے ذکر سے کی گئی ہے۔ اس میں "امہات العرب والاخوات والزوجات والبنات المنجبات" کے حالات سپرد قلم کیے گئے ہیں اور ان میں جو شاعرات تھیں ان کے اخبار و اشعار بھی درج کیے گئے تھے، ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے (از قسم تنقید و تبصرہ) وہ سب بھی اس کتاب میں مذکور ہیں۔

کتاب ازہار الانہار : اس میں جنت کا حال، اور لبن کے منافع و مضرات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

کتاب تاریخ ذکر الحوادث : ابتدائے ہجرت سے مصنف نے اپنے عہد تک کے حوادث کا اس میں ذکر کیا ہے۔

ان اندراجات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسامہ بن منقذ کی متعدد تصانیف المقریزی کی نظر سے گزری تھیں۔ اس نامور مورخ کے پاس بہت قیمتی ذخیرہ کتابوں کا تھا، تعجب نہیں کہ اسامہ کی بھی بعض تصانیف خود اس کے کتبخانے میں موجود ہوں۔

یورپ، شرق اوسط اور ایشیا میں ایسی متعدد کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جن میں المقریزی کی تحریرات، تملیکات اور دستخط ثبت ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اب بھی محفوظ ہیں۔ ان میں الفہرست لابن الندیم اور مقدمہ ابن خلدون کے نسخے یاد آتے ہیں۔

کتاب الاعتبار: الاستاذ قاسم السامرائی نے بھی ایک نسخے کی بنا پر مرتب کر کے شائع کی ہے، معلوم نہیں، شیخ ابوغدہ کے پیش نظر صرف حِتّی کا اڈیشن ہے یا السامرائی کا اڈیشن بھی رہا ہے، فرانسیسی مستشرق درانبورغ کا اڈیشن تو شاید ان کی نظر سے نہیں گزرا ہو۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ یہ تینوں اڈیشن سامنے رکھتے اور اسکوریال کا اصل مخطوطہ بھی۔

حکیم ابوالفتح گیلانی

از جناب حکیم الطاف احمد اعظمی جامعہ ہمدرد دہلی

حکیم کا نام مسیح الدین اور ابوالفتح کنیت تھی، حکیم کے والد کا نام ملا عبدالرزاق تھا۔ یہ گیلان کے علاقہ لاہیجان کے رہنے والے تھے، حکمت اور علم الٰہیات دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے[1] والیٔ گیلان خان احمد کے دربار میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے۔ سنہ ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۶۶-۶۷ء میں شاہ طہماسپ (۱۵۲۴-۱۵۷۶ء) نے گیلان کو فتح کیا تو اس کے فرماں روا خان احمد کے ساتھ ملا عبدالرزاق کو بھی قید کر لیا اور قید ہی میں ان کا انتقال ہوگیا[2]۔ ملا عبدالرزاق کے چار لڑکے تھے۔

۱۔ حکیم مسیح الدین ابوالفتح ۲۔ حکیم لطف اللہ ۳۔ حکیم نجیب الدین ہمایوں (حکیم ہمام) ۴۔ نورالدین قراری۔

حکیم ابوالفتح سب بھائیوں میں بڑا تھا۔ باپ کے قید ہو جانے کے بعد ۹۸۲ ہجری تک وہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح صفوی دربار میں باریابی حاصل ہو جائے۔ لیکن

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۵ [2] ملا عبدالرزاق کو پہلے قزوین کی جیل میں رکھا گیا بعد میں خرسک کے قلعہ میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں انہیں ایذائیں دیکر صرف اس لیے ختم کر دیا گیا کہ وہ اپنے آقا (خان احمد) کی وفاداری سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

ناکام رہا۔ آخر کار ۹۸۳ھ (۱۵۷۶ء) میں وہ اپنے دو بھائیوں حکیم نجیب الدین ہمایوں (ہمام) اور حکیم نورالدین قراری کے ساتھ گیلان چھوڑ کر پہلے اردبیل آیا اور وہاں سے ہندوستان چلا آیا۔[1] اس وقت حکیم کی عمر لگ بھگ ۳۰ سال تھی۔

اعزاز و منصب | بیسویں سال جلوس اکبری ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں حکیم ابوالفتح نے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔[2] وہ نہایت دوراندیش، زمانہ شناس اور حد درجہ ذہین و فطین شخص تھا اس لیے بہت جلد ترقی کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:[3]

"بادشاہ کی خدمت میں اسے مرتبہ تقرب حاصل تھا اور اس کے مزاج میں اس درجہ دخیل تھا کہ تمام امرائے دولت اس سے حسد کرتے تھے۔"

مولف مآثر رحیمی بادشاہ کے ساتھ اس کے قرب و اختصاص کے متعلق لکھتا ہے:[4]

"بادشاہ کے مزاج میں اسے جو دخل و قرب حاصل تھا وہ جعفر برمکی کو بھی ہارون رشید کے مزاج میں حاصل نہ تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ ملازمت کے چوتھے سال یعنی ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء کے وسط میں بادشاہ نے اسے صوبہ بنگال کی صدارت اور امینی کے ممتاز عہدے پر مامور کیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے:[5]

"در ۹۸۷ ہجری حکیم ابوالفتح را بصدارت و امینی اختصاص بخشیدند۔"

---

[1] تاریخ علماء و شعرائے گیلان ص ۳۶ و مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۵۶ [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۳۳ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ حکیم ۹۷۲ ہجری مطابق ۱۵۶۴ عیسوی میں ہندوستان آیا۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے [3] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷ [4] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۔۔۔ [5] اکبر نامہ ج ۳ ص ۲۶۶۔

مولف مآثر الامرار لکھتا ہے [۱]

"حکیم ابوالفتح ترقی نمودہ سال بیست و چہارم (جلوس ۹۸۰ ہجری) بصدارت و امینی صوبۂ بنگال تعین گردید۔"

حکیم ابوالفتح بنگال میں تقریباً ایک سال رہا۔ ۹۸۸ ہجری میں بابا خاں قاقشال اور بنگال کے دوسرے جاگیرداروں نے ناظم بنگال مظفر خاں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس لڑائی میں حکیم ابوالفتح، رائے پتر داس، خواجہ شمس الدین اور بہت سے دوسرے سردار قید ہوگئے [۲] لیکن ابوالفتح کی دانائی اور خوش تدبیری سے یہ تینوں سردار قلعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جب حکیم دربار میں پہنچا تو اکبر اس کی ہشیاری اور زیرکی سے بے حد خوش ہوا اور اس کی نظر میں حکیم کی قدر و منزلت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی، مولف مآثر الامرار لکھتا ہے: [۳]

"چوں آستاں بوس فائز شد بہ قرب و اعتبارش افزودہ، بہ اقران و امثال خود رجحان گرفت۔"

۹۸۸ ہجری یعنی ملازمت کے پانچویں سال حکیم کو پایۂ تخت کی صدارت تفویض ہوئی۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں: [۴]

" درمیان دوآبہ شیخ فیضی را صدر ساختہ و آں طرف گنگ حکیم ہمام، و صدر

---

[۱] مآثر الامرار ج ۱ ص ۵۵۵ [۲] بنگال کی اس لڑائی میں والی بنگال مظفر خاں کو بھی باغیوں نے قید کر لیا اور پھر جان سے مار ڈالا (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۸۲) [۳] مآثر الامرار ج ۱ ص ۵۵۹-۵۵۸ (اسی ہنگامے میں حکیم ابوالفتح کا بھائی نورالدین قراری مارا گیا جو اس کے ساتھ ہی دو صدی منصب پر بنگال گیا تھا) [۴] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۹۶۔

پای تخت حکیم ابوالفتح را گرد انیدند"

۹۸۹ ہجری میں حکیم کو پایۂ تخت میں امین اور دیوان مقرر کیا گیا[۱]۔ اور ۹۹۳ء میں ہشت صدی کے منصب سے نوازا گیا، ابوالفضل لکھتا ہے[۲]:

" در سال ۹۹۳ ہجری حکیم ابوالفتح ہشت صدی شد"

۹۹۴ ہجری میں حکیم کو افغان باغیوں کے خلاف مہم پر بھیجا گیا۔ جہاں زین خاں کوکلتاش پہلے سے افغان باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اس فوجی مہم پر حکیم کے ساتھ راجہ بیربر (بیربل) بھی گیا تھا۔ یہ مہم ناکام رہی اور بیربر باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بیربر کی موت سے اکبر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس نے حکیم ابوالفتح اور زین خاں کی دربار میں حاضری بند کردی۔ ابوالفضل اور شاہ فتح اللہ شیرازی کی سفارش سے انھیں دوبارہ حاضری کی اجازت ملی۔

علم و فضل اور حذاقت حکیم ابوالفتح جملہ علوم و فنون پر نظر غائر رکھتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی جو حکیم کے سخت مخالف بلکہ معاند تھے، اس کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے[۳]:

" تیزی فہم، جودت طبع، کمالات انسانی اور نظم و نثر میں اسے کامل امتیاز حاصل تھا"

مولف نزہۃ الخواطر لکھتے تھے[۴]:

" وہ علوم حکمیہ کا ایک بڑا عالم، نغز گو شاعر، ذکی و نکتہ رس اور نہایت

---

[۱] رقعات ابوالفتح (خط بنام ہمام مورخہ ربیع الاول ۹۸۶ ہجری) [۲] اکبر نامہ ج ۳ ص ۴۵۵ [۳] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷، مولف طبقات اکبری نے لکھا ہے" بحدت فہم و جودت طبع و دیگر کمالات انسانی امتیاز داشت" (ج ۲ ص ۴۵۲) [۴] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱

حاذق طبیب تھا۔"

حکیم ابوالفتح بلا شبہہ طبیب حاذق تھا۔ اس کی طبی تالیف فتاحی جو قانونچہ (چغمینی) کی شرح ہے اس کی علمی فضیلت اور طبی لیاقت کا ثبوت ہے۔ شہنشاہ اکبر کو جب مرض اسہال لاحق ہوا اور حکیم علی گیلانی جیسے فاضل طبیب کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو اس نے مایوسی کے عالم میں دانائے روزگار حکیم ابوالفتح کو یاد کیا، مولف اکبرنامہ لکھتا ہے:[1]

" آنگاہ یاد دانائی روزگار حکیم ابوالفتح و جالینوس زمان حکیم مصری فرمودہ بر فوت آں دو حکیم تاسفہا کردند۔"

حکیم کو طب کے علاوہ فلسفہ اور علم نجوم سے بھی گہری واقفیت تھی۔ اس کی تالیف قیاسیہ جو اخلاق ناصری کی شرح ہے اس کے تبحر علم، وسعت مطالعہ اور ژرف نگاہی پر دال ہے۔ اس شرح میں حکیم نے مسائل حکمت کو نقلی دلائل سے بھی ثابت کیا ہے۔ فلسفہ سے اس کے غیر معمولی شغف کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ملا احمد ٹھٹھوی کو خلاصۃ الحیات (مشتمل بر مسائل فلسفہ) کے لکھنے کی طرف مائل کیا چنانچہ ملا نے یہ کتاب لکھ کر حکیم کے نام سے معنون کی۔

حکیم کو فلسفہ و طب کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی جیسا کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی لکھا ہے۔ حکیم ارباب شعر و سخن کا نہ صرف قدرداں بلکہ ان کا مربی و رہنما بھی تھا۔ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن شروانی نے لکھا ہے:[2]

" مغلوں نے جو قوت اور وسعت نگاہ فنون لطیفہ کی تربیت و پرورش میں نیاض

---

[1] اکبرنامہ ج ۳ صفحہ ۲۸۰ [2] ملاحظہ ہو دیباچہ کلیات عرفی۔ بحوالہ: (Proceeding fifth

ازل کی بارگاہ سے پائی تھی اس میں اب تک فرد ہیں اسی تربیت کے اثر سے فارسی تغزل میں وہ لطف و رنگینی پیدا ہوئی کہ خود ایران اس کے پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ جو اہل کمال ایران سے ہندوستان میں آکر فیض یاب ہوئے مثلاً عرفی و نظیری ان کے لطف کلام کو ان کے وہ ایرانی معاصر نہ پا سکے جو ایران ہی میں رہے۔ یہ تحقیق ہے کہ عرفی و نظیری ہندوستان آکر خان خاناں اور حکیم ابوالفتح کی صحبت میں عرفی و نظیری بنے۔ حکیم کی وفات پر عرفی نے جو مرثیہ کہا اس میں اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کرتا ہے:

سیاہ پوش تر از عمر جاوداں آمد		کہ رہبرش بعدم شد کہ مرگ در مرگش
(کلیات ص۲۳)

دربار اکبری کے اکثر بلند پایہ شعراء مثلاً عرفی شیرازی خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا قلی میلی اور حیاتی گیلانی وغیرہ حکیم ہی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے[۱]۔ یہ حکیم ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ ان شعراء نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعت ایہام، استعارات و تشبیہات، فلسفیانہ خیالات اور حسن ترکیب میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں جو اس دور کی شاعری کی نمایاں خصوصیات تھیں، حکیم خود شاعر خوش گفتار تھا، یہ شعر اسی کا ہے:

چو نیم مردہ چراغیست آتشیں جانم		کہ در ھوای تو در رہگذر باد صباست[۲]

حکیم کے خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موزونی طبع اور شعرا کی قدردانی کے باوجود شعر گوئی کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ وہ اسے نفس کی ایک بیماری سمجھتا تھا، ایک خط میں لکھتا ہے[۳]:

---

[۱] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۴۳۸ [۲] تاریخ علماء و شعرائے گیلان ص ۲۸۸ [۳] رقعات ابوالفتح گیلانی ص ۱۴۳ خط نمبر ۶ (حکیم نے یہ خط ہندوستان آنے کے بعد کسی ایرانی دوست کو لکھا تھا)

و اشعار خواندن و گفتن از بیماری ہائے نفس است، قدری باید کرد و تہذیب اخلاق نمود۔"

اخلاق و عادات حکیم نہایت خوش اخلاق، منکسر المزاج، احباب نواز اور غریب پرور تھا۔ مولف مآثر الامراء لکھتا ہے:[1]

"حکیم ابوالفتح مخلوق کا کام بنانے میں خود کو باز نہیں رکھتا تھا۔ وہ جو کام بھی کرتا تھا عقل کے مطابق ہوتا تھا، وہ کریم الصفات، محسن زماں اور کمالات میں یگانۂ روزگار تھا۔"

مولف مآثر رحیمی لکھتا ہے:[2]

"بادشاہ کی ملازمت میں اسے جو مرتبہ و استحقاق حاصل تھا اس کی بنیاد پر وہ خلق خدا کے مقاصد و مطالب کی تکمیل میں خود کو اس درجہ مصروف رکھتا تھا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عراق و خراسان اور دنیا کے دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ حکیم کے وسیلہ اور تربیت سے حکومت کے اونچے مناصب تک پہنچے۔"

اکبری عہد کے مورخین میں صرف ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم کو الحاد اور اخلاق ذمیمہ سے متہم کیا ہے، لکھتے ہیں:[3]

"بے دینی اور جملہ اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا۔"

بعد کے مورخین نے ملا عبدالقادر بدایونی کے مذکورہ الزام کو کسی تحقیق کے بغیر نقل کر دیا ہے مثلاً مولف نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:[4]

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۸ [2] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۴۲۸ [3] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷ [4] نزہتہ الخواطر ج ۴ ص ۱۱

"بدایونی نے اسے زندقہ سے متہم کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ الحاد و زندقہ اور اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا۔ اکبر کو منکرات کی طرف اسی نے مائل کیا، . . . وہ بندۂ درہم و دینار تھا، سلطان کو اباطیل کی طرف ترغیب دیتا تھا اور اسے گمراہ کرتا تھا۔"

ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم کے اخلاق ذمیمہ سے متعلق صرف ایک واقعہ لکھا ہے اور وہ یہ ہے:[1]

فقیر ایامیکہ حکیم نوآمدہ بود از وی شنیدم کہ می گفت: خسرو ست و ہمیں دوازدہ است، انوری را پیوستہ بہ انور یک مداح و خاقانی را می گفت کہ اگر او دریں زمانہ می بود بسیار ترقی می یافت بایں طریق کہ ہرگاہ پیش من می آمد اور ا سیلی می زدم تا کاہلی طبیعت را می گذاشت و چوں از اینجا پیش شیخ ابوالفضل می رفت او سیلی می زد و شعرا و اصلاح می داد۔	"یہ ان دنوں کی بات ہے جب حکیم ابھی نیا نیا آیا تھا، میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا کہ: خسرو اور وہی بارہ شعر ہیں، انوری کو انور ایک مداح کہا کرتا تھا اور خاقانی کے بارے میں کہتا تھا کہ اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا اس طور پر کہ جب میرے پاس آتا تو میں ایک چپت رسید کرتا تاکہ طبیعت سے کاہلی اور سستی رفع ہو جاتی اور جب یہاں سے ابوالفضل کے پاس جاتا تو وہ چپت رسید کرتا اسی طرح اس کے شعر کی اصلاح دیتے۔"

اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم خود کو ان شعراء سے برتر سمجھتا تھا۔ اسے شاعرانہ تعلّی اور زعم ہمہ دانی تو کہا جا سکتا ہے لیکن اخلاق ذمیمہ کہنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں بدایونی کے مذکورہ بیان کی کوئی تائید دوسرے معاصر مصنفین و مورخین کی شہادتوں

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷۔

سے نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حد درجہ متواضع، خاکسار اور نیک نہاد تھا۔ احباب کو غیر معمولی احترام واکرام سے خط لکھتا تھا، ارباب بست وکشاد سے غربا اور مستحقین کی سفارش کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ رقعات میں خانخاناں کے نام حکیم کے جو خطوط ہیں وہ اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں[1]۔

حکیم کے عقائد ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم پر بے دینی کا جو الزام لگایا ہے وہ بھی خلاف حقیقت اور بے وزن ہے جس کی تردید کے لیے صرف درج ذیل واقعہ کافی ہے جو مآثر الامراء میں شہباز خاں سے متعلق مذکور ہے، شاہنواز خاں لکھتے ہیں[2]:

بے وضو (یعنی شہباز خاں) نمی بود و ہمیشہ تسبیح در دست و ردمیخواند۔ چوں مابین عصر و مغرب حرف دنیوی نمی گفت، روزے آخر وقت عرش آشیانی بکنار تالاب فتحپور کسب ہوامی کردند و بست شہباز خاں گرفتہ مشغول حرف زدن بودند۔ او ہر ساعت نگاہے بآفتاب می کرد۔ حکیم ابوالفتح با حکیم علی می گفت: اگر امروز نماز عصر ایں مرد قضا نشود میدانیم کہ واقعی دیندار است۔ چوں وقت نماز تنگ شد ناچار عرض کرد	وہ یعنی شہباز خاں کبھی بے وضو نہیں رہتا تھا اور ہمیشہ ہاتھ میں تسبیح لیے ورد کرتا رہتا تھا، عصر و مغرب کے درمیان کسی قسم کی دنیوی گفتگو نہ کرتا تھا۔ ایک روز دن کے آخری اوقات میں عرش آشیانی فتحپور کے تالاب کے کنارے ہوا خوری کر رہے تھے اس حال میں کہ شہباز خاں کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا اور گفتگو کر رہے تھے۔ شہباز خاں کی نظر ہر آن سورج پر تھی حکیم ابوالفتح نے حکیم علی سے کہا: اگر آج اس شخص کی نماز عصر قضا نہ ہوئی تو ہم مان

---

[1] رقعات ابوالفتح گیلانی ص ۶۲، ۶۳ [2] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۹۹۔

بادشاہ فرمود قضا خواہی کرد ما را تنہا
میگذاری؟ شہباز خاں بے اختیار دست
خود را کشید و دو پٹہ انداختہ شروع
بہ نماز نمود و پس ازاں مشغول ورد
گشت، بادشاہ ہر لحظہ دستے بسرش
می زد کہ برخیز[1] حکیم ابوالفتح گفت،
انصاف نیست کہ در شغل ایں عزیز
خلل شود[2] پیش رفتہ عرض کرد کہ ایں
ہمہ لطف تنہا بایں مرد حسابے ندارد،
دیگراں ہم امیدوار چنیں مراحم بودند،
بادشاہ او را گذشتہ بآنہا متوجہ
شد۔"

لیں گے کہ واقعی دیندار ہے۔ جب نماز کا
وقت تنگ ہونے لگا تو اس نے ناچار
عرض کیا، بادشاہ نے کہا قضا پڑھ لینا
کیا مجھے تنہا چھوڑ دوگے؟ شہباز خاں نے
بے اختیار اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دوپٹہ زمین
پر ڈال کر نماز شروع کر دی اور اس کے
بعد ورد میں مشغول ہو گیا۔ بادشاہ برابر
اس کے سر پر ہاتھ مارتا جاتا تھا کہ اٹھو۔
حکیم ابوالفتح نے (دل میں) کہا کہ یہ انصاف
کی بات نہیں کہ اس شغل عزیز میں خلل واقع
ہو۔ چنانچہ آگے بڑھا اور عرض کیا: بادشاہ
سلامت تنہا ایک شخص پر اس درجہ لطف و
نوازش کہ کوئی حد ہی نہیں حالانکہ دوسرے
بھی اس لطف و مرحمت کے امیدوار ہیں۔
بادشاہ اس کو چھوڑ کر حکیم کی طرف متوجہ
ہو گیا۔

بے دینی کے الزام کی تردید ان خطوط سے بھی ہوتی ہے جو رقعات ابوالفتح گیلانی

---

[1] غالباً یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب اکبر الحاد و زندقہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ [2] اس سے حکیم کی دینی و ایمانی غیرت ظاہر ہوتی ہے۔

میں موجود ہیں۔ میں یہاں چند خطوط درج کرتا ہوں۔ ایک خط میں حکیم ابوالفتح حکیم ہمام کو لکھتا ہے:[1]

"دل بخدائے خود پیوستہ دار و از یاد او از برادر خود نگسستہ باش، برخواہش خود خواہش او را مقدم دار و دل تنگ مباش۔ بہ کلی باطن و ظاہر خود او را باش و بہ تربیت نفس ناطقہ مشغولی ورزو بعائب نفس بینا شو من بعد خود را الٰہی مداں و بر مخالف نفس صبور باش و مطالعہ احیاء و کیمیا را از دست منہ و بجز سخن خدا پرستاں مشنو و مگو و بغیر از یں طائفہ جلسہ و غلبہ باکسی آمیزش مکن و مرا در رنگ آنکہ گذاشتہ رفتہ بودی کشتہ و مردۂ دنیا میداں و در غم من مباش و فرزندان خود را در ارض خدا مہمان و بی نعمت حقیقی داں و از ہیچ کس در بیم و امید مرد و یقین داں کہ اگر چنیں باشی در سمرقند و بخارا نیستی و اگر حاشا غیر این معنی مذکور طبع باشد در عین شہر لاہیجان در دامن پدر و مادر بی غمخواری۔ حق تعالیٰ در ہمہ جا و در ہمہ حال ناصر و معین تو باشد۔"

اس خط کی ایک ایک سطر سے صاف عیاں ہے کہ اس کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ مذہبی بلکہ خدا ترس بھی ہے۔ جو شخص تربیت نفس کے لیے اپنے بھائی کو امام غزالی کی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت کے مطالعہ کے ساتھ خدا پرستوں کی صحبت نشینی کی تلقین کرتا ہے اور خدا کے سوا کسی دوسرے سے نفع و ضرر کی امید نہ رکھنے کی ہدایت کرتا ہے اس کے بارے میں یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب سے بے گانہ اور ملحد ہوگا۔ ایک دوسرے خط میں حکیم ہمام کو لکھتا ہے:[2]

---

[1] رقعات ابوالفتح گیلانی ص ۳۹ - ۱۳۸، خط نمبر ۵۹، مورخہ ۸ جمادی الثانی، ۹۹۰ ہجری (بقیہ حاشیہ ص ۷۵)

" اے برادر، کہ در ظلمات طبیعت بغم زن و فرزند درماند، ماند، بیت:

فرزند بندہ ایست خدا را غمش مخور — تو کیستی کہ بہ ز خدا بندہ پروری

حق تعالیٰ شما را بقضا و قدر خورسندی بخشد و کردار ما را موافق گفتار ما گرداند

تا از اصحاب "یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم (فتح-۱۱) نباشیم"

گفتار اور کردار میں مطابقت کی بات کرنے والے کو غیر مذہبی اور ملحد کون کہہ سکتا ہے اور کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کو منکرات اور اباطیل کی طرف ترغیب دیتا تھا اور اسے گمراہ کرتا تھا اور کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہندو دھرم وہ دینار تھا جیسا کہ بدایونی نے لکھا ہے۔

خواجہ حسین ثنائی نے بستر مرگ سے حکیم کو خط لکھا جس میں بیوی بچوں کے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز کا اظہار کیا گیا تھا۔ جواب میں حکیم نے اسے تسلی دی کہ اس راہ سے سب کو گزرنا ہے اور اس حادثہ سے سب کو دوچار ہونا ہے۔ خدا کے یہاں جو چیز مطلوب ہے وہ عجز و مسکنت، شکستگی اور نیازمندی ہے اور اس متاع عزیز سے تم تہی دامن نہیں ہو اس لیے خدا کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے، اس پر راضی و شاکر رہو اور غم فرزنداں و یاراں سے بے نیاز کہ خدا ان کا نگراں و نگہبان ہے۔ خط کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:[۱]

" ایں راہ ہم را در پیش است۔ فرزندانِ خود را بہ خدا بسپارید و از مخلوقات خاطر جمع دارید کہ تربیت کنندہ خدا است۔ بدرگاہ عظمیٰ کہ متوجہ اند، چیزی

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳) [۱] رقعات ص ۱۲۵ مورخہ ماہ شوال ۹۹۴ھ (حاشیہ صفحہ ہذا) رقعات ابوالفتح ص ۱۲۱ خط نمبر ۵ مکتوبہ دھم رمضان المبارک۔

می طلبند کہ نداری، عجز و مسکنت و شکستگی و نیاز مندی می طلبند۔ الحمد للہ کہ ایں

متاع خانہ شما است۔ از ہرچہ خدا کردہ کند راضی و شاکر باش۔ صحت و مرگ را

برابر انگار۔ غم فرزنداں و یاراں مخور کہ آنہا ہمچو شما در حفظ حمایت الٰہی محفوظ اند"

ان خطوط کی روشنی میں پورے اعتماد و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حکیم

ابوالفتح کے اخلاق کے بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے وہ غلط اور

بے بنیاد ہے،

حکیم کا مذہب | مولف نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ حکیم مذہب اثنا عشری رکھتا

تھا[1] لیکن رقعات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی کی احیاء

و کیمیا دونوں برابر اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے

لیکن اس باب میں بالیقین کچھ کہنا مشکل ہے۔

تصنیفات | حکیم ابوالفتح نے درج ذیل کتابیں تالیف کیں؛

(۱) فتاحی: یہ قانونچہ (علامہ چغمینی) کی بسیط شرح اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اس کی تحسین ان لفظوں میں کی ہے[2]:

"شیخ سینا کی روح کو آب حیات پلایا اور گویا اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے"۔

(۲) قیاسیہ: یہ اخلاق ناصری[3] کی شرح ہے اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

حکیم ابوالفتح نے اس کتاب کے ایک ایک مسئلہ کو جو براہین فلسفہ پر مبنی ہیں، دلائل

---

[1] نزہتہ الخواطر ج ۴ صفحہ [2] دربار اکبری ص۶۹۶ [3] اخلاق ناصری مشہور عالم ہیئت اور فلسفی نصیر الدین طوسی کی تالیف ہے۔ نصیر الدین طوسی ۵۹۷ ہجری میں طوس میں پیدا ہوئے اور ۶۷۳ ہجری میں بغداد میں فوت ہوئے۔

نقلی سے ثابت کیا ہے اور آیتوں اور حدیثوں سے مطابقت دی ہے مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:[1]

" اخلاق ناصری کی شرح حکمت و شریعت کی دو نہریں ہیں۔ حقیقت میں اس کے ایک ایک مسئلہ کو جو فلسفیانہ براہین پر قائم ہیں، دلائل نقلی سے مبرہن کیا ہے۔"

(۳) چار باغ : یہ حکیم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اس نے ۹۸۳ ہجری سے ۹۹۷ ہجری کے عرصہ میں اپنے مخصوص احباب اور اہل خاندان مثلاً خانخاناں، میراں صدر خوافی خاں، شاہ منصور، میر شریف آملی، خواجہ حسین ثنائی، خواجہ عطا بیگ، حکیم لطف اللہ اور حکیم ہمام وغیرہ، سب سے زیادہ خطوط حکیم ہمام کے نام ہیں۔ یہ خطوط بے تکلفی اور سادہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ اسلوب تحریر فیضی کے اسلوب سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے خطی نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔

(۴) رقعات ابوالفتح گیلانی : اس کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) میں موجود ہے۔[2]

(۵) طب ابوالفتح : یہ حکیم کے معمولات و مجربات کا مجموعہ ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اسٹوری کے بیان کے مطابق یہ کتاب رسالہ طب المجربات کے نام سے لاہور یونیورسٹی (پاکستان) میں موجود ہے اور اس کا نمبر ا ہے۔[3] خدا بخش لائبریری کی طرف سے "پاکستانی کتب خانوں میں غیر مطبوعہ مخطوطات" کے نام سے جو کتابچہ شائع ہوا ہے اس میں

---

[1] دربار اکبری ص ۷۹۱۔ ڈاکٹر محمد بشیر حسین کی تعلیم کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں یہ کتاب لاہور سے شائع ہو چکی ہے۔ [2] پرشین لٹریچر ج ۲ ص ۲۴۹۔

بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کی موجودگی ظاہر کی گئی ہے[1]

افادات حکیم ابوالفتح | مختلف موضوعات پر حکیم کے افکار و خیالات کا مجموعہ ہے اس کا ایک خطی نسخہ تہران میں ڈاکٹر اصغر مہدی کے پاس موجود ہے[2]

حکیم کوثر چاندپوری نے اپنی کتاب اطبائے عہد مغلیہ میں حقے کی ایجاد کو حکیم ابوالفتح کی طرف منسوب کیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ اس کا تعلق حکیم عین الملک شیرازی متخلص دوائی سے ہے[3]

اولاد | حکیم کے ایک بیٹے کا نام فتح اللہ[4] تھا جیسا کہ حکیم ہمام کے نام ایک خط میں مذکور ہے[5]: "بندۂ زادہ شما فتح اللہ تسلیم کردہ دعای دوام دولت داریں عرض نماید"۔ رقعات میں حکیم کے دو اور بچوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک لڑکا ابوالوفا اور دوسری لڑکی عائشہ بانو ایک خط میں ان تینوں کا ذکر موجود ہے: "فرزندان بصحت و سلامت اند، فتح اللہ و ابوالوفا و عائشہ بانو تسلیم کردہ بندگی میرسانند، فتح اللہ بسیار ترقی کردہ"[6] فتح اللہ کا ذکر اس خط میں بھی ہے جو خواجہ حسین ثنائی کے نام ہے[7]: "فرزند فتح اللہ کہ سر رشتۂ

---

[1] دیکھیں کتابچہ مذکور ص ۵ [2] نشریہ کتبخانہ مرکزی دانشگاہ تہران ج ۲ ص ۱۰ [3] اکبر نامہ (قلمی) اسد بیگ ص ۹۰-۹۳ بحوالہ دربار ملی ص ۱۰۱-۱۰۳ [4] حکیم کا یہ لڑکا جہانگیر کے عہد میں کابل کے مقام پر خسرو کی سازش کے الزام میں سازش کے دوسرے شرکاء کے ساتھ گرفتار ہوا اور بطور سزا گدھے پر الٹا سوار کرا کے منزل بہ منزل گھمایا گیا اور آخر میں اندھا کر دیا گیا، ملاحظہ ہو: مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۹۹، اقبال نامۂ جہانگیری ج ۱ ص ۲۹ و دربار اکبری ص ۷۶۶ [5] رقعات ص ۱۱۲ [6] توزک جہانگیری میں فتح اللہ اور ابوالوفا دونوں کا ذکر ہے، دیکھیے ص ۵۸، ۶۷

[7] رقعات ص ۱۲۹۔

وفا و حقیقت است، ہمیشہ یاد میکند و سلام میرساند۔"

وفات | ۹۹۷ھ مطابق ۱۵۸۹ء میں جب اکبر کشمیر کی سیاحت پر گیا تو جو امراء و اعیان سلطنت اس کے ساتھ تھے ان میں حکیم ابوالفتح بھی تھا[1]۔ ۲۷ رمضان ۹۹۷ھ کو اکبر کشمیر سے سیر و تفریح کی غرض سے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں حکیم کو مرض اسہال لاحق ہوا۔ بادشاہ خود اس کی عیادت کے لیے گیا۔ علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ دمتور[2] پہنچ کر ۱۹ شوال، ۹۹۷ ہجری کو حکیم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بادشاہ کے حکم سے اس کو حسن ابدال[3] کے شاداب و پر فضا مقام پر اس گنبد میں دفن کیا گیا جسے خواجہ شمس الدین خوافی نے اپنے لیے بنوایا تھا[4]۔ جہانگیر توزک میں لکھتا ہے[5]:

"خواجہ شمس الدین محمد خافی کہ مدتے بشغل وزارت والد بزرگوارم مشغول داشت، صفہ بستہ و حوضی درمیان آں ترتیب دادہ کہ آب چشمہ آنجا دری آید و از انجا بزراعت و باغات صرف می شود۔ برکنار ایں صفہ گنبدی بجہت مدفن خود ساختہ بود، بحسب اتفاق نصیب اونشد و حکیم ابوالفتح گیلانی و برادرش حکیم ہمام را کہ در

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۳۵ [2] دمتور، ایبٹ آباد (پاکستان) سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ایک چھوٹی سی بستی ہے [3] حسن ابدال کے جائے وقوع کے متعلق حکیم کوثر چاندپوری کا بیان صحیح نہیں ہے۔ حسن ابدال پنجاب کے بجائے صوبہ سرحد میں پشاور کے قریب ایک منزل کا نام ہے جو بابا حسن ابدال کے نام سے موسوم تھی۔ کیونکہ اس کے قریب ہی ان کی خانقاہ واقع تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں، توزک جہانگیری ص ۴۸ [4] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۸۹، اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۶۰ [5] توزک جہانگیری ص ۴۸۔

خدمت والد بزرگوارم نسبت مصاحبت وقرب و محرمیت تمام داشتند حسب الحکم آنحضرت درآں گنبد نہادہ اند۔"

ملا عبدالقادر بدایونی کو حکیم سے اس درجہ بغض و عناد تھا کہ وفات کے بعد بھی اسے اچھے الفاظ سے یاد نہ کیا اور "خدا لیش سزا دہاد" سے اس کی تاریخ وفات نکالی[1]
لیکن دوسرے معاصرین کا طرز عمل اس سے قطعاً مختلف تھا۔ ہر ایک نے اس دانائے روزگار کی بے وقت موت پر اظہار تاسف کیا۔ درباری شعراء نے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے مرثیے کہے۔ حکیم کی وفات سے چند روز قبل شاہ فتح اللہ شیرازی کا انتقال ہوا تھا فیضی نے ان دونوں افاضل وقت کا جو مرثیہ کہا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:[2]

اول امام دین عضد الدولہ بحر علم — قرابۂ حقائق و علامۂ زماں
دیگر حکیم عہد ابوالفتح آنکہ بود — مجموعۂ معانی و دیباچۂ بیاں
واحسرتا کہ رفت فلاطون دور بین — واعبرتا کہ مرد ارسطوی کاروان
یارب چہ گویم و چہ نویسم ز درد دل — برکبریای علم الٰہی بود عیاں
در موقف تقاضاش تو واثق نظر بدار — در مشہد رضاش تو ثابت قدم بمان

عرفی نے بھی حکیم کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ کہا جس کے چند تعزیتی شعر درج ہیں[3]

دریں معیبت عظمیٰ کہ دہر سنگیں دل — زگریہ ہر سو مو چشم خوں فشاں آمد
کہ رہبرش بعدم شد کہ مرگ در مرگش — سیاہ پوش تر از عمر جاوداں آمد
تو آگہی کہ مراز غروب ایں خورشید — چہ گنجہائے سعادت زیان جاں آمد

---

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۷۰، [2] اکبرنامہ ج ۳ ص ۵۹۹ و کلیات فیضی ج ۲ ص ۱۷۰،
[3] دیوان عرفی ص ۲۲۔

شہنشاہ اکبر کو حکیم کی ناگہانی موت سے جو صدمہ پہونچا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کابل سے واپسی پر "باریک آب" کے مقام پر جب اس کی ملاقات حکیم ہمام سے ہوئی جو توران کی سفارت سے واپس ہوا تھا تو اس نے ان الفاظ میں دلجوئی کی:[۱] ترا یک برادر بود و از عالم رفت و مارا دہ سے

از حساب دو چشم یک تن کم　　واز شمار خرد ہزاراں بیش

اور جب وہ (بادشاہ) حسن ابدال پہونچا تو حکیم کی قبر پر فاتحہ خوانی کیلئے گیا۔[۲]

---

[۱] مآثر الامرا ج ۱ ص ۵۵۷ [۲] ایضاً۔

اُموی دور کی غزلیہ شاعری

از جناب محمد سمیع اختر صاحب ریسرچ اسکالر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

غزل شاعری کی اہم صنف ہے جو دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے اور دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے اندر آج بھی غزلیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے، عربی شاعری کا سرمایہ بھی اس سے خالی نہیں، ہر دور کے شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے، افکار و خیالات، الفاظ و تشبیہات اور اسلوب و فن کے اعتبار سے ہر دور کی غزلیہ شاعری کی کچھ نمایاں اور امتیازی خصوصیات ہیں۔

عربی میں غزل کی ابتدا عہد جاہلیت ہی میں ہو گئی تھی اور ظہور اسلام سے پہلے ہی اس نے عروج و ارتقا اور پختگی و بلندی کے مدارج طے کر لیے تھے۔

جاہلی دور میں غزلیہ اشعار عموماً قصائد کے شروع میں تشبیب کے طور پر آتے تھے۔ اس کے لیے غزل، نسیب، تشبیب اور تغزل جیسے الفاظ مروج تھے، جن کے بنیادی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ ان سب کی غایت عورت کے متعلق محبت آمیز جذبات اور عشقیہ خیالات کا اظہار و ترجمانی ہے۔ جاہلی شاعری میں مدح، فخر، حماسہ اور مرثیہ کی طرح تشبیب و تغزل کے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں جن کی ادبی قدر و قیمت، جدت و تازگی اور لطافت و نزاکت میں صدیاں گزرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے لیکن اس کے باوجود جاہلی دور میں غزل نے علاحدہ صنف سخن کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی۔

غزل کو ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت اموی دور میں جا کر حاصل ہوئی۔

اموی دور میں خلفا نے فتوحات کی طرح علوم و فنون اور شعر و سخن کی ترقی کی جانب بھی توجہ کی۔ ان کی سرپرستی کی وجہ سے شعرا نے بھی شاعری کو اپنا مرکز توجہ بنایا اور اس کے قدیم موضوعات میں وسعت دے کر بعض نئے اصناف کلام کا اضافہ بھی کیا، مورخین اور ناقدین نے بنیادی طور پر اموی دور کی غزل گوئی کی دو قسمیں قرار دی ہیں (۱) عذری غزل گوئی (۲) اباحی غزل گوئی۔

عذری[1] مکتبہ شاعری | اسلام نے محبت کے فطری جذبہ کو نہ تو ختم کیا اور نہ ہی اسے اخلاقی اور مذہبی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کے اس لطیف جذبہ میں اعتدال پیدا کرنے کیلئے کچھ اخلاقی اصول متعین کیے اور عفت و پاکیزگی کی قید عائد کی جن کے اندر رہتے ہوئے شعرا کو اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت دی۔ عذری غزل گوئی عشق و محبت کے پاکیزہ انسانی جذبات کو فنی باریکیوں کے ساتھ ادا کر دینے کا نام ہے۔ شاعری کی اس طرز کی نمایندگی کچھ ایسے شعرا کر رہے تھے جو تشبیب کے باوجود طہارت، عفت، متانت اور شرافت کے اصولوں اور اسلامی تعلیمات کی پوری رعایت کرتے تھے۔ اس طرز فکر کے شعرا عارضی محبت کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے جذبات میں دوام اور بقا کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ ان کا محبوب وقت اور زمانے

---

[1] یہ قبیلہ بنو عذرہ کی طرف نسبت ہے۔ جو اپنی پاکیزہ اور سچی محبت کے لیے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ جب محبت کرتے تو اس راہ میں مرجانا گوارا تھا مگر محبوب کی رسوائی یا پیچھے ہٹ جانا منظور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور سچی محبت کے اظہار کے لیے اس لفظ کو خاص کر لیا گیا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام شعرا کا تعلق اسی قبیلے سے ہو۔ (ادباء العرب۔ بطرس بستانی صفحہ ۲۸۶)

کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا ہے بلکہ جسے وہ پسند کرتے ہیں اس سے وہ تاحیات محبت کا دم بھرتے ہیں مگر اپنے جذبات کے اظہار میں کبھی کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لاتے جو محبوب کی رسوائی یا بدنامی کا سبب بنے یا جو اسلامی اخلاق و پاکیزگی کے اصول سے فروتر ہو۔ وہ محبوب کے ساتھ تشبیب کرتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کو بے لگام نہیں چھوڑ دیتے بلکہ ان کو اعلیٰ انسانی و روحانی اقدار کا پابند بناتے ہیں وہ محبوب کے ظاہری محاسن، عارضی حسن، فانی شباب کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے اس کے اعلیٰ اخلاق و کردار اس کے عمدہ عادات و اطوار، اس کی حیا اور عفت کی تعریف کرتے ہیں، وہ لوگ فحش گوئی اور بوالہوسی کے جذبات کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے شعرا کی اکثریت نجد و حجاز کے علاقے میں آباد تھی۔ ان شعرا کی شعری خصوصیات ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ جمیل بن معمر اس مکتبۂ فکر کا بانی اور روح رواں کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد کے تمام شعرا کے اشعار میں فکری و فنی دونوں اعتبار سے جمیل کی خوشہ چینی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان تمام شعرا کی داستان عشق بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہے کہ شاعر کی کسی خوبصورت لڑکی پر نظر پڑتی ہے، وہ اس کے عشق و محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، جدائی کے عالم میں اس کے ساتھ تغزل شروع کر دیتا ہے، معاملہ کچھ اور آگے بڑھتا ہے، شاعر اس کے گھر والوں کو شادی کا پیغام بھیجتا ہے، محبوب کے گھر والے زمانے کی لعن طعن کے خوف اور خاندانی شرف و مجد کی دیوار کھڑی کر کے شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ آخر کار شاعر مایوسی، بے بسی اور نا امیدی کے عالم میں سنسان علاقوں اور ویران وادیوں کا رخ کرتا ہے اور اپنے اوپر طاری حالات کو اشعار کا قالب عطا کرتا ہے۔ پھر ہجر و فراق کے ان جانگداز لمحات میں بے رحم موت کے آہنی پنجے اسے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ

ہر طرح کی دنیوی کلفتوں اور پریشانیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس مکتب فکر کے مشہور غزل گو شعرا میں جمیل بن معمر (صاحب بثینہ)، قیس بن ذریح (صاحب لبنیٰ) مجنون عامری (صاحب لیلیٰ) توبہ بن حمید، قیس بن طوح وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔[1]

جمیل بن معمر حجاز کے مشہور علاقے وادی القریٰ میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ پورا نام جمیل بن عبداللہ بن معمر عذری ہے۔ وادی القریٰ ہی میں اس کی دنیائے دل کی ملکہ اور اس کی زندگی کی منتہا دمقصود بثینہ بھی رہتی تھی۔ یہیں کی سرسبز وادیوں میں ان کی پاکیزہ محبت پروان چڑھی اور عہد طفولیت ہی میں دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہو گئے۔" وادی بغیض" میں دونوں ایک ساتھ اپنی اونٹنیاں چرایا کرتے تھے۔ اس وادی کا تذکرہ اس کے اشعار میں جابجا ملتا ہے[2]۔ شباب کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی دونوں کے عشق و محبت میں پختگی آئی۔ جمیل کی سوزش عشق میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ خاندان اور قبیلے میں رسوائی اور بدنامی کے خوف سے بثینہ کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دیا گیا۔ جمیل نے اس کے گھر والوں کو اپنی شادی کا پیغام بھیجا جسے مسترد کر دیا گیا۔ اور بثینہ کی شادی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دی گئی۔ اس طرح اس کی خواہشوں اور تمناؤں کا خون ہو گیا اور پھر اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔ بثینہ کے دل میں بھی عشق کی سوزش جمیل سے کچھ کم نہ تھی۔ دونوں نے رات کی تاریکی میں دنیا سے چھپ کر ملاقات کا منصوبہ بنایا۔ بثینہ کے خاندان والوں کو اس معاملے کی خبر ہو گئی۔ ان لوگوں نے مروان بن حکم سے اس کی شکایت کر دی۔ چنانچہ سلطان نے اس کا خون کر دیا اور اس کی زبان کاٹنے کا حکم صادر کیا۔[3] قتل کے ڈر سے مدینہ چھوڑ کر وہ شام اور یمن کے علاقوں کی طرف بھاگ گیا۔

---

[1] تاریخ الادب العربی۔ حنا فاخوری ص ۲۴۴-۲۴۳ [2] ادباء العرب۔ بطرس البستانی ص ۲۸۰ [3] تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام

مروان کی معزولی کے بعد وہ وطن لوٹا مگر یہاں اس کا دل نہ لگا اور وہ مصر چلا گیا اور وہیں گمنامی کی زندگی گذارتے ہوئے اسے ایسا مرض لاحق ہو گیا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ جمیل کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا اور نہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا بلکہ اسلامی احکام کی پابندی کرتا رہا[1]

جمیل کی شاعری | تاریخ اور ادب کی متعدد کتابوں میں جمیل کے اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ اسکی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ابن خلکان کے زمانے میں اس کے اشعار کا ایک ضخیم دیوان موجود تھا جو ضایع ہو گیا۔ اس کے اشعار پر مشتمل ایک مخطوطہ برلین کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے[2]

جمیل بن معمر نے عربی غزل گوئی کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ اس کے تغزل کا رنگ امرء القیس، زہیر، طرفہ اور دیگر جاہلی شعرا کی غزل گوئی سے مختلف ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بوسیدہ کھنڈرات، ہرن کی مینگنیوں یا محبوب کے جسمانی حسن و جمال کا ذکر نہیں کرتا بلکہ محبت کے لطیف جذبات، پاکیزہ خیالات اور اندرونی احساسات کے تاروں کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقیہ خیالات کے اظہار میں بے باکی دکھانے کے بجائے عفت و اخلاق کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا۔ اس کے اشعار میں فطری سادگی اور راست گوئی کے ساتھ ساتھ شعری لطافت اور فنی جدت و ندرت کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے اسکے خیالات میں ابہام و پیچیدگی کے بجائے وضاحت و صفائی کا عنصر غالب ہے۔ وہ نادر تشبیہات و استعارات کا سہارا لینے کے بجائے اپنی بات کو عام اور فطری انداز میں سادگی سے بیان کرتا ہے۔

---

[1] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب۔ عبدالحیٔ بن عماد۔ ج ا ص ۱۰۹ [2] ادبیات العرب۔ ص ۲۸۸۔

اس کے اشعار کی ایک بڑی خصوصیت مقصد کی وحدت ہے۔ تغزل سے متعلق اسکے تمام اشعار کا مرکز و محور "بثینہ" کی ذات ہے ہیں کا مرض بھی بثینہ ہے اور اس کی دوا بھی وہی ہے۔ اس کے اشعار میں زندگی کی امنگ اور امید کے بجائے یاس و ناامیدی کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اشعار کے اندر زیادہ تر اپنے رنج والم اور غم و اضطراب کی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بثینہ کے ساتھ اس کی محبت کسی وقتی ردعمل یا اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ کبھی تبدیل نہ ہونے والی ایک حقیقت تھی اسلیے اس کے جذبۂ عشق و محبت کی چنگاریاں ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہیں۔ اس کے مندرجۂ ذیل اشعار میں ہجر و فراق اور الم و کلفت کے انہی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ألا ليت شعري هل أبيتن ليلة   بوادي القرى، إني إذاً لسعيد

(سنو! کاش مجھے وادی قریٰ میں ایک رات گذارنے کا موقع مل جاتا تو میں اپنے آپکو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کرتا)

وهل ألقين فرداً، بثينة مرة   تجود لنا من ودها ونجود

(کاش میں ایک بار بثینہ سے تنہائی میں مل پاتا تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کر پاتے)

علقت الهوى منها وليداً فلم يزل   الى اليوم ينمي حبها ويزيد

(میں بچپن ہی سے اسکی محبت میں گرفتار ہو گیا اور آج تک اسکی محبت میرے دل میں نہ صرف باقی ہے بلکہ برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے)

وأفنيت عمري بانتظاري وعدها   وأبليت فيها الدهر وهو جديد[1]

(میں نے اسکے وعدے کے انتظار میں پوری زندگی ختم کر دی اور اسکی محبت میں زمانے نے مجھے ہمیشہ ایک نئے غم سے دوچار کیا)

ایک دوسری جگہ راہ عشق میں اپنی مجبوری و بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وقد قلت في حبي لكم وصبابتي   محاسن شعر ذكرهن يطول

---

[1] کتاب الاغانی۔ ج۔ ۷۔ ص ۹۳۔

(میں نے تمہارے عشق و محبت میں عمدہ اشعار کہے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا)

فان لم یکن قولی و شانک فعلی   هبوب الصبا یا بثن کیف أقول

(اگر میرے اشعار تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں تو اے بثینہ! تم ہی بتاؤ کہ میں اپنے سوز عشق کا اظہار کیسے کروں!)

فما غاب عن عینی خیالک لحظة   ولا زال عنها، والخیال یزول[1]

(میری آنکھوں کے سامنے سے تیری تصویر ایک لمحے کے لیے بھی غائب نہیں ہوئی اور تیرا خیال بھی ہمیشہ میرے ساتھ ہے)

ذیل کے اشعار کی سادگی و پرکاری ملاحظہ ہو۔

یقولون جاهد یا جمیل بغزوة   وأی جهاد غیرهن أرید

(لوگ مجھ سے جنگ و جہاد کی باتیں کرتے ہیں، بھلا ان کی چاہت سے بڑھ کر کون جہاد ہو سکتا ہے)

لکل حدیث عندهن بشاشة   وکل قتیل بینهن شهید[2]

(ان کی محفل میں ہونے والی ہر گفتگو باعث فرحت و مسرت ہے اور ان کی جستجو میں مرنے والا ہر شخص شہید ہے۔

پھر وہ اپنی محبت اور وفا کی صداقت کا یقین دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

یا لیتنی ألقی المنیة بغتة   إن کان یوم لقاءکم لم یقدر

(اگر تمہاری ملاقات میرا مقدر نہیں تو ایسی زندگی سے کیا حاصل، کاش مجھے اچانک موت ہی آجائے۔)

یهواک ما عشت الفؤاد فإن أمت   تتبع صدای صداک بین الأقبر[3]

(جب تک میں زندہ ہوں یہ دل تمہاری محبت ہی میں دھڑکے گا، اگر میں مر گیا تو قبروں کے درمیان میری آواز تمہاری آواز کا پیچھا کرے گی)

قیس بن ذریح اس عذری مکتبہ فکر کا دوسرا بڑا شاعر قیس بن ذریح ہے۔ اس کی پیدائش کی تاریخ تو نہیں معلوم مگر اس کی وفات ۶۸ ہجری میں ہوئی۔[4] اس کے عشق و محبت کی داستان

---

[1] کتاب الاغانی۔ ج ۷، ص ۸۶ [2] ایضاً ص ۵۸ [3] الغزل منذ نشأته حتی صدر الدولة العباسیہ۔ ج ۱۔ الدکتور سامی دھان وا حبابہ۔ ص ۲۰ [4] الاعلام۔ ج ۵۔ ص ۲۰۵

بھی جمیل کی داستان محبت سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ کسی سفر کے دوران لبنیٰ نام کی کسی خوبصورت لڑکی پر اس کی نظر پڑی اور پھر وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے لبنیٰ سے شادی کرنا چاہا لیکن دونوں کے خاندانوں کے سربراہ اس ارادہ میں حائل ہو گئے۔ آخرکار قیس نے حسین بن علی سے جو اس کے رضاعی بھائی تھے اُس معاملے میں ثالثی کا فریضہ انجام دینے کی درخواست کی جس کے بعد دونوں کی شادی ہو گئی لیکن خوشی کے یہ لمحات دیرپا ثابت نہیں ہوئے اور قیس کو اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر بادل ناخواستہ لبنیٰ کو طلاق دینی پڑی اور پھر پوری زندگی وہ حسرت و ندامت کی آگ میں جلتا رہا۔ اس کے غزلیہ اشعار میں بھی سادگی، سلاست، صفائی، جدت اور رقت کی وہی خصوصیات نمایاں ہیں جن کا مطالعہ جمیل کی شاعری میں کیا جا چکا ہے۔ جمیل کی طرح قیس نے بھی پوری زندگی لبنیٰ کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کی اور جدائی کے باوجود وہ اس کی محبت کو دل سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ چنانچہ وہ اپنی دلی کیفیات کا اظہار اس طرح کرتا ہے :-

لقد خفت أن لا تقنع النفس بعدها   بشئ من الدنيا وأن كان مقنعاً

مجھے ڈر ہے کہ اسکی جدائی کے بعد دنیا کی کوئی چیز بھی میرے دل کو قرار و سکون نہیں دے سکتی خواہ اسکے اندر دوسروں کیلئے قرار موجود ہو

الى الله أشكو فقد لبنى كما شكا   الى الله فقد الوالدين يتيم

میں لبنیٰ کے کھو جانے پر اللہ تعالیٰ کے حضور اسی طرح فریاد کر رہا ہوں جسطرح کہ ایک یتیم اپنے والدین کی جدائی پر کرتا ہے

أفي الحق هذا أن قلبك فارغ   صحيح وقلبي في هواك سقيم

کیا یہ سچ ہے کہ اس جدائی کے باوجود تمہارا دل مطمئن و پرسکون ہے؟ وہ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، جبکہ میرا دل تمہارے عشق میں بیمار ہو چکا ہے

نهاري نهار الناس حتى اذا بدا   لي الليل هزتني أليك المضاجع

له وفیات الاعیان۔ ابن خلکان۔ ج ۲ ص ۱۳۲۔

دن کا وقت تو لوگوں کے ساتھ گذر جاتا ہے یہاں تک کہ جب رات آتی ہے تو تمہاری یاد مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔

لقد رسخت فی القلب منک مودۃ   کما رسخت فی الراحتین الاصابع[1]

تمہاری محبت میرے دل میں اسی طرح راسخ ہو چکی ہے جسطرح کہ انگلیاں دونوں ہتھیلیوں کے درمیان راسخ ہوتی ہیں۔

قیس بن ملوح | قیس بن ملوح بھی عذری مکتبۂ فکر کا نمائندہ شاعر ہے۔ لیلیٰ بنت سعد نام کی لڑکی سے اس کو عشق تھا۔ اس کے جنون کی حد تک بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا لقب مجنوں پڑ گیا تھا۔ اس کی وفات بھی ۶۸ ہجری میں ہوئی[2] اس کی داستان عشق کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ قیس کا تعلق قبیلہ بنو عامر سے تھا۔ اس قبیلے میں لیلیٰ نام کی ایک لڑکی تھی دونوں بچپن میں ایک ساتھ مویشیاں چرایا کرتے تھے۔ یہیں سے ان کی محبت کی داستان شروع ہوتی ہے۔ جوانی کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد دونوں کی آزادانہ ملاقات پہ پابندی لگا دی گئی۔ پھر قیس کے ساتھ مزید ظلم یہ کیا گیا کہ لیلیٰ کے خاندان والوں نے اس کی شادی کسی اور کے ساتھ کر دی۔ اس کے بعد قیس نے آبادیوں کو چھوڑ کر ریگستانوں اور ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیا اسی طرح صحرا نوردی کرتا ہوا اس دنیا سے ناکام و نامراد کوچ کر گیا۔[3] اسکے غزلیہ اشعار میں بھی طہارت، عفت، پاکیزگی، سادگی، روانی، رقت اور اثر پذیری کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

أنی لاخشی أن أموت فجأۃ   وفی النفس حاجات الیک کما ھیا

مجھے اندیشہ ہے کہ میں اچانک اس دنیا سے مرجاؤں اور تم سے حال دل سنانے کی خواہش دل ہی میں باقی رہ جائے۔

وانی لینسینی لقاؤک کلما   لقیتک یوما أن ابثک ما بیا

جب کبھی میں تم سے ملا تو تمہاری ملاقات سے میرے اوپر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں تم سے اپنا راز دل نہ کہہ سکا۔

---

[1] الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیۃ ج ۱ ص ۷۵ [2] الاعلام ج ۵ ص ۲۰۸ [3] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۳۷۔

وما بی اشراک و لکن حبہا کعود الشجا اعیا الطبیب المداویا

لیکن تمہاری محبت اس ناسور کی طرح ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس سے باہر کی چیز ہے۔

أحب من الاسماء ماوافق اسمہا واشبہہ او کان منہ مدانیا[1]

مجھے ہر اس بشر سے محبت ہے جسکا نام تمہارے نام کیطرح، یا تمہارے نام سے ملتا جلتا یا اس سے کسی طرح کی قربت رکھتا ہو۔

ایک اور مقام پہ اپنی پاکیزہ محبت اور دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

اروم سلو النفس عنک وما لہا الی احد الا الیک طریق

میں نے تمہاری یاد کیطرف سے اپنے دل کو موڑنے کی کوشش کی مگر میرا دل تمہارے علاوہ کسی اور کی طرف مائل نہیں ہوا۔

ولو تعلمین الغیب ایقنت انی حبیب وانی للحبیب مشوق[2]

اگر تجھے غیب کا علم ہوتا تو تو جان لیتی کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں اپنے محبوب سے ملاقات کرنے کا مشتاق ہوں۔

کثیر بن عبدالرحمن | عذری مکتبۂ فکر کا یہ بھی مشہور نمائندہ شاعر ہے اور کثیر عزہ کے نام سے مشہور ہے۔ تذکرے کی قدیم کتابوں میں اس کے عشق و محبت کے واقعات و حکایات بھی تفصیل سے ملتے ہیں۔ کثیر بن عبدالرحمن بن اسود بن عامر خزاعی کی روداد زندگی بھی جمیل اور قیس کے حالات سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی غالب گمان یہ ہے کہ ۱۰۵ھ میں اس کی وفات ہوئی[3]۔ کثیر مدینہ کا مشہور غزل گو شاعر تھا۔ اس نے بھی جمیل اور قیس کی طرح اپنی زندگی میں صرف ایک لڑکی "عزہ" سے محبت کی۔ عبدالملک بن مروان اس کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی قدر و منزلت کی بنا پر اس کا قدرداں تھا[4]۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ غالی شیعہ تھا[5]۔ کثیر کی داستان

---

[1] الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیہ ص ۲۷ [2] حدیث الاربعاء ج ۱ ص ۱۹ [3] الاعلام ج ۵ ص ۱۹

[4] کتاب الاغانی ج ۱۱ ص ۴۳ [5] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۴۳۳ ۔

عشق کا لب لباب یہ ہے کہ وہ اپنی بھیڑوں کی گلہ بانی کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بھیڑوں کو چرا رہا تھا کہ کچھ لڑکیوں کا ادھر سے گذر ہوا۔ انھوں نے "عزہ" نام کی ایک لڑکی کو کثیر کے پاس مینڈھا خریدنے کے لیے بھیجا۔ وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے اسے مینڈھا دیدیا جس سے وہ بہت خوش ہوئی اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بہانے سے ملتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں جنون کی حد تک آگے بڑھ گئے عزہ کے خاندان والوں نے دونوں کی ملاقات پر پابندی لگادی جس کے بعد کثیر اپنے اشعار میں اس کے ساتھ تشبیب کرنے لگا۔ سوزش عشق میں اس کی حالت اس وقت اور بھی دگرگوں ہوگئی جب اس کی شادی کسی غیر سے کردی گئی[1] اس کے اشعار کے اندر بھی صداقت، عفت، پاکیزگی، سادگی، روانی، صاف گوئی اور اسلامی تعلیمات کا لحاظ جیسی خصوصیات موجود ہیں جو عذری مکتبۂ فکر کے دیگر شعرا کی خصوصیت ہے۔ کتاب الاغانی اور تذکرے کی دوسری کتابوں میں اس کے اشعار کثرت سے بکھرے پڑے ہیں۔ کثیر کے رنج والم کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

وما کنت ادری قبل عزۃ ما البکا　　ولا موجعات القلب حتی تولت

میں عزہ کی جدائی سے قبل یہ نہیں جانتا تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ یا دلی رنج و قلق کسے کہتے ہیں؟

فقلت لھا یا عزۃ کل مصیبۃ　　اذا وطنت یوما لھا النفس ذلت[2]

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اے عزہ! ہر مصیبت و مشکل خواہ وہ کتنی بڑی ہو اگر نفس کو اسکے لیے تیار کرلیا جائے تو آسان ہوجاتی ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنی محبت، وفا اور خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:-

---

[1] خزانۃ الادب البغدادی ج ۲ ص ۳۸۱ [2] کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ۔ احمد محمد شاکر ج ۱ ص ۴۹۹ (پورا قصیدہ)

لا تقدرن بوصل عزة بعد ما — أخذت علیك مواثقا وعهودا

عزہ سے بے وفائی اور اس کی ملاقات کی ہرگز غفلت نہ برتنا جبکہ اس نے تمہارے ساتھ محبت اور دوستی کے عہد و پیمان باندھے ہیں

أن المحب اذا احب حبیبه — صدق الصفاء وانجز الموعودا

جب کوئی کسی سے محبت کرے تو اسکی دوستی میں خلوص اور وعدے میں وفا کے جذبے کا ہونا بہت ضروری ہے۔

لو لیسمعون کما سمعت کلامها — خروا لعزة رکعا و سجودا

کاش یہ لوگ عزہ کی گفتگو کو سن پاتے جس طرح کہ میں سنتا ہوں تو یہ لوگ عزہ کے روبرو سربسجود ہو جاتے[1]

اباحی شاعری حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد مسلمانوں میں خوابیدہ جاہلی جذبات پرورش پانے لگے۔ اسلامی تعلیمات اور اخلاقی حدود و قیود سے آزادی کا رجحان نمایاں ہونے لگا اسکے نتیجے میں شعرا کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو جاہلی شاعری کی خصوصیات کو پھر اپنے اشعار میں جگہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اموی دور میں اسی رجحان کے مزید پنپنے اور پروان چڑھنے کی صورت میں اباحی غزل گوئی کا آغاز ہو گیا، غزل گوئی کی اس قسم میں عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں اخلاقی اصول اور شرعی حدود کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نقطۂ نظر کے اکثر شعراء کا تعلق مکہ اور مدینہ سے تھا۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد ان شہروں کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی اور تعیش کے اسباب جمع ہو گئے تھے اور عجمی افکار و اثرات کی کارفرمائی تھی۔ ان حالات میں وقت گزاری کے لیے لوگوں نے غزل گوئی شروع کر دی۔ اس دور میں مدینہ کے اندر غنا کو بھی ترقی ملی۔ گائے جانے والے زیادہ تر اشعار اباحیت پسند شعرا کے کلام سے لیے جاتے تھے۔ غزل گوئی کی اس قسم کا بانی عمر بن ابی ربیعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل گوئی کی اس قسم کو عمری غزل گوئی بھی کہتے ہیں۔ عمر کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ (باقی)

---

[1] کتاب الاغانی ج ۸ ص ۳۲۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۱۹ر دسمبر ۱۹۹۰ء

مکرمی و محترمی زاد فضلکم

السلام علیکم۔ نومبر کا معارف بڑے انتظار کے بعد ملا۔ آپ کی خیر و عافیت سے آگاہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پچھلے ماہ میں حکومت ترکیہ کی وزارت اوقاف (ترکیہ دیانت وقفی) کی جانب سے ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اسلام انسائیکلوپیڈیا سی) کی دو جلدیں موصول ہوئیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں دو۔ڈھائی درجن کے قریب ترک فضلاء شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اردو داں فضلا بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں جلدیں رومن رسم الخط میں ہیں، لیکن عنوانات عربی حروف میں بھی ہیں، جن سے مشمولات کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ چونکہ رومن رسم الخط میں عربی کے حرف عین کو A سے لکھا جاتا ہے۔ اس لیے ان جلدوں میں الف کے علاوہ حرف عین سے شروع ہونے والے اسما و اعلام اور مقامات پر بھی مقالات آ گئے ہیں۔ سب سے پہلے اسم اعظم یعنی اللہ پر مبسوط مقالہ ہے۔

ہندوستانی مشاہیر علماء میں حضرت سید احمد شہیدؒ، مولوی عبد الباری فرنگی محلی، مولوی عبد الحیٔ حسنی (والد ماجد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی) شاہ عبد العزیز دہلوی، علامہ

عبدالعزیز میمن، عالمگیریہ (فتاویٰ) اور شہر الہ آباد پر گرانقدر مقالات ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی، مولوی عبدالحیٰ (فرنگی محلی) اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی پر مضامین اگلی جلدوں میں آئیں گے۔

معاصر عرب علما میں قاضی احمد محمد شاکر، قاری عبدالباسط، شیخ عبدالقادر عودہ، عباس محمود العقاد اور علامہ فاسی پر اچھے مقالات ہیں اور ان کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ مساجد، مقابر اور محلات کی تصویریں نہایت دیدہ زیب ہیں۔ ترک خطاطوں کی خطاطی کے دلکش نمونوں کی نزاکت اور حسن بیان سے باہر ہے، بالخصوص قرآن پاک کے قلمی نسخوں کے بعض اوراق کا عکس دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے خوشی کی بات ہے کہ ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے کارپردازوں کے پیش نظر ہمارا اردو دائرہ معارف اسلامیہ بھی ہے اور اس کے حوالے جا بجا آئے ہیں۔

این میری شمل جرمنی کی مشہور مستشرقہ ہیں اور برس ہا برس ترکی میں مقیم رہی ہیں۔ انھوں نے آج سے کئی سال پیشتر اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جنگ عظیم دوم (۱۹۴۵ء) سے ترکی میں احیائے اسلام کی تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، جس کا فکری سرمایہ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات اور علامہ اقبال کے کلام کے ترکی تراجم ہیں۔ اقبال سے گرویدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا روم کو اپنا مرشد و رہبر مانا ہے اور وہ ان کے ہم قوم یعنی ترک ہیں۔ ان کے علاوہ سعید نورسی کے رسائل بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

موصوفہ مزید لکھتی ہیں کہ اب ترکی میں مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں، رمضان المبارک میں مسجدوں کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے، عید میلاد النبیؐ بڑی دھوم دھام سے

سنائی جاتی ہے، ترکی میں قرآن پاک کے حفظ کرنے کا شوق روز افزوں ہے اور اب بیس ہزار کے قریب حفاظ موجود ہیں۔ دیہات اور قصبات میں لاطینی حروف کو شیطانی حروف کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی) جو ترکیہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو پڑھاتے رہے ہیں، بتلاتے ہیں کہ ترکیہ کی آرکائیوز (محافظ خانوں) میں تحریک خلافت کے بارے میں جتنا وافر مواد موجود ہے، اتنا خود ہندوستان میں بھی نہ ہوگا، چنانچہ ایک ترک فاضل نے تحریک خلافت پر بڑی تحقیق سے کتاب لکھی ہے مولانا شبلیؒ کی تصانیف کا دوبارہ ترجمہ اردو سے براہ راست ترکی کے موجودہ رسم الخط میں ہو رہا ہے۔

قبرص کے مسئلے پر اقوام یورپ کی جانب سے یونانیوں کی تائید و حمایت اور ترکی سے مخاصمت نیز یورپی مشترکہ اقتصادی منڈی میں ترکیہ کی شمولیت کی مخالفت نے ترکوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ اسلام کی طرف تیزی سے راغب ہو رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ خط بلا قصد طویل ہوگیا ہے کیونکہ ایک بات سے دوسری بات نکلتی گئی ہے، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حافظ و ناصر ہو اور دارالمصنفین کو ہر آفت و بلا سے محفوظ رکھے۔ خط کی رسید سے ضرور اطلاع دیں۔

فقط والسلام

نیازمند

(شیخ) نذیر حسین۔

ادبیات

فریاد

(بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہو کر)

از

جناب محمد عبدالرحمٰن سعید صدیقی، شکاگو

گلوئے ابنِ آدم پر یہ تیغ خوں فشاں کب تک — اٹھے گی بزمِ گیتی سے صدائے الاماں کب تک
رہیگا عالمِ اسلام زیرِ امتحاں کب تک — الٰہی سینۂ بریاں سے اٹھے گا دھواں کب تک
الم انگیز قصہ بابری مسجد کا اقصیٰ کا — دیارِ پاک کی یہ داستانِ خونچکاں کب تک
فلسطین قبلۂ اول اور پھر کشمیر کو روؤں — بہیں گی خطۂ کابل میں خوں کی ندیاں کب تک
عرب کی سرزمیں اور عیسوی لشکر معاذ اللہ — رہیں گے زد میں اعدا کی حرم کے پاسباں کب تک
رواداری نہ صلح و آشتی نے ذکر الفت کا — جلے گا نفرتوں کی آگ میں ہندوستاں کب تک
الٰہی صحنِ عالم قتل گاہ ... عام ہے گویا — یہ طوفانِ الم کیسا یہ سیلابِ فغاں کب تک
وہ مومن جو کبھی تقدیرِ یزداں بن کے اٹھا تھا — رہے گا کشتۂ آلام و جورِ آسماں کب تک
اٹھ اے غافل محاذِ حق پہ اب باطل کی یورش ہے — یہ فکرِ خویش اور اہل و عیال و خانماں کب تک
ہراس و یاس و حسرت کفر ہے دین و شریعت میں — یقیں سے کام لے ناداں تو مغلوبِ گماں کب تک

اس عہدِ مظلمہ کی خیر سے یارب سحر کر دے
دلوں میں عزم اور فریاد میں میری اثر بھر دے

مطبوعات جدیدہ

تفسیر نظام القرآن

مولفہ علامہ حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی

تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۳۶ مجلد مع خوبصورت گرد پوش،
قیمت ۱۰۰ روپیہ، پتے: (۱) دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ، یوپی۔
(۲) ادارہ علوم القرآن، سر سید نگر، علی گڑھ،

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ مدۃ العمر قرآن مجید میں غور وفکر فرماتے رہے، انھوں نے اس کے علوم ومعارف کے مختلف پہلوؤں پر متعدد اہم اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں گو ان کی اکثر تصنیفات ناتمام ہیں تاہم یہ سب بلا استثنا قرآن مجید میں ان کے گہرے غور وفکر کا نتیجہ اور قرآنی اسرار وحکم کا گنجینہ ہیں، مولانا نے نظام القرآن کے نام سے قرآن مجید کی ایک مہتم بالشان تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی مگر ابھی وہ چند سورتوں ہی کی تفسیر مکمل کر سکے تھے کہ داعی اجل کا پیام آگیا، مولانا کو اردو، فارسی، انگریزی، عربی اور عبرانی زبانوں پر عبور تھا لیکن انھوں نے اپنی قرآنی تصانیف کے لیے دنیائے اسلام کی معروف اور اصل زبان عربی کو وسیلہ بنایا تھا، ان کی زندگی میں ان کی تفسیر کے جو اجزا مرتب ہوگئے تھے ان میں سورۂ اخلاص کے علاوہ سب عربی میں تھے اور علی گڈھ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے یہ شایع ہوئے تھے، ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا تو ان کے شاگرد اور علمی جانشین مولانا امین احسن اصلاحی نے عربی کے تفسیری اجزا کا

سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ کیا جو وقتاً فوقتاً متفرق طور پر وہیں سے شایع ہوتا رہا، کئی برس پہلے مولانا امین احسن صاحب نے اپنے استاذ کے اجزائے تفسیر کے اردو ترجمہ کا ایک مجموعہ اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پاکستان سے شایع کیا تھا جس کی اشاعت کی ضرورت ہندوستان میں بھی شدت سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ مولانا کے اصول تفسیر اور طریقہ تدبر قرآن کو جاننے اور سمجھنے کی راہ ہموار ہو۔ الحمدللہ کہ اب دائرہ حمیدیہ نے اس اہم اور ضروری کام کی طرف توجہ مبذول کرکے مولانا کے اجزائے تفسیر کا یہ اردو مجموعہ شایع کیاہے جس پر وہ مبارکباد کا مستحق ہے، اس مجموعہ میں حسب ذیل تفسیری اجزا شامل ہیں، مقدمہ تفسیر نظام القران، تفسیر آیۂ بسم اللہ، تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ ذاریات، تفسیر سورۂ تحریم، تفسیر سورۂ قیامہ، تفسیر سورۂ مرسلات، تفسیر سورۂ عبس، تفسیر سورۂ شمس، تفسیر سورۂ والتین، تفسیر سورۂ والعصر، تفسیر سورۂ فیل، تفسیر سورۂ کوثر، تفسیر سورۂ کافرون، تفسیر سورۂ لہب اور تفسیر سورۂ اخلاص، مولانا کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ وہ پہلے سورتوں کا عمود (بنیادی مضمون) اور ان کا ماقبل ومابعد کی سورتوں سے ربط وتعلق بیان کرتے ہیں پھر طویل سورتوں کے مختلف اجزائے لفظوں کی تحقیق، مشکل جملوں اور فقروں کی وضاحت وتحقیق نیز سورہ کے مختلف اجزا کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں سلسلۂ آیات میں جو اہم حقایق و مطالب اور دلائل وشواہد بیان کیے گئے ہیں ان پر پوری دقت نظر سے عالمانہ بحث کرتے ہیں، غرض کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس کی تفسیر میں حضرت مولانا نے اہم حقائق واسرار کی نشاندہی نہ کی ہو، جن مقامات سے مفسرین سرسری گزر گئے ہیں، مولانا کے ذہن رسا اور نکتہ سنج دماغ نے نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے انبار لگادیے ہیں، اس مجموعہ کی قدر

وقیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، معارف میں متعدد بار ان پر تبصرے لکھے جا چکے ہیں، یہ مجموعہ کی خاص چیز اس کا مقدمہ بھی ہے جس سے مصنف علامؒ کی تفسیر کے اہم اصول اور ان کے فہم وتدبر قرآن کے متعلق بہت سی اصولی اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اور آیۂ بسم اللہ اور تفسیر سورۂ فاتحہ اگرچہ نامکمل ہیں تاہم ان کے اور دوسرے اجزائے تفسیر کے مطالعہ سے قرآن مجید کے طلبہ کو بڑی رہنمائی ملے گی اور قرآنی حقائق واسرار کے نئے پہلو اور اس میں غور وفکر کی مختلف راہیں سامنے آئیں گی۔ شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے ایک عالمانہ تحریر میں ان اجزائے تفسیر کے بارے میں بہت سی ضروری اور مفید باتیں بیان کی گئی ہیں اور مولانا کی تفسیر کے اصول ونہج کو بھی واضح کیا گیا ہے، انھوں نے اجمالاً فاضل مصنف کے جو جامع ومرتب حالات وسوانح تحریر کیے ہیں ان سے ان کی عظمت وکمال کا مرقع سامنے آجاتا ہے، مولانا فراہیؒ کی تفسیر کا اصل اور پورا نام تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان ہے لیکن ناشر نے صرف نصف نام دینے پر اکتفا کیا ہے۔ ثانیاً مصنف کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنی کتابوں پر اپنا نام المعلم عبدالحمید الفراہی لکھتے تھے لیکن اس مجموعہ میں ان کا نام علامہ حمید الدین فراہی درج کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ معنوی خوبیوں سے قطع نظر ظاہری نفاست اور حسن طباعت کے لحاظ سے بھی دلکش ہے۔

✓ **التکمیل فی اصول التاویل** (عربی) تالیف العلامہ عبدالحمید الفراہیؒ تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ خوبصورت ٹائپ صفحات ۷۰، قیمت ۲۰ روپیے پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

یہ کتاب بھی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کی قرآنی بصیرت اور ان کے وسیع وعمیق مطالعہ قرآنی کا نچوڑ ہے جو دراصل مولانا کی تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے۔

کئی برس پہلے ہندوستان میں مولانا کے علوم و افکار کے وارث و ترجمان مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم دائرہ حمیدیہ نے اپنے پرمغز مقدمہ کے ساتھ اسے شایع کیا تھا، اب اسکا یہ دوسرا اڈیشن بھی اہتمام سے چھپا ہے، اس میں مصنف نے قرآن مجید کے تاویل کے وہ اصول وضوابط قلمبند کیے ہیں جو اس کے لفظوں کی اصل مراد اور صحیح مفہوم کی تعیین کرتے ہیں اور گوناگوں احتمالات اور غلط و باطل تاویلوں کو ختم کرکے قرآن کے اصل مفہوم اور متعین تاویل کی جانب رہبری کرتے ہیں، شروع میں مصنف نے اصول تاویل کو منضبط کرنے کی ضرورت واہمیت اور اس کے فوائد و مقاصد بتائے ہیں اور اس کی جانب سے علمائے فن کی بے توجہی کا ذکر کر کے اس کے نقصان بھی دکھائے ہیں، تاویل کی حقیقت و مفہوم بیان کرکے تفصیل و تحریف سے اس کا فرق واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید قطعی الدلالت ہے جو گوناگوں احتمالات کے بجائے ایک ہی مفہوم و مدلول پر دلالت کرتا ہے اور آخر میں جن اصول کی تشریح کی ہے وہ تین طرح کے ہیں (۱) اصلی (۲) مرجح (۳) اور ظنی، ان مباحث اور ان کے ضمن میں مولانا نے جو دقیق اور عالمانہ بحث کی ہے اس کی خوبیوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔

ظہور قدسی از مولانا عبدالجبار خاں رہبر اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: جامعہ امجدیہ، مقام و پوسٹ خالص پور ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم بڑے صاحب علم و کمال شخص اور اچھے نعت گو شاعر تھے، زیر نظر طویل نظم ان کے مشہور سلام ع مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام پر تضمین ہے، مخصوص عقائد و خیالات سے قطع نظر نظم سے تضمین نگار کی فن پر قدرت اور حسن بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۷ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

وفیات

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں فی شمارہ ۴ روپیے سالانہ چندہ ۴۰ روپیے

پاکستان میں سالانہ چندہ ایک سو روپیے۔

پاکستان میں چندہ بھیجنے کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی۔ پاکستان

بیرونی ملکوں میں ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر۔

" " " بحری ڈاک " " ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر۔

شذرات

عراق کی ضد اور کویت پر اس کے غاصبانہ قبضہ، عربوں کی نااہلی وناعاقبت اندیشی اور امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدانِ کارزار میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں مانند آب مسلماں کا لہو ارزاں ہو گیا ہے اور تثلیث کے فرزند کھلم کھلا میراث خلیلؑ میں دراندازی کر رہے ہیں، حالانکہ نبی آخر الزمان کا ارشاد ہے:

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید نے بھی ان سے عدم موالات کا حکم دیا ہے: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ۔ مگر آپؐ کے پیروں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا حلیف بنا لیا ہے اور اب ان کا لشکر جزیرۃ العرب میں دندناتا پھر رہا ہے، اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناگاساکی اور ہیروشیما بنتے جا رہے ہیں، یہ بحث فضول ہے کہ اس کا باعث عراق ہے یا دوسری عرب؟ حقیقت یہ ہے جس کی گواہی دونوں کا ضمیر ضرور دیتا ہوگا کہ دونوں خاک حجاز کو خشت بنیاد کلیسا بنانے میں برابر کے شریک ہیں۔

عربوں پر خدا کے احسانات گوناگوں ہیں، اس نے انھیں ایمان کی دولت دی: بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَاكُمْ لِلْإِيمَانِ۔ بنی اسرائیل کے بجائے ان کو اپنے فضل و شرف سے نوازا اور ان کو دنیا کی امامت و سیادت بخشی، ان کے اندر اپنا آخری رسول بھیجا جس نے ان کو کفر و ضلالت سے نکالنے کے لیے خدا کی آیتیں پڑھ کر انھیں سنائیں، ان کے ذہن و دماغ سے باطل افکار و نظریات محو کر کے انھیں پاکیزہ و مطہر بنایا، ان کے جاہلی عادات و اخلاق مٹانے کے لیے انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دی، وہ آپس میں لڑ بھڑ کر ہلاک و برباد ہو رہے تھے، مگر ہدایت ربانی نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کر کے انھیں بھائی بھائی بنا دیا، چنانچہ غزوۂ حنین کے غنائم کی تقسیم کے بعد انصار کو کچھ شکایت ہوئی تو آپؐ نے ان سے

خطاب کر کے فرمایا: "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعہ سے تم کو دولتمند کیا۔"

ہر ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسولؐ کا احسان سب سے بڑھ کر ہے"

خداوند قدوس نے عربوں کو ایک پُرامن اور بابرکت شہر میں بسایا، ان کے معبد کو مامون و محترم اور لوگوں کی عقیدت کا مرجع بنایا، جس کے ارد گرد چاروں طرف ایسی بدامنی پھیلی ہوئی تھی کہ لوگوں کو اپنے اچک لیے جانے کا اندیشہ رہتا تھا، لیکن خدا نے اس شہر اور اپنے گھر کو امن و آسایش کا گہوارہ بنا کر اس کی برکتوں کو دنیا کی زندگی میں مومن و کافر سب کے لیے عام کر دیا، روحانی برکتوں سے مالا مال کرنے کے علاوہ مادی آسایش اور رزق و معیشت کے تمام اسباب بھی مہیا فرمائے، خصوصاً اس صدی میں خدا نے ان کے لیے زمین کے جو خزانے کھول دیے ان سے آج پوری دنیا متمتع ہو رہی ہے، اور ہر ملک ان کا دست نگر بن گیا ہے، عربوں کی اس مادی خوش حالی اور فارغ البالی سے ساری دنیا دم بخود تھی لیکن یہودی و عیسائی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں میں لگے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے عیش و فراغت کے باوجود ان کی زندگی نہایت تلخ اور ناک میں دم ہے

عربوں کی دولت نے انگریزوں کو حواس باختہ کر دیا، وہ گھبرا اٹھے کہ اس کے ساتھ اگر ان میں وحدت بھی پیدا ہو گئی تو ان کی قوت کو روکنا مشکل ہو جائے گا، تفریق ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود ہے، ان کی ساحری نے عربوں کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بانٹ کر ایک دوسرے سے مستقل صف آرا کر رکھا ہے، مزید براں انھوں نے اسرائیل کو بھی ان کے سر پر مسلط کر دیا ہے، عراق کی ابھرتی ہوئی قوت کو کمزور کرنے، عربوں میں آزادی و بیداری کی لہر کو روکنے اور سعودی عرب، کویت اور دوسرے مسلم ملکوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کا جو منصوبہ

بنایا گیا ہے، یہ جنگ اسی کی کڑی ہے، کاش عیش و تنعم کے خوگر اور دولت و ثروت کے متوالے عرب اب ہوش میں آجائیں اور اپنے ازلی دشمنوں کو پہچان لیں، ان کے ہر مسئلے کا حل اسی میں ہے کہ وہ اس تعلیم و ہدایت سے اپنے کو وابستہ کرلیں جو نبی عربی (علیہ الف الف تحیۃ) کے ذریعہ انھیں ملی تھی۔

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل
اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے

آزادی کے بعد ہی سے ہندوستان نفرت، تشدد اور فرقہ واریت کی آگ میں جل رہا ہے، اس کو بجھانے کی اب تک جو کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ الٹا نکلا

ع۔ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

اس کے پیش نظر ۲۰ ر ۲۱ ر جنوری کو ملی جمعیۃ علمائے ہند کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی میں ایک نیشنل کنونشن ہوا جس کی صدارت ملک کے مشہور سیکولر اور معمر رہنما بشمبر ناتھ پانڈے نے کی اور پارلیمنٹ کے بہت سے ممبروں، مسلم جماعتوں کے نمایندوں اور مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے سرکردہ حضرات نے شرکت کی، کنونشن نے بڑھتی ہوئی فرقہ واریت پر گہری تشویش ظاہر کی اور مفید تجویزوں کو منظور کرنے کے علاوہ ملی جمعیۃ کے جنرل سکریٹری اور سابق ممبر پارلیمنٹ مولانا سید احمد ہاشمی کو سیکولر افراد پر مشتمل ایک سب کمیٹی کی تشکیل کا اختیار دیا جو آزادی کے بعد کی فرقہ وارانہ صورت حال کا جائزہ لے کر مستقبل میں اس کو ختم کرنے کی تدبیریں کرے گی، الحمد للہ کمیٹی نے کام شروع کر دیا ہے، مولانا سید احمد ہاشمی کو ملی و قومی کاموں کا تجربہ ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اس اہم اور ضروری کام کو انجام دینے کی توت و ہمت دے، انھوں نے مجھے اس کا دعوت نامہ بھیج کر اپنے اخلاص و تعلق کا ثبوت دیا، مگر میں شرکت کا موقع نہیں نکال سکا جس کا افسوس ہے۔

معارف نے علم و فن کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے لیکن وہ برابر خسارہ سے شائع ہو رہا ہے دوسرے رسالوں کے مقابلہ میں اس کا زر تعاون بہت کم ہے، اگر معارف کا ہر خریدار کم از کم ایک مزید خریدار مہیا کر دے تو بھی غنیمت ہے۔

مقالات

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اسلام آباد، پاکستان

"ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ" قرآنیات کے متبحر عالم اور علامہ شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی اور ان کے قابل فخر شاگرد تھے، ان کے فخر و امتیاز کے لیے یہی کافی ہے کہ علامہ شبلیؒ ان کی کتابوں کی تلخیص خود کر کے الندوہ میں شائع کرتے تھے اور معارف میں بھی ان کی کتابوں کی تلخیص چھپتی تھی، دار المصنفین کی بنا و تاسیس میں مولانا فراہیؒ کا نمایاں حصہ تھا، اور وہ مدۃ العمر اس کی مجلس عاملہ کے صدر رہے، مگر نہایت افسوس ہے کہ ابھی تک ان کی کوئی مکمل سوانح عمری شائع نہیں ہوئی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کو نومبر ۱۹۷۰ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کی جانب سے مولانا فراہیؒ پر ایک ریسرچ پروجیکٹ تفویض کیا گیا تھا جس کی تکمیل میں وہ کئی برس سے منہمک تھے، مگر ابھی وہ اس پروجیکٹ کا سوانحی حصہ ہی مکمل کر سکے تھے اور مولانا کے علوم و افکار پر مواد تو اکٹھا کر چکے تھے مگر اس کی ترتیب و تسوید نہیں کر سکے تھے کہ ادارے سے ان کا تعلق منقطع ہو گیا اور یہ پروجیکٹ تعطل کا شکار ہو گیا۔

پروجیکٹ کا سوانحی حصہ فل اسکیپ سائز کے تقریباً ہزار صفحات پر مشتمل ہے، یہ مقالہ اسی کی تلخیص ہے، اختصار کی وجہ سے اس میں جو کمی نظر آئے اس کے لیے ناظرین کو اصل مقالہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہیے، اگر سوانحی حصہ علمی خدمات و کارناموں کے ساتھ چھپ جائے تو مولانا کی سوانح عمری مکمل ہو جائے گی جس کا عرصہ سے انتظار ہے، قارئین کی تفہیم کی غرض سے راقم نے جا بجا توضیحی حواشی لکھ دیے ہیں۔" (معارف)

نام | والدین کا رکھا ہوا اصل نام عبدالحمید ہے، اور یہی نام وہ آخر تک اپنی اہم تصانیف کے سرورق پر لکھتے رہے، نام کے ساتھ المعلم کا لفظ وہ از راہ تواضع و انکسار، یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث **بُعِثْتُ مُعَلِّمًا** کے بموجب، یا ارشاد نبوی **خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ** کے بمصداق اتباع سنت میں اپنایا تھا، چنانچہ ان کی سنجیدہ اور علمی و دینی تصانیف پر عبدالحمید کے ساتھ المعلم کا لفظ بھی ملتا ہے، الامام اور الاستاذ کے الفاظ ان کے تلامذہ اور عقیدت مندوں نے اظہار عقیدت کے لیے شامل کیے، حمیدالدین کو ہم ان کا عرفی نام کہہ سکتے ہیں، بعد میں وہ اسی نام سے مشہور ہوئے، یہ نام انھوں نے علامہ شبلیؒ کے ایما پر اختیار کیا جو ان کی افتاد طبع سے ہم آہنگ نہیں، سرکاری کاغذات وغیرہ اور خطوط میں ان کا یہی نام ملتا ہے، یہ کہنا کہ ان کے دو نام تھے، درست نہیں، لقب یا خطاب قسم کی کوئی چیز ان کے ناموں میں نہیں ملتی، البتہ نسبت "فراہی" ان کے نام کا لازمی جز ہی نہیں بلکہ بمنزلہ نام کے ہے اور متفق علیہ ہے۔

لفظ فراہی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ ان کے گاؤں پھریہا کی طرف نسبت ہے، لیکن لفظ پھریہا کے ساتھ اس کے اشتقاق کا رشتہ جوڑنا کسی قاعدے سے سمجھ میں نہیں آتا، میری تحقیق یہ ہے کہ یہ نسبت فراہ کی طرف ہے جو افغانستان کا ایک مقام یا صوبہ ہے، جہاں سے ترک سکونت کرکے مولانا کا خاندان ہندوستان آیا، اگرچہ اس امر کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ملی، تاریخ میں

مولانا پہلے شخص نہیں ہیں جنھوں نے یہ نسبت اختیار کی، اور نہ یہ لفظ پھریہا کی تعریب ہے، جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے خیال ظاہر کیا ہے (ملاحظہ ہو یادِ رفتگان) اس کے ایک سے زیادہ شواہد موجود ہیں، اور قدیم تاریخ میں ایک سے زیادہ اشخاص کے نام اس نسبت کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن یہاں صرف ایک حوالہ کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے جو شعر کی صورت میں ہے، اور شعر میں کسی لفظ کا تلفظ حتمی طور پر متعین ہوتا ہے ؎

همی گوید ابو نصر فراهی — به توفیق خداوند الٰهی

قدیم مطبوعہ کتاب نصاب الصبیان کا یہ پہلا شعر ہے۔ مولانا شاعر تھے، انھوں نے حمید کے ساتھ فراہی کو بھی بطور تخلص نظم کیا ہے (ملاحظہ ہو مطبوعہ فارسی دیوان)

خاندانی حسب و نسب خاندانی وجاہت مولانا کو ورثے میں ملی تھی، ان کا خاندان دیار کے شرفا میں شمار ہوتا تھا، جدی رئیس تھے، اجداد کا تعلق سرکار، دربار سے بھی رہا، کئی پشت سے پیشۂ آبا زمینداری تھا، مولانا کے والد بڑے زمیندار تھے، دوسرے لوازم کے ساتھ سواری کے لیے گھر میں ہاتھی پلا ہوا تھا، مولانا کی ایک سگی پھوپھی علامہ شبلیؒ کی والدہ تھیں، مولانا کے والد اور چچا اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وکیل تھے، ان کا اپنا ایک کتب خانہ تھا، جس سے علامہ شبلیؒ بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کرتے تھے، نسباً مولانا انصاری تھے، شجرۂ نسب چند پشتوں سے آگے نہیں ملتا، لیکن انصار مدینہ کے ساتھ انصاری کی نسبت میں کوئی کلام نہیں، خاندان میں محفوظ شجرۂ نسب کے مطابق سلسلۂ نسب یوں ہے: حمید الدینؒ، عبد الکریم، قربان قنبر، تاج علی، قائم علی، دائم علی، شیخ بہار الدین۔

خاندان کی نقل مکانی کے متعلق جو روایت ملتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ خاندان پانی پت سے جون پور، جون پور سے ڈوؔنہ[1] اور وہاں سے پھریہا آکر آباد ہوا، پانی پت میں آمد سے قبل

---

[1] دونہ ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں کا نام ہے، سرکاری کاغذات میں اس کا نام جہت مند پور ہے۔

کی کڑیاں مفقود ہیں، انصاری اور فراہی کی نسبتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ یہ خاندان کسی زمانے میں مدینہ سے افغانستان آیا اور فراہ میں اقامت گزین ہوا۔

ددھیال کی طرح مولانا کی ننھیال بھی پھریہا میں تھی، اعظم گڑھ ہی کے ایک گاؤں بندول کو مولانا کی ننھیال ہونے کا شرف حاصل ہے، مولانا فراہی کی والدہ کا نام مقیمہ بی بی تھا، وہ کثیر الاولاد تھے، اور مولانا کے اپنے خاندان کی طرح ان کی والدہ کا خاندان بھی تعلیم یافتہ تھا۔

تاریخ پیدائش وجائے پیدائش مولانا فراہیؒ اپنے گاؤں پھریہا میں پیدا ہوئے جو بی۔این۔ڈبلیو آر، چھوٹی لائن کا ایک ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور جس کا فاصلہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ۸ میل اور اعظم گڑھ شہر سے بارہ ۱۲ میل ہے، ایک خاندانی دستاویز کے مطابق وہ ٦ر جمادی الثانی سنہ ١٢٨٠ھ کو بروز چہارشنبہ بوقت ۸ بجے صبح پیدا ہوئے، ٦ر جمادی الثانی سنہ ١٢٨٠ھ مطابق ہے ١٨ر نومبر ١٨٦٣ء کے، مولانا کے بعد حاجی مولوی رشید الدین صاحب[1] پیدا ہوئے جو مولانا سے چھ برس چھوٹے تھے، مولانا کے کوئی بہن نہیں تھیں، بہن کے نام ایک مرثیہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوا کہ مولانا کے کوئی بہن بھی تھیں، مولانا نے جس بہن کا مرثیہ لکھا ہے وہ ان کی پھوپھی زاد بہن تھیں، جن کو مولانا بہن سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

مولانا پیدا ہوئے تو ان کے والد اور والدہ دونوں زندہ تھے، وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے، ان کے والد رئیس اور بڑے زمیندار تھے، اس لیے مولانا کا بچپن خوشحالی اور فارغ البالی میں گذرا، وہ طبعاً نیک اور شریف تھے، عام بچوں کی طرح کبھی کھیل کود میں حصہ نہیں لیا، بدی اور شرارت سے ہمیشہ دور ہی رہے، بچپن میں مولانا کو قصص الانبیاء

---

[1] یہ مولانا کی وفات کے بعد مدرسۃ الاصلاح کے ناظم ہوئے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ و عاملہ کے بھی رکن تھے، اکتوبر ١٩٥٩ء میں انتقال ہوا۔

جیسی کتابوں سے دلچسپی تھی، وہ اپنی پھوپھی کو یہ کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے، اس کتاب کا اثر ان کی آئندہ زندگی پر پڑا۔

تعلیم | مولانا کی ابتدائی تعلیم دیار کے رئیس شرفاء کی طرح گھر پر ہوئی، اس کا آغاز دستور کے مطابق ناظرہ اور حفظ قرآن سے ہوا، راجہ پور سکرور[1] کے حافظ احمد علی مرحوم نے گھر پر رہ کر حفظ کرایا، دس برس کی عمر میں یعنی ۱۸۷۳ء میں یہ مرحلہ طے کر لیا، ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں: "وحفظت القرآن المجید وانا ابن عشرة سنین او بقرب منها"۔ اس کے بعد فارسی مولانا محمد مہدی چتاروی[2] سے پڑھی، فارسی کی تحصیل نو ماہ میں مکمل کر لی، مولانا کا اپنا بیان ہے:

"وتعلمت اللغة الفارسیة فی مدة تسعة اشهر"

(الضیاء) یہ ۱۸۷۴ء کا واقعہ ہے، علامہ شبلیؒ اور ان کے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کی صحبتوں سے فارسی کے ذوق کو جلا ملی، اور اس میں پختگی آئی، ۱۸۷۵ء، ۱۸۷۶ء کے دو سال بیماری میں گذرے۔

عربی زبان و ادب کی تحصیل کا آغاز ۱۸۷۷ء میں ہوا، مولانا پھریہا سے اعظم گڈھ شہر آگئے، اور علامہ شبلیؒ سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں، مولانا لکھتے ہیں، "میں نے ۱۴ برس کی عمر میں عربی زبان پڑھنا شروع کیا اور درس نظامی کی اکثر کتابیں اپنے پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ سے پڑھیں"۔ (الضیاء) ۱۶ برس کی عمر میں (۱۸۷۹ء) فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں وہ قصیدہ لکھا جس کو دیکھ کر فارسی کے بڑے بڑے

---

[1] یہ اعظم گڈھ کا مشہور گاؤں اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے قریب ہی شمال میں واقع ہے۔
[2] چتارہ بھی اعظم گڈھ کا ایک ممتاز گاؤں ہے، جس کی طرف یہ نسبت ہے۔

اساتذہ دھوکا کھا گئے، یہ قصیدہ مولانا کے مطبوعہ فارسی دیوان میں شامل ہے، دیوان میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ قصیدہ ۱۲۹۶ھ میں لکھا گیا، قصیدہ کا مطلع ہے:

بے جلوہ رخ تو بود مضطر آئینہ خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

عربی اور اسلامی علوم کی تحصیل میں مولانا کب تک اعظم گڈھ میں مقیم رہے اس سلسلے میں کوئی روایت یا شہادت دستیاب نہیں، اعظم گڈھ سے علی گڑھ کے لیے علامہ شبلیؒ کی روانگی سے آنا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دور ۱۸۸۳ء سے بہت پہلے تمام ہوچکا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے لکھنے کے مطابق ۱۸۸۳ء میں مولانا فراہیؒ نے عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم مکمل کر لی جبکہ ان کی عمر بیس[2] برس تھی (یادِ رفتگان) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اعظم گڈھ میں علامہ شبلی سے کسب فیض کرنے کے بعد علم کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں مولانا گھر سے باہر نکلے، کچھ وقت فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے استفادہ کیا جس کا ذکر مولانا نے خود بھی کیا ہے۔ (الضیاء)

رسمی تعلیم کے دور اول کا آخری مرحلہ مولانا فراہی نے لاہور جاکر طے کیا، مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نجی طور پر عربی ادب کی تکمیل کی، یہ ۱۳۰۰ھ ۱۸۸۳ء کے قریب کی بات ہے، زندگی کے اس دور میں تعلیم کی مشغولیت کے ساتھ مشق سخن کا سراغ ان کے مطبوعہ دیوان فارسی سے ملتا ہے، جس کی ابتدا ۱۶ برس کی عمر میں ہوچکی تھی۔

شادی ۷ رجب ۱۲۹۰ھ مطابق ۴ جون ۱۸۸۲ء کو ۱۹ برس کی عمر میں مولانا کی شادی ہوئی، اس کا علم مولانا کے فارسی کے استاد مولوی محمد مہدی چھاروی کے لکھے ہوئے سہرے سے ہوتا ہے، یہ شادی بندول[1] میں علامہ شبلی کی سگی بہن مریم بی بی کی بیٹی سائرہ بی بی

---

[1] علامہ شبلیؒ کا مولد و وطن۔

سے ہوئی۔

تعلیم کا دوسرا دور | فارسی عربی اور دینی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مولانا نے جدید تعلیم کی طرف توجہ کی اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لی، تعلیم کا یہ دوسرا دور ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۵ء تک ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

مولانا نے ۸۳-۱۸۸۲ء تک عربی تعلیم مکمل کرلی تھی، اس کے بعد مولانا کے اپنے خود نوشت حالات میں ہے کہ وہ بیماریوں کا شکار رہے، اس کے بعد انگریزی زبان اور مروجہ مضامین کی پڑھائی شروع کی (الضیاء) مولانا سید سلیمان ندوی اور شیخ سجاد صاحب مرحوم کے بیان کے مطابق مولانا پہلے مڈل اور پھر کرنل گنج اسکول الٰہ آباد سے نجی طور پر انٹر پاس کرکے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے، ۹ ر مئی ۱۸۹۱ء کو مولانا نے علی گڑھ کالج کے سال اول میں داخلہ لیا، اس وقت سر سید مرحوم زندہ تھے، اور علامہ شبلیؒ بحیثیت استاد کالج سے منسلک تھے، مولانا فراہیؒ کو عربی فارسی کے مضامین سے مستثنیٰ رکھا گیا، علی گڑھ کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو میرٹ اسکالرشپ ملتا تھا، داخلے کے دو سال بعد ۱۸۹۳ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے سکنڈ ڈویژن میں انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا، اس سال فرسٹ ڈویژن میں کوئی طالب علم پاس نہیں ہوا، مولوی عبدالحقؒ[2] اور مولانا شوکت علی نے بھی اسی سال یہ امتحان پاس کیا، دو سال بعد ۱۸۹۵ء میں مولانا نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا، الٰہ آباد یونیورسٹی کیلنڈر کے مطابق مولانا نے یہ امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا (کیلنڈر ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷)

بحیثیت طالب علم علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں مولانا فراہیؒ نے بعض علمی کام کیے

---

[1] مولانا فراہی کے صاحبزادے۔ [2] بابائے اردو۔

جسے ان کی آیندہ علمی زندگی کا پیش خیمہ کہا جا سکتا ہے، مولانا نے سرسید مرحوم کی فرمایش پر امام غزالی کی ایک کرم خوردہ کتاب کے قلمی نسخے کی ایڈیٹنگ کی، جبکہ کتاب کا کوئی دوسرا نسخہ ان کے سامنے نہیں تھا، اور یہ ایڈیٹنگ محض انھوں نے اپنے علمی ذوق اور عربی دانی کی مدد سے کی اور بالکل صحیح کی، جسے دیکھ کر سرسید کو حیرت ہوئی، اسی زمانے میں انھوں نے سیرت نبویؐ پر علامہ شبلی کے عربی رسالہ "تاریخ بدأ الاسلام" کا فارسی ترجمہ کیا، اور طبقات ابن سعد کے ایک جز کو بھی عربی سے فارسی میں منتقل کیا، یہ دونوں کتابیں چھپ کر کالج کے نصاب میں داخل ہوئیں، ایسی مثال کم ہوگی کہ مولانا جس کالج کے طالبعلم تھے اسی میں ان کی دو کتابیں داخل نصاب تھیں، یہ کتابیں راقم کی نظر سے گذری ہیں اور ان پر میرا ایک مفصل مضمون فکر و نظر اسلام آباد بابت جون ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے، سرسید مرحوم کی تفسیر کے عربی یا انگریزی ترجمے کا قصہ بھی اسی دور سے تعلق رکھتا ہے، انھوں نے پہلے علامہ شبلیؒ سے پھر مولانا فراہیؒ سے اس کی فرمایش کی، لیکن دونوں نے معذرت کر دی، واقعے کی حد تک اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا، البتہ انداز گفتگو میں اختلاف کی گنجایش ہے۔

زمانۂ طالب علمی میں مولانا فراہی کالج کی انجمن لجنۃ الادب اور اخوان الصفا کے رکن رہے، جنوری ۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو مولانا فراہیؒ نے ان انجمنوں کی طرف سے منعقد کیے گئے جلسے میں عربی کا قصیدۂ تہنیت پڑھا، جو کئی بار شائع ہو چکا ہے، یہ قصیدہ عربی میں مولانا کی پہلی تحریر کہی جا سکتی ہے، اسی موقع پر مولانا نے ایک اردو قصیدہ بھی لکھا جو کہیں شائع نہیں ہوا، میں نے اسے کتاب میں درج کر دیا ہے، اس وقت مولانا کی عمر تیس ۳۰ سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی، مولانا فراہیؒ کی زندگی

میں تدبر فی القرآن کا آغاز بھی اسی وقت ہوا جب وہ علی گڈھ میں کالج کے طالب علم تھے (دیباچہ تفاسیر فراہی)، اور فکر قرآن میں ان کا جو خاص منہج ہے اس کی ابتدا یہیں ہوئی۔ نفیاً یا اثباتاً اس کے محرکات کا سراغ بھی علی گڈھ میں لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسکے نتائج عملی شکل میں بہت بعد میں ظاہر ہوئے۔

بی اے کے بعد مولانا ایم اے عربی کا ارادہ رکھتے تھے مگر یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے ناپسندیدگی کے باوجود ایل ایل بی کی تیاری بھی شروع کی جس کا ذکر انھوں نے خود کیا ہے (الضیاء) لیکن اس میں دو سال صرف کرنے کے باوجود انھوں نے ایل ایل بی کا امتحان نہیں دیا۔ اس طرح نئی مغربی تعلیم کا یہ دور ۱۸۹۷ء میں ختم ہوتا ہے۔

آغاز و سلسلۂ ملازمت | مولانا گھر کے کھاتے پیتے تھے۔ ان کے والد دیار کے رئیس اور بڑے زمیندار تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ زر زمین کے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے ان جیسے عالم فاضل کی افتادِ طبع بھی اس سے میل نہ کھاتی تھی اس لیے انھوں نے معاش کے لیے ملازمت کا رخ کیا۔ لیکن ملازمت کی اپنی مکروہات ہیں۔ جن کا اندازہ پہلے بھی رہا ہوگا۔ تجربہ بعد میں ہوا معاملہ "اہون البلیتین" کا تھا۔

کراچی ۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۶ء | پہلی ملازمت سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی میں کی جو اب ایس ایم کالج ہے۔ "سندھ مدرسہ" علی گڈھ کالج کا مصغر تھا۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۶ء تک مولانا یہاں رہے۔ یہاں مولانا چھٹی ساتویں جماعتوں کو عربی فارسی پڑھاتے تھے۔ انکی تنخواہ ستر روپیے ماہوار تھی۔ سندھ مدرسہ بورڈ کی ایک سالانہ رپورٹ کے مطابق یکم جون ۱۸۹۷ء کو مولانا نے عربی ٹیچر کی حیثیت سے یہاں کی ملازمت شروع کی۔

۱۸۹۹ء کے لگ بھگ کراچی میں مولانا کے یہاں تیسرے اور آخری بیٹے کی پیدائش

ہوئی جن کا نام عباد رکھا گیا۔ دو بیٹوں حماد اور سجاد کی پیدائش کراچی آنے سے پہلے ہو چکی تھی۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کراچی میں ان کے بڑے بیٹے حماد کا انتقال ہوا اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ علامہ شبلیؒ کی شہادت کے مطابق یہاں قیام کے زمانہ میں پہلی مرتبہ فارسی کا کچھ کلام شایع ہوا۔ (مکاتیب شبلی) یہ واقعہ ۱۹۰۰ء کا ہے۔ کراچی کی آب و ہوا اور یہاں کے ماحول سے مولانا کو شکایت بھی جو خطری تھی۔ اس کا اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے جو ابھی شایع نہیں ہوئے۔ ملازمت کے ساتھ مولانا نے علمی مشاغل کو جاری رکھا جس میں شعر و شاعری اور تفسیر نگاری دونوں شامل ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں انھوں نے عربی میں کوئی مضمون لکھا جس پر مولانا شبلیؒ نے اظہار نکیر کیا۔ (مکاتیب شبلی)

۱۹۰۳ء میں دیوان حمید شایع ہوا جس میں فارسی کلام کے علاوہ کچھ عربی کلام بھی شامل ہے۔ اس دیوان کے ساتھ عنفوان شباب کی ایک تصویر بھی شایع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے۔ ۱۹۰۳ء میں پہلی بار مولانا کی تفسیر نظام القرآن کا ذکر علامہ شبلیؒ کے ایک خط میں آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے تفسیر لکھنے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا تھا۔ قیام کراچی کے دس سالہ دور میں مصر اور بیروت سے کتابوں کی خریداری کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ ۱۹۰۳ء کے ایک بل کی رقم ۱۵۵ روپیے ہے۔ خیال رہے کہ کراچی میں مولانا کی تنخواہ ستر روپیے تھی۔ اس بل میں جن کتابوں کے نام درج ہیں ان سے مولانا کے علمی ذوق اور معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا نے لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے ترجمان کی حیثیت سے خلیج کے ممالک کا دورہ کیا اور اسی سال کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جائداد کے ایک مقدمہ میں ثالث بن کر اپنے والد کے خلاف فیصلہ دے دیا جس کے نتیجے میں جائداد کا ایک بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا جو بالآخر مولانا ہی کو ملتا۔ تفسیر

سورۂ ابی لہب اور جمہرۃ البلاغۃ مکمل کی اور مسودہ علامہ شبلیؒ کو بھیجا۔ انھوں نے الندوہ میں نظام القرآن اور جمہرۃ پر تقریظ و تبصرہ لکھ کر شایع کیا (الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء) ۱۹۰۶ء میں مولانا نے تفسیر سورہ والشمس لکھی (مکاتیب شبلی) ۱۹۰۶ء ہی میں تفسیر سورۂ قیامہ مکمل ہوئی۔ اسی زمانے میں اقسام القرآن کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس کا خلاصہ علامہ شبلیؒ نے اپریل ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شایع کیا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۹۰۷ء کی آخری تاریخوں میں مولانا نے کراچی کو خیرباد کہا۔

علی گڈھ ۱۹۰۷ء تا ۱۹۰۸ء

یکم فروری ۱۹۰۷ء کو مولانا نے ایم اے او کالج علی گڈھ کے شعبۂ عربی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور یہ سلسلہ مئی ۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ علی گڈھ میں مولانا کی تنخواہ دو سو[۲۰] روپیے ماہوار تھی۔ مولانا طلبہ کے علاوہ صدر شعبہ یوسف ہارووِیز کو بھی عربی پڑھاتے تھے۔ یوسف ہارووِیز یہودی تھے۔ مولانا نے ان سے عبرانی پڑھی اور مختصر مدت میں اتنی صلاحیت بہم پہنچائی کہ عبرانی کتابوں سے براہِ راست استفادہ کرنے لگے۔ مولانا کے علمی مشاغل بدستور علی گڈھ میں بھی جاری رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے قیام علی گڈھ کے دوران اقسام القرآن لکھنے کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس رسالے کا خلاصہ علامہ شبلیؒ نے اپریل ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں شایع کیا (یاد رفتگاں) لیکن پہلے گزر چکا ہے کہ وہ جنوری ۱۹۰۷ء تک کراچی میں رہے اس لیے اقسام القرآن کی تالیف کراچی میں ہوئی نہ کہ علی گڈھ میں۔ واضح رہے کہ قرآن کی قسموں پر مولانا کے دو رسالے ہیں ایک کا نام اقسام القرآن ہے جو بہت مختصر ہے اور دوسرے کا نام امعان فی اقسام القرآن ہے۔ جو قدرے مبسوط ہے اور بعد کی تصنیف ہے۔ سجاد صاحب کے بیان کے مطابق قیام علی گڈھ ہی کے زمانے میں مولانا نے عربی نحو

وصرف پر دو رسالے لکھے ابتداً اس کا مقصد اپنے بچوں کو عربی پڑھانا تھا لیکن بعد میں وہ مرتب ہو کر کتابی صورت میں شایع ہوئے۔ اسی لیے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان رسالوں کا تعلق قیام حیدرآباد سے بتایا ہے۔ قیام علی گڈھ ہی کے زمانے میں مولانا نے علامہ شبلیؒ کی دعوت پر ندوہ جاکر ایک ماہ قیام کیا اور علوم جدیدہ کی ایک کتاب دروس الاولیہ کا درس دیا (الندوہ نومبر ۱۹۰۷ء) اسی زمانے میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن ہوئے۔ ۳۱ مئی ۱۹۰۸ء کو مولانا نے علی گڈھ کو خیرباد کہا، چھ ماہ کی چھٹی لے کر وہ میور کالج الہ آباد چلے آئے اور پھر واپس علی گڈھ نہیں گئے۔ چھ ماہ کی چھٹی ختم ہونے کے بعد استعفاء بھیج دیا ہوگا۔

الہ آباد ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۴ء سنٹرل میور کالج الہ آباد کے شعبہ عربی میں ایک پروفیسر کے ریٹائرمنٹ پر جو جگہ خالی ہوئی اسے مولانا فراہی نے پہلے تو عارضی طور پر اور بعد میں مستقل طور پر پُر کیا۔ یکم جون ۱۹۰۸ء کو مولانا نے میور کالج میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں مولانا کی تنخواہ الہ آباد میں وہی دو سو روپیے رہی جو علی گڈھ میں تھی۔ یہاں مولانا ۱۹۱۴ء تک تقریباً ۶ سال رہے منصبی فرائض کی ادائیگی سے جو وقت بچتا تھا اس کو حسب معمول لکھنے پڑھنے میں صرف کرتے تھے۔ خاص کر تفسیر نظام القرآن اور قرآن سے متعلق دوسری کتابوں کے لکھنے کا کام جاری رہا۔ سید صاحب کے بیان کے مطابق یہیں سے انھوں نے تفسیر سورۂ تحریم شایع کی اور یہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم میں ترجمہ کیا جو بعد میں خردنامہ کے نام سے شایع ہوا۔ قیام الہ آباد کے زمانے ہی میں مصر کے ایک عالم علامہ رشید رضا، کو مولانا کی چند مطبوعہ کتابیں بھیجی گئیں۔ مارچ ۱۹۰۹ء کے المنار میں رشید رضا صاحب نے ایک تقریظ لکھی جس میں مصنف کو

بہت داد دی۔ قیام الٰہ آباد کے زمانے میں مولانا کے والد حاجی عبدالکریم صاحب کا انتقال ہوا۔ سجاد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۱۰ء۔ ۱۹۱۱ء میں ان کا انتقال پھریہا میں ہوا۔ انتقال سے پہلے مولانا چھٹی لے کر گھر آگئے تھے۔ قیام الٰہ آباد کے زمانے میں مولانا "مشرقی علوم کی عربی کمیٹی" کے رکن مقرر ہوئے۔ بسلسلۂ ملازمت الٰہ آباد میں قیام کی کل مدت تقریباً ۶ سال ہے۔

۱۹۱۳ء کا ذکر ہے مولانا کے ہاتھ کسی انگریز نے اسلام قبول کیا (مکاتیب شبلی) ۱۹۱۳ء میں مدینہ میں بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز ہوئی تو پڑھانے کے لیے جن علماء کا نام تجویز ہوا ان میں علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کے نام بھی تھے۔ اسی سال کا واقعہ ہے۔ ریاست بھوپال میں انگریزی ترجمۂ قرآن پر حاشیہ لکھنے کی تجویز زیرِ غور آئی تو اس مشکل کام کے لیے مولانا کا نام تجویز ہوا۔ قیام الٰہ آباد کے دوران ہی حیدرآباد جانے کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع ہو چکی تھی جس کا مفصل حال علامہ شبلیؒ کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی منٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں مولانا اس سال کے لیے عربی فارسی ایم اے پریوس کے ممتحن تھے۔ ۱۹۱۴ء کے منٹس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی فارسی اردو اور ہندی کے بورڈ آف ایگزامنرس کے رکن رہے۔ یوپی گورنمنٹ کے شعبۂ تقرر کی طرف سے ۶ر جون ۱۹۱۴ء کو جو چھٹی جاری ہوئی اس کے مطابق مولانا کی خدمات دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی کے لیے حیدرآباد کے حوالہ کی گئیں۔ ۱۹۱۴ء کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے بڑے بیٹے سجاد صاحب کی شادی کی۔

حیدرآباد دکن۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء مولانا فراہی نے دارالعلوم حیدرآباد دکن کے پرنسپل کی حیثیت سے ۱۵۔ امرداد ۱۳۲۳ ف مطابق ۳۰ جون ۱۹۱۴ء سے اپنی ملازمت کا

آغاز کیا۔ مولانا ریاست کے مستعار الخدمت ملازم تھے۔ یوپی گورنمنٹ میں ان کی ملازمت برقرار تھی۔ الہ آباد میں یا اس سے پہلے کی ملازمتوں میں تنخواہ فکس (جامد) تھی یہاں ان کو سالانہ اضافہ کے ساتھ باقاعدہ اسکیل دیا گیا جو ۵۰۰ سے شروع ہوکر ۵۰ روپیے سالانہ اضافے کے بعد ۱۰۰۰ روپیے پر ختم ہوتا ہے۔ کالج میں مولانا انتظامی امور کی نگرانی کے علاوہ اونچی جماعتوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ حیدرآباد میں ریاستی سیاست کے علاوہ کالج کی اپنی اندرونی سیاست بھی تھی جس میں مولانا کے حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کے ناخوشگوار اثرات سے خود کو بچانا ناممکن تھا۔ مولانا کو حیدرآباد پہنچے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ان کے استاذ مربی اور پھوپھی زاد بھائی علامہ شبلیؒ نے وفات پائی۔ وفات سے دو دن پہلے مولانا اعظم گڈھ پہنچ گئے تھے۔ ان کے علمی کاموں کو جاری رکھنے کے لیے جماعت نعمانیہ یا اخوان الصفا کے نام سے ایک حلقہ قائم کیا۔ اور جب اس مجلس نے دار المصنفین کے قیام کی تجویز کو عملی شکل دی تو مولانا اس کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔

حیدرآباد میں مولانا کا تقرر ابتداً چھ ماہ کے پروبیشن پر ہوا تھا جب یہ مدت پوری ہوئی تو دسمبر ۱۹۱۴ء میں آزمایشی مدت ختم ہونے کے بعد ان کو مستقل کردیا گیا۔ حیدرآباد میں مولانا نے سواری کے لیے گھوڑا گاڑی خریدی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں مولانا کتب خانۂ آصفیہ کی مجلس انتظامی کے رکن بنے۔ ۱۹۱۵ء میں کمیٹی امتحانات السنۂ شرقیہ کے صدر مقرر ہوئے۔ اسی سال مولانا نے طلبہ کی انجمن ثمرۃ الادب کا احیاء کیا اور اپنی صدارت میں اس کو فعال بنایا۔

۱۹۱۶ء میں انیس احمد بی اے نے اجزائے تفسیر کا جو اس وقت تک مکمل

ہو چکے تھے۔ اردو ترجمہ کر کے مولانا کو دکھایا۔ ایک شہادت کے مطابق اسی سال مولانا نے پارہ عم کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۱۶ء کو مولانا نے کمیت رنگ کا ایک گھوڑا خریدا۔

دارالعلوم کالج کے لیے مولانا کا تقرر ابتداءً تین سال کے لیے ہوا تھا۔ یہ مدت ختم ہوئی تو مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا منشور اول تیار ہوا تو مولانا اس کی تیاری میں شریک تھے یا شریک غالب تھے۔ مولانا کی صدارت میں دارالعلوم میں سائنس کی تعلیم کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا کو درد سر کا جو مرض لاحق ہوا اس کی ابتدا حیدرآباد میں ہوئی۔ اس کا ذکر ۵ نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں مولانا نے خود کیا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کے ایک سرکاری مراسلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا "کمیٹی ہائے مبصرین" کے رکن تھے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں مولانا مجلس وضع اصطلاحات کے رکن ہوئے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۸ء کو یوپی گورنمنٹ نے ۵۵ برس کی عمر میں مولانا کو ریٹائر کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا کا اسکیل نظر ثانی ہوا۔ ابتدائی تنخواہ ۵۰۰ کی بجائے ۷۰۰ کر دی گئی مگر مولانا کو اس کا کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ابتدا عثمانیہ یونیورسٹی کالج سے ہوئی۔ ڈاکٹر رضی الدین کی تصریحات کے مطابق عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پہلے پرنسپل مولانا فراہی ہوئے۔ (جامعہ عثمانیہ) یہ واقعہ ۱۹۱۹ء کا ہے لیکن تحقیق سے یہ بات درست ثابت نہیں ہوتی۔ ۳ مئی ۱۹۱۹ء کو مولانا نے نظام دکن سے ملاقات کی۔ یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی جو خود نظام کی خواہش پر ہوئی۔

ملازمت میں توسیع کے بعد ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ مولانا نے ملازمت سے استعفا دے دیا اور وطن واپس چلے آئے۔ ۷ اگست ۱۹۱۹ء کو مولانا ملازمت سے

سبکدوش ہوئے اور ۲۶ اگست ۱۹۱۹ء کو حیدرآباد سے اعظم گڈھ کے لیے روانہ ہوئے۔ علٰحدگی کے وقت مولانا کی تنخواہ ۷۵۰ روپیہ ماہوار تھی نہ کہ ہزار روپیہ۔ ہزار روپیہ اسکیل کی آخری حد تھی۔

قیام حیدرآباد میں مولانا کو علمی کاموں کی طرف توجہ دینے کا بہت کم موقع ملا۔ حیدرآباد کی ملازمت کے چھوڑنے کا ایک بڑا سبب یہی تھا جس کا ذکر مولانا نے خود کیا ہے۔ (الضیاء) تاہم جو کام وہ اس دوران انجام دے سکے ان کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے کیا ہے۔

"یہاں کے قیام کے دوران میں خرد نامہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی اور چھپوائی پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف و نحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر اردو میں دو رسالے مرتب کیے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے۔ اپنے استاد ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کرکے چھپوایا۔ الرای الصحیح تصنیف کی اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے۔" (یادرفتگاں)

قیام حیدرآباد کے زمانے میں مولانا نے نواب عماد الملک کے انگریزی ترجمۂ قرآن کی اصلاح کا کام انجام دیا جو دستبرد زمانہ کی نذر ہوگیا۔ ایک اردو یونیورسٹی کی حیثیت سے جامعہ عثمانیہ کا خاکہ تیار کرنے میں مولانا فراہی کا حصہ کتنا ہے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ اور بحث طلب مسئلہ ہے[1] مگر اتنا طے ہے کہ مولانا کا حصہ کم نہیں۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے حیدرآباد میں درس قرآن کا سلسلہ

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کو مولانا کا خاص کارنامہ بتایا ہے، جس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔

شروع کر دیا تھا لیکن مولانا کے مزاج کے مطابق اس کا حلقہ بہت محدود تھا۔ یہ سلسلہ کچھ خاص لوگوں کی فرمائش پر خواص کے لیے شروع کیا گیا تھا۔

پھریہا اور مدرسۃ الاصلاح میں قیام ۱۹۱۹ء تا ۱۹۳۰ء

اواخر اگست یا اوائل ستمبر ۱۹۱۹ء میں مولانا وطن واپس پہونچے۔ اپنے آبائی گاؤں پھریہا میں قیام کیا۔ جو ان کا مسقط الراس اور خاندان کے لوگوں کا مستقل مسکن تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی رشید الدین مرحوم کے علاوہ دونوں بیٹے جوان ہو کر گھر گرہستی اور زمینداری دیکھنے کے لیے کافی تھے۔ اس لیے مولانا کو ادھر سے بے فکری تھی۔ مدرسۃ الاصلاح جس کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں ایک عرصہ سے وابستہ تھے۔ اب موقع ملا کہ وہ بحیثیت ناظم اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنائیں۔ مدرسہ کی انتظامی ہیئت میں ان کا عہدہ ناظم کا تھا جو سب سے بڑا عہدہ ہے لیکن یہ اعزازی تھا۔ یہ عہدہ انکو باقاعدہ انتخاب کے بعد ۲۰ مئی ۱۹۱۶ء کو پیش کیا گیا۔ جس پر وہ بلا انقطاع تسلسل اپنی وفات تک فائز رہے۔ (روداد مدرسہ) اس لیے وہ حیدرآباد سے واپس آئے تو اس وقت بھی ناظم تھے۔ انھوں نے اپنی خدمت کے عوض مدرسہ سے کبھی ایک حبہ بھی نہیں لیا۔ اپنے تمام مصارف وہ اپنی جیب سے پورے کرتے تھے۔ ان کا کھانا تک گھر سے پک کر آتا تھا۔ عام اساتذہ کے برابر ۸ بائی ۱۰ کے ایک کمرے میں وہ رہتے تھے۔ ان کے لیے نہ علیحدہ کوئی دفتر تھا نہ کلاس روم۔ وہ مدرسے میں پڑھاتے نہیں تھے۔ درس قرآن جس میں مدرسے کے اساتذہ شریک ہوتے تھے ایک برآمدے میں ٹاٹ یا چٹائی پر بیٹھ کر ہوتا تھا۔

مدرسہ کی روداد میں مولانا فراہیؒ کا نام ۱۹۱۰ء[۱] سے نظر آتا ہے۔

[۱] حاشیہ ص ۱۰۲ ملاحظہ ہو۔

اور حیدرآباد سے واپسی تک کے اس دور میں بھی انھوں نے مدرسے کے لیے بعض اہم خدمات انجام دیں۔ مثلاً مدرسے کا دستور العمل تیار کیا۔ (۱۲ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء) مولانا کی نظامت میں مدرسے کا تعلیمی سال ماہ شوال سے شروع کرنے کا فیصلہ ہوا (۱۰ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء) طلبہ کے لیے رجسٹر داخلہ خارج کا اجرا (ستمبر سنہ ۱۹۱۲ء)۔ انگریزی زبان پڑھانے کی ابتدا (اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء)۔ رقم سود پر بنک میں جمع کرانے کی بجائے مضاربت پر کاروبار میں لگانے کی تجویز (نومبر سنہ ۱۹۱۲ء)۔ مدرسے کی امداد کے لیے دوامی چندے کا اجراء (دسمبر سنہ ۱۹۱۲ء) جس کے تحت مولانا نے بھی ایک معقول رقم دے کر پہل کی۔ بطور چندہ مدرسے کے لیے کمرے کی تعمیر کی اسکیم جس کے تحت مولانا نے بھی ایک کمرہ تعمیر کرانے کا ذمہ لیا (اگست سنہ ۱۹۱۳ء)۔ سرکاری امداد قبول کرنے کے لیے آزادانہ حکمت عملی کا فیصلہ (اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء) مدرسے میں مولانا شبلی ندویؒ متکلم[1] کا تقرر (نومبر سنہ ۱۹۱۴ء) مدرسے کی درسگاہ کے لیے بنیاد کی کھدائی میں مولانا کی شرکت (نومبر سنہ ۱۹۱۹ء) حیدرآباد سے واپسی کے بعد کا یہ پہلا قابل ذکر اہم واقعہ ہے۔ فیصلہ چندے کے لیے وفد لے کر مولانا فراہیؒ باہر نکلیں۔ (اپریل سنہ ۱۹۲۱ء) کمیٹی اصلاح نصاب عربی کی تشکیل جس کے

(حاشیہ ص ۱۰۱) مدرسہ کا قیام سنہ ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا اسکے بانی مولانا محمد شفیع مرحوم تھے جو مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی مرحوم سابق رفیق دارالمصنفین اور ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی مرحوم ریڈر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے والد بزرگوار تھے، مولانا شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کا تعلق مدرسے سے بعد میں ہوا۔

[1] مولانا شبلی ندویؒ متکلم اس مجلس اخوان الصفا کے ایک رکن تھے جو علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کے نا تمام کاموں کی تکمیل کے لیے قائم کی گئی تھی، انہیں مدرستہ الاصلاح کے اہتمام وانصرام کی ذمہ داری تفویض کی گئی، مدرسہ کی علمی و تعلیمی شہرت میں مولانا شبلیؒ متکلم کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل رہا ہے، یہ اس سے پہلے ندوہ میں استاد تھے جنوری سنہ ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

ایک رکن مولانا بھی تھے (جون ۱۹۲۱ء)۔ مدرسے سے فراغت کے بعد درجۂ رفاقت کا اجراء۔ جس کے تحت مولوی اختر احسن اصلاحی[1] کو پہلا رفیق مقرر کیا گیا اور ۱۰ روپیے ماہوار وظیفہ دیا گیا۔ اس کے لیے چندہ متعارف ہوا اور پہلا چندہ مولانا فراہیؒ نے اپنی جیب سے دے کر دوسروں کے لیے مثال قائم کی۔ یہ نومبر ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ سنگاپور کے لیے وفد کی روانگی۔ جس میں مولانا امین احسن اصلاحی[2] کو بھی بھیجا گیا (جنوری ۱۹۲۶ء)۔ مدرسے کے نام میں تبدیلی۔ مدرسہ اصلاح المسلمین کی بجائے محض "مدرسۃ الاصلاح" نام رکھا گیا (فروری ۱۹۲۶ء)، مولانا فراہیؒ کی نظامت میں روداد مدرسہ کے مطابق یہ آخری کارروائی ہے۔ اس کے بعد ۴ دسمبر ۱۹۳۰ء کے اندراجات ہیں جبکہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو مولانا اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ ۱۰۔۱۱ سال مسلسل مدرسہ پر قیام کر کے مولانا نے اپنے تخیل کے مطابق مدرسہ کو ایک علمی و تعلیمی مرکز بنایا۔ اصل مقالے میں مدرسہ کی تاریخ اور خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہاں مزید تفصیل کی گنجایش نہیں۔ یہ مدرسہ اپنے خصائص کے ساتھ مولانا فراہیؒ کی ایک عظیم یادگار کی حیثیت سے اب تک موجود ہے۔

مولانا کا معمول یہ تھا کہ وہ ہفتے کے تین[3] دن شب و روز مدرسہ پر قیام فرماتے اور تین دن پھریہا میں گزارتے۔ جو مدرسہ سے صرف سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

---

[1] یہ مولانا فراہیؒ کے خاص شاگرد اور زہد و ورع اور فقر و درویشی میں ان کا مثنیٰ تھے، پوری زندگی بہت قلیل مشاہرہ پر مدرسہ کی خدمت میں گزاری اور مولانا شبلیؒ متکلم کے بعد مدرسہ کے مہتمم ہوئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی انکے ہم درس تھے، ۱۹۵۸ء میں وفات پائی۔ [2] مولانا فراہیؒ کے علمی جانشین اور ان کے علوم و افکار کے شارح و ترجمان جن کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے۔

اور سرائے میر کے بعد مشرق میں دوسرا ریلوے اسٹیشن ہے۔ آنے جانے میں کل ایک گھنٹہ صرف ہوتا ہوگا۔ دیار اعظم گڈھ کی ایک معروف شخصیت ڈپٹی عبدالغنی صاحب انصاریؒ[1] اپنی جیب کی طرف سے مدرسے کو پانچ ہزار کی خطیر رقم اس شرط کے ساتھ دینا چاہتے تھے کہ زر موقوفہ کی اصل محفوظ رہے اور سود سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولانا کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بلا تامل مدرسہ کے لیے یہ رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے ڈپٹی صاحب مولانا سے ناراض رہے۔ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی سے عبدالمجید خواجہ صاحب نے مولانا کو جامعہ میں قیام کرکے درس قرآن کی دعوت دی جو مولانا نے قبول کی اور تقریباً ایک ماہ وہاں قیام کرکے طلبہ و اساتذہ کو مستفید کیا۔ جولائی ۱۹۲۰ء میں یوپی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے مولانا کی پنشن کی منظوری کے احکام صادر ہوئے۔ پنشن کی رقم صرف ۳۳ روپیے پانچ آنے تھی۔ مولانا نے ۱۹۲۴ء میں مدرسہ کے مقاصد کی اشاعت کے لیے مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ برہما کا سفر کیا۔ یہ سفر چونکہ براہ کلکتہ تھا، کلکتہ میں مولانا نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاس مسجد ناخدا میں قیام کیا اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا آزاد نے پھر سہا آکر مولانا سے استفادہ کا پروگرام بنایا مگر وہ نہ آسکے۔ جون ۱۹۲۷ء میں مولانا نے پورے

---

[1] ڈپٹی صاحب مرحوم علامہ شبلیؒ اور مولانا فراہیؒ کے عزیز اور مدرسہ کے خاص ہمدردوں میں تھے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے، کمشنر انکم ٹیکس کے عہدہ سے ریٹائرڈ ہوئے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد قومی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے، ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یو۔پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ۱۹۶۲ء میں کراچی میں انتقال کیا۔

قافلے کے ساتھ حج کے لیے ارض مقدس کا سفر کیا۔ حجاز میں مقامی علماء کے علاوہ علامہ تقی الدین ہلالی، مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ مولانا سندھی نے اپنی مسند درس مولانا فراہیؒ کے لیے خالی کر دی۔ مولانا فراہیؒ کے درس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم بھی شریک ہوتے تھے۔

مرض الموت اور وفات ۱۹۳۰ء | مولانا کی عام صحت ٹھیک تھی مگر ان کو دو بیماریاں لاحق تھیں۔ ایک درد سر کی شکایت دوسری پیشاب رکنے کی بیماری۔ جب دوا علاج سے کام نہ چلتا تو وہ آپریشن کراتے۔ لوگوں کو عام طور پر ان کے ایک آخری آپریشن کا علم ہے۔ لیکن اس سے پہلے بھی وہ کئی آپریشن کرا چکے تھے۔ آخری مرتبہ ان کو پیشاب کی تکلیف ہوئی تو وہ اپنے ایک اہل تعلق اور ذاتی معالج ڈاکٹر حفیظ اللہؒ[1] کے پاس متھرا گئے جہاں وہ سرکاری ہسپتال میں سول سرجن تھے۔ انھوں نے ایک آپریشن تو کر دیا ساتھ ہی دوسرا آپریشن آنت اترنے کی شکایت تھی اس کا کیا۔ آپریشن یوں تو کامیاب رہا لیکن اسی دوران مولانا کو ہچکیاں آنی شروع ہو گئیں۔ جس کے نتیجے میں ٹانکے کھنچ گئے اور سپٹک ہو گیا۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو تار دے کر عزیزوں کو بلوایا گیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی کو انھوں نے خصوصیت سے طلب کیا۔ انتقال سے پہلے یہ لوگ پہنچ گئے تھے[2]۔ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء کو شب کے ۱۱ بجے انتقال ہوا اور

---

[1] اپنے وقت کے مشہور سرجن اور مولانا کے ہم وطن اور بڑے عقیدت مند تھے، مولانا کی تصانیف کی اشاعت اور دوسرے علمی، دینی اور تبلیغی کاموں کے لیے پچاس ہزار کی خطیر رقم عنایت کی تھی، جو اعظم گڈھ کے اسٹیٹ بینک میں جمع کی گئی مگر پھر اس کو نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ [2] مولانا کے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشید الدین صاحب مرحوم پہلے سے وہاں موجود تھے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

اگلے دن ۱۲ بجے وہیں متھرا میں غریب مسلمانوں کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ مولانا نے ہجری تاریخ کی رو سے ۶۹ اور عیسوی تاریخ کی رو سے ۶۷ سال کی عمر پائی۔ مولانا کی وفات پر عقیدت مندوں نے مرثیے اور قطعات تاریخ لکھے جو ہم نے کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔

مولانا کی وفات کے وقت ان کی اہلیہ، چھوٹے بھائی حاجی مولوی رشید الدین صاحب اور دونوں بیٹے محمد سجاد اور محمد عباد زندہ تھے۔ اب ان سب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بڑے پوتے علی میاںؒ جو مولانا کی گود میں پلے تھے وہ بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ حاجی رشید صاحب کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ سجاد صاحب اور عباد صاحب کی اولاد موجود ہے۔ جو مولانا کی نسلی زندگی کی کفیل ہے۔ اور یہ سلسلہ خلفاً عن سلف دراز ہو رہا ہے۔

پسماندگان کے بعد مولانا کی علمی یادگاروں میں کچھ ادارے ہیں جن سے مولانا وابستہ رہے۔ یا جو مولانا کی یاد میں قائم ہوئے، اور ان کی معنوی اولاد انکی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ یہ خاکہ نا تمام رہے گا اگر ان کے نام نہ درج کیے جائیں۔ لیکن انکے مفصل ذکر کا موقع نہیں۔

(حاشیہ ص ۱۰۵ کا) میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سے سنا ہے کہ حاجی صاحب مرحوم نے خدمت اور تیمارداری کا حق ادا کر دیا تھا جس سے مولانا بے حد متاثر اور ان کے ممنون تھے اور فرماتے تھے کہ اگر زندہ رہا تو تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کو دبوچ کر کئی بار فرمایا "دنیا جی لگانے کی چیز نہیں ہے" ۱؎ یعنی مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی سابق ناظم مدرسۃ الاصلاح جنوری ۱۹۸۸ء میں وفات پائی۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، دارالمصنفین اعظم گڈھ، شبلی اسکول اعظم گڈھ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، جامعہ ملیہ دہلی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد وہ ادارے ہیں جن سے مولانا کو کم وبیش نسبت رہی۔ دائرہ حمیدیہ مولانا کی یاد میں ان کے تلامذہ اور عقیدتمندوں نے قائم کیا جس کا دفتر مدرسۃ الاصلاح میں ہے۔ انکی مطبوعہ تصانیف درج ذیل ہیں :۔

۱۔ تفسیر سورۂ عبس	(عربی)	۱۵۔ تفسیر آیہ بسم اللہ	(عربی)
۲۔ تفسیر سورۂ تحریم	(عربی)	۱۶۔ فاتحہ نظام القرآن	(عربی)
۳۔ تفسیر سورۂ کافرون	(عربی)	۱۷۔ التقائد الی عیون العقائد	(عربی)
۴۔ تفسیر سورۂ کوثر	(عربی)	۱۸۔ الرای الصحیح	(عربی)
۵۔ تفسیر سورۂ عصر	(عربی)	۱۹۔ جمہرۃ البلاغۃ	(عربی)
۶۔ تفسیر سورہ والتین	(عربی)	۲۰۔ مفردات القرآن	(عربی)
۷۔ تفسیر سورۂ شمس	(عربی)	۲۱۔ دلائل النظام	(عربی)
۸۔ تفسیر سورۂ ذاریات	(عربی)	۲۲۔ اسالیب القرآن	(عربی)
۹۔ تفسیر سورۂ مرسلات	(عربی)	۲۳۔ اصول التاویل	(عربی)
۱۰۔ تفسیر سورۂ اخلاص	(اردو)	۲۴۔ امعان فی اقسام القرآن	(عربی)
۱۱۔ تفسیر سورۂ قیامہ	(عربی)	۲۵۔ فی ملکوت اللہ	(عربی)
۱۲۔ تفسیر سورۂ فیل	(عربی)	۲۶۔ اقسام القرآن	(عربی)
۱۳۔ تفسیر سورۂ لہب	(عربی)	۲۷۔ تحفۃ الاعراب (منظوم)	(اردو)
۱۴۔ تفسیر سورۂ فاتحہ	(عربی)	۲۸۔ اسباق النحو	(اردو)

۲۹۔ اسباق الصرف (اردو)
۳۰۔ کتاب الامثال (عربی)
۳۱۔ دیوان حمید (فارسی)
۳۲۔ دیوان حمید (عربی)
۳۳۔ نوائے پہلوی (فارسی)
۳۴۔ دیوان الفیض (عربی)
۳۵۔ خرد نامہ (دری)
۳۶۔ ترجمہ پارۂ عم[1] (اردو)
۳۷۔ ترجمہ رسالہ بدأ الاسلام (فارسی)
۳۸۔ ترجمہ طبقات ابن سعد (فارسی)
۳۹۔ شفاعت اور کفارہ کی تردید پر ایک رسالہ (انگریزی)

غیر مطبوعہ تصانیف جو ناتمام حالت میں ہیں :۔

۱۔ حجج القرآن (عربی)
۲۔ حکمۃ القرآن (عربی)
۳۔ کتاب الرسوخ فی معرفۃ الناسخ والمنسوخ (عربی)
۴۔ احکام الاصول باحکام الرسول (عربی)
۵۔ کتاب العقل وما فوق العقل (عربی)
۶۔ الاکلیل فی شرح الانجیل (عربی)
۷۔ اسباب النزول (عربی)
۸۔ تاریخ القرآن (عربی)
۹۔ اوصاف القرآن (عربی)
۱۰۔ الرائع فی اصول الشرائع (عربی)
۱۱۔ فقہ القرآن (عربی)
۱۲۔ الازمان والادیان (عربی)
۱۳۔ فلسفۃ البلاغۃ (عربی)
۱۴۔ سلیقۃ العروض (عربی)
۱۵۔ النحو الجدید (عربی)
۱۶۔ رسالہ فی اصلاح الناس (عربی)
۱۷۔ الاشراق (عربی)
۱۸۔ مسائل النحو (عربی)
۱۹۔ تفسیر سورۂ بقرہ (عربی)

---

[1] تمام اجزائے تفسیر فاتحہ نظام القرآن، امعان فی اقسام القرآن اور الرای الصحیح کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ مولانا کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے کر دیا ہے اور ترجمہ قرآن بھی مکتبہ الحسنات رام پور نے شایع کیا تھا۔

۲۰۔ تفسیر سورۂ آل عمران	(عربی)	۲۵۔ کتاب الدمدمہ والشقمقہ	(عربی)
۲۱۔ المنطق	(عربی)	۲۶۔ تزکیۃ الروح	(عربی)
۲۲۔ مناط صحۃ الحکم	(عربی)	۲۷۔ اصول الفنون	(اردو)
۲۳۔ النظر	(عربی)	۲۸۔ منظومۂ صرف	(فارسی)
۲۴۔ القسطاس	(عربی)	۲۹۔ مختارات من قسم الشعر	(انتخاب عربی)

مذکورۂ بالا غیر مطبوعہ کتابوں کے نام دائرۂ حمیدیہ میں محفوظ مولانا کے ذخیرۂ مسودات سے لیے گئے ہیں۔

میری کتاب ذکر فراہیؒ میں اساتذہ، تلامذہ، اخلاق و عادات، تصانیف اور مشاہیر کی آراء کے مستقل ابواب ہیں جن کا اختصار اس خاکے میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ اس طرح یہ مضمون بہت طویل ہو جاتا۔

کتابیات

۱۔ ماہنامہ الضیاء لکھنؤ، مجلد ۲، جزء ۷، ص ۲۶۰ (عربی)، ۲۔ یادِ رفتگاں مطبوعہ پاکستان (اردو) ۳۔ مجموعۂ تفاسیر فراہیؒ مطبوعہ پاکستان (اردو) ۴۔ ماہنامہ تذکرۂ دیوبند، ستمبر ۱۹۵۹ء (اردو) ۵۔ قلمی بیاض مولوی محمد مہدی چیا اودی۔ ناپید (فارسی) ۶۔ حیات شبلی، دار المصنفین، اعظم گڑھ (اردو) ۷۔ دیوان حمید (فارسی) ۸۔ ریاض الفیض شرح سبعہ معلقہ (قلمی) (عربی، اردو، فارسی) ۹۔ دیوان الفیض (عربی) ۱۰۔ سالانہ رپورٹ سندھ مدرسہ بورڈ، بابت ۱۸۹۶ء۔ ۱۸۹۷ء (انگریزی) ۱۱۔ مکاتیب شبلی حصہ اول و حصہ دوم، مطبوعہ دار المصنفین، اعظم گڑھ (اردو) ۱۲۔ ماہنامہ الندوہ نومبر ۱۹۰۴ء (اردو) ۱۳۔ ماہنامہ الندوہ دسمبر ۱۹۰۵ء (اردو) ۱۴۔ ماہنامہ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء (اردو) ۱۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (اردو) ۱۶۔ جامعہ عثمانیہ مولفہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (اردو) ۱۷۔ تذکرہ دار العلوم (اردو) ۱۸۔ روئداد انجمن مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میر (قلمی) (اردو)۔

اُردو کی ایک قدیم مثنوی

"احوال قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

جنوبی ہند کے ایک ساحلی شہر "ناگور" میں ایک بزرگ مدفون ہیں جن کو وہاں کے لوگ قادر ولی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ہر سال بڑے پیمانے پر ان کا عرس ہوتا ہے جس میں جنوبی ہند کے کونے کونے سے ہزاروں کی تعداد میں ان کے عقیدت مند شریک ہوتے ہیں اور ان کے مزار پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں، یہ بزرگ کون تھے، کس کے مرید تھے، کس علاقہ سے ان کا تعلق تھا، کس زمانہ میں وہ یہاں آئے تھے، یہ سب وہ سوال ہیں جن کا جواب نہ قادر ولی کے عقیدت مندوں کے پاس ہے، نہ تذکرہ نگاروں کے پاس، صرف شیخ محمد اکرام نے اپنی موقر کتاب "آب کوثر" میں دکن میں اشاعت اسلام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے قادر ولی کا بھی ذکر کیا ہے لکھا ہے :۔

"جنوبی ہند کے ایک اور بزرگ جو سید نطہر ولی کے بہت بعد پیدا ہوئے لیکن ان کے معتقدین میں شمار ہو سکتے ہیں، (ناگور) ضلع تنجور علاقہ مدراس کے حضرت سید عبد القادر ولی ناگوری تھے، جو شمالی ہند کے شہر مانک پور میں پیدا ہوئے اور حج کے بعد مالدیپ لنکا کے راستے جنوبی ہند میں آئے، ترچنا پلی میں حضرت طبل عالم سید

نطر ولی کے مزار کی زیارت کی اور علاقہ تنجور میں ارشاد و ہدایت میں مشغول ہو گئے، ترام میں ایک مسجد تعمیر کی اور پھر ناگور میں، جو ایک بڑی تجارتی منڈی ہے، مقیم ہو گئے آپ کے آنے سے اسلام کو بڑی رونق ہوئی اور قریب کے گاؤں دھناسری میں بھی آپنے حاکم اور رعایا کو مسلمان کیا، اب ناگور جنوبی ہند میں ایک اہم اسلامی بستی ہے جو گزیٹیر کی ترتیب کے وقت نیگاپٹن کی حدود میں شامل تھی اور مسلمان نیگاپٹن کی کل آبادی کا ایک چوتھائی تھے۔ حضرت قادر ولی کا انتقال سنہ ۱۵۷۰ء میں ہوا۔ تنجور کا راجا آپ کے معتقدین میں سے تھا، چنانچہ اس نے مزار کے مینار تعمیر کرائے، آپ کے مزار پر ہندو مرد اور عورتیں کثرت سے آتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں[۱]"

اتفاق سے اردو کی قدیم مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ہمارے ہاتھ آیا ہے جو قادر ولی کے متعلق ان سارے سوالوں کا اطمینان بخش جواب دیتا ہے۔ چونکہ یہ مثنوی علمی، تاریخی اور دینی اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لیے اس کا ایک تحقیقی جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہے :۔

مثنوی کا نام عام طور پر قدیم مثنویوں کی تمہید یا خاتمہ میں شاعر اپنا، مثنوی کے نام اور سنہ تصنیف وغیرہ کا ضرور ذکر کرتا ہے مگر چونکہ اس مثنوی کے آخری کچھ صفحات غائب ہیں اس لیے واضح طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس مثنوی کا اصلی نام کیا ہے، البتہ تمہید میں شاعر نے اس تصنیف کی فرمائش کرنے والے کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے :۔

زبانی اس کی مجھ کو بول بھیجا		کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا

---

[۱] حاشیے آخر میں دیئے گئے ہیں۔

ہم نے اسی مناسبت سے اس مثنوی کا نام احوال قادر ولی رکھ دیا۔ حالانکہ اس میں انکے حالات زندگی سے زیادہ ان کے حالات سفر اور ان کی کرامات کا ذکر ہے۔

مصنف کے حالات | مثنوی کے نام کے برعکس اس کے مصنف کے حالات پر مثنوی کی تمہید سے کافی روشنی پڑتی ہے، چنانچہ تمہید میں جو دعائیہ اشعار ہیں ان میں اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

شفاعت سے نبی کی کر گرامی ہے بس عاصی اعزالدین ناؔمی

اس کے علاوہ اکثر مقامات پر مثنوی نگار نے اپنے تخلص کے طور پر ناؔمی کا لفظ دہرایا ہے، اس سلسلہ کے بعض شعر ہیں:

لکھے کیا وصف اس عالی کا ناؔمی ہے رشک آسماں درگاہ قادر

شہا نامی ہے مقروضی نہایت کرم سے اپنے کر اس پر عنایت

اسے بھی اے زری زربخش عالم دفینہ غیب کا دے کر دے خرّم

غرض ناؔمی سے کب ہو اسکی تعریف مقرب ہے خدا کا شاہ میراں

یہی ہے ملتجی ناؔمی بیدل کہ ہو آسان جلدی ساری مشکل

وجہ تالیف میں مثنوی نگار نے نام اور تخلص کے علاوہ اپنے بعض ذاتی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھا ہے:

امیر الملک لعل معدن شان لقب جس کا ہے ممتاز امیراں

کرم کے بحر کا سنگیں بہادر عماد الدین محمد خان بہادر

عماد دولت و جاہ خدا داد مروت کے چمن کا سرو آزاد

تعجب کیا جو کھولا فیض کا باب کہ دادا اس کا تھا نواب وہاب

شکوہ الملک داد اس کا تھا جو سگا بھائی تھا والا جاہ کا او
جو اس کی والدہ خواہر ہے میری وہ ہمشیرہ حقیقی ہے چچیری
قرابت میں ہے وہ مجھ سے یگانہ پھر اس پر اب ہوا ہے سمدھیانا
غرض بیٹا مرا داماد اس کا مخاطب محمی دولہ سے جو ہیگا
ہے عرف احمد حسین اسکا زماں میں رکھے حق خوش اسے دونوں جہاں میں
زبانی اس کی مجھ کو یوں بھیجا کہ لکھ احوال تو قادر ولی کا
خیال اس کا بتایا تھا مجھے خواب گیا نا گور کو میں ہو کے بیتاب
رسالہ وہاں ملا کنز الکرامت ہے جس میں سربسر دکھنی عبارت
میں اسکی نقل یک وہاں کر کے پیدا خوشی سے ساتھ اپنے لے کے آیا
شتاب اس نثر کو تو نظم کر دے مضامیں کو در معنی سے بھر دے
ولی اللہ کا ہے اس میں مذکور بنا کر اس کو کر عالم کو مسرور
ہوئی جب اس سے مجھکو یہ اشارت نظر کر اس کی الفت اور قرابت
سراسر دل نشیں کر اس بیاں کو کیا وا نظم ہندی میں زباں کو
اگرچہ میں سدا رہ کر کے بیمار زمانے کے تھا فکروں میں گرفتار
خیالِ شعر سے یک بار منہ موڑ دیا تھا مثنوی کہنا ہی میں چھوڑ
سلیماں نامہ جب سے میں بنایا ارادہ مثنوی کا پھر نہ آیا
جواب قادر ولی نے پھر مدد کی معاً قدرت بنانے کی مجھے دی
لگا اس مثنوی کے فکر میں میں لگایا دل ولی کے ذکر میں میں
معانی کے جواہر کے تئیں لا سر ابیات کو بخشا سراپا

مذکورۂ بالا وضاحت سے مثنوی نگار کے جو حالات سامنے آتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام اعز الدین اور تخلص ناقی تھا، نواب آف آرکاٹ محمد علی والا جاہ کے حقیقی بھائی شکوہ الملک کے پوتے امیر الملک عماد الدین محمد خاں عماد الدولہ کی ماں مثنوی نگار کی حقیقی چچیری بہن تھی خود عماد الدولہ کی لڑکی سے مثنوی نگار کے صاحبزادے احمد حسین مخاطب بہ محی الدولہ کا بیاہ ہوا تھا، یعنی مثنوی نگار کا لڑکا محی الدولہ شکوہ الملک کے پوتے عماد الدولہ کا داماد تھا، اس طرح مثنوی نگار کا رشتہ مختلف واسطوں سے محمد علی والا جاہ آف آرکاٹ سے جا ملتا ہے۔

آرکاٹ (مدراس) اٹھارویں صدی کے نصف اول تک ریاست حیدرآباد کا ایک حصہ تھا، نظام الملک آصف جاہ اول نے اپنے عہد حکومت میں انوار الدین کو وہاں کا عارضی نواب مقرر کیا تھا جو ۱۷۴۳ء میں مستقل طور پر آرکاٹ کے نواب بن بیٹھے، محمد علی والا جاہ انھیں کے چھوٹے صاحبزادے تھے جو چندا صاحب کے ہاتھوں اپنے باپ کے مارے جانے اور بڑے بھائی محفوظ خاں کے اسیر ہو جانے کی وجہ سے ۱۷۹۵ء میں برسر اقتدار آئے، وہ انگریزوں کے حلیف تھے، انگریزوں نے محمد علی والا جاہ کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے عمدۃ الامراء کو آرکاٹ کا نواب مقرر کیا، آرکاٹ کی نوابی کا یہ سلسلہ ۱۸۵۵ء تک جاری رہا اور نواب غلام غوث خاں آرکاٹ کے آخری نواب تھے، جس کے بعد انگریزوں نے ان کے جانشین کو پرنس آف آرکاٹ کا خطاب دے کر ان کی پنشن مقرر کر دی[۲۵]، مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق انھوں نے اسی والا جاہی خاندان کے ایک چشم و چراغ نواب عماد الدولہ کی فرمائش پر یہ مثنوی لکھی ہے اور اس سے پہلے سلیمان نامہ کے نام سے ایک اور مثنوی بھی وہ لکھ چکے ہیں۔

سنہ تصنیف | مثنوی نگار نے اپنی مثنوی میں کہیں بھی براہ راست اس مثنوی کے سنہ تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے، البتہ ایک جگہ انھوں نے کسی راجا کے ایک ایسے ہندو نوکر کا ذکر کیا ہے جس نے قادر ولی کی دعاؤں سے صحت یاب ہونے کے بعد ان کو صندل کی لکڑی کی بنی ہوئی ایک کھڑاؤں کی جوڑی بطور نذرانہ پیش کی تھی جو اب بھی ان کی درگاہ میں محفوظ ہے اور ہر عقیدت مند زیارت کے بعد ان کھڑاؤں کو اپنے سر پہ رکھنا بڑی سعادت سمجھتا ہے، مثنوی نگار کا کہنا ہے کہ میں بھی سنہ ۱۲۲۹ھ میں وہاں گیا تھا اور ان کھڑاؤں کو سر پہ رکھنے کی سعادت حاصل کی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

مرض کے دکھ سے آزاد ہو بڑا ئی مسلماں ہو گیا شاد ہو بڑا ہی
بنا یک جوڑی صندل کے کھڑاؤں دیا لا نذر شہ کے پڑکے پاؤں
بغیر از کھونٹی اور ڈالی سراسر چلا ہے شاہ دیں اس کو پہن کر
کھڑاؤں وہ ہوئے مقبول شہ کے پہنتا تھا سدا اس کو خوشی سے
وہی جوڑی ابھی درگہ کے اندر دھرے ہیں چوکی پہ ردے میں مرکر
جو جاتا ہے زیارت کو وہاں اب اسے رکھتا ہے سر پہ ہو مودب
تھا بارا سو پہ جب انیس داں سن یہ عاصی وہاں گیا اور خوش کیا من
کیا درگاہ عالی کی زیارت کھڑاؤں سر پہ رکھ پایا سعادت

اس وضاحت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مثنوی مثنوی نگار نے سنہ ۱۲۲۹ھ کے آس پاس ہی لکھی تھی۔

مثنوی نگار نے اپنی اس مثنوی میں قادر ولی کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ خود مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق دکھنی زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم کتاب کنز الکرامت سے

ماخوذ ہیں، قادر ولی کے ان حالات کی بعض جھلکیاں ملاحظہ ہوں :

ولادت | مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق قادر ولی کی ولادت پنج پیر مانک پور میں ہوئی، ان کی ماں کا نام فاطمہ اور باپ کا نام سید حسن قدوس سامی تھا، دونوں پاک نژاد نیک نہاد تھے اور ان کا سلسلہ نسب متعدد واسطوں سے جناب غوث اعظم سے جاملتا ہے، لکھا ہے :

ہے پورب میں بڑا ایک شہر معمور ۔۔۔ کہ ہے نام اس کا مانک پور مشہور
تونگر اور گدا رہتے ہیں اس جا ۔۔۔ نہایت ملک وہ آباد ہیگا
کئی پیروں کی ہیں بستی میں درگاہ ۔۔۔ زمیں میں سوتے ہیں ہر جا حق آگاہ
ہے گنبد اور مسجد جا بجا واں ۔۔۔ بہت ہندو ہیں اور کم ہیں مسلماں
ہے واں پنج پیر کا یک ٹھان اکیلا ۔۔۔ کہ اس جا ہووے ہے ہر سال میلا
وہاں تھی ایک بی بی فاطمہ نام ۔۔۔ کہ اس کے معتقد تھے اہل اسلام
تھا اس بانو کا خاوند گرامی ۔۔۔ شہ سید حسن قدوس سامی
یہ دونوں پاک زاد نیک بنیاد ۔۔۔ جناب غوث اعظم کے تھے اولاد
غرض وہ بی بی ہر دم کی دعا سے ۔۔۔ ہوئی ہے حاملہ فضل خدا سے
ہوا لطف خدا ایک بار ظاہر ۔۔۔ شکم میں ماں کے آیا عبد قادر
صدف میں جا انمول گوہر ۔۔۔ ہوا نخل تمنا بار آور
وہ بی بی پاس آکر خضر یک شب ۔۔۔ خوشی سے کہہ سلام حضرت رب
کہا دے گا تجھے خلاق اکبر ۔۔۔ پسر یک نیک سیرت اور بہتر
کرے گا حق اسے قطب زمانہ ۔۔۔ وہ اپنے وقت میں ہوگا یگانہ

مانک پور یوپی کا ایک چھوٹا مگر مشہور شہر ہے، اس کی مردم خیز زمین نے ہر زمانہ میں بیسیوں صوفیا، علما، اور شعرا کو جنم دیا ہے، تاریخ میں ایسے متعدد بزرگوں کے نام ملتے ہیں جن کا تعلق مانک پور سے تھا، خاص طور پر امیر مینائی کے شاگرد رشید فصاحت جنگ جلیل کو تو کوئی اردو داں بھول نہیں سکتا، ان کا وطن بھی مانک پور ہی تھا۔

تاریخ ولادت | قادر ولی کی ولادت مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق سنہ ۹۱۰ھ میں ہوئی ہے، لکھا ہے:

رہا ہے دس مہینے تک برابر ۔۔۔ شکم میں ماں کے وہ ماہ منور
سن ہجری ہوئی نو سو پہ دس جب ۔۔۔ ہوا پیدا ولی پاک مشرب
ولایت کے فلک کا ماہ نکلا ۔۔۔ کرامت کے جہاں کا شاہ نکلا
سعادت کا ہوا ہے خانہ معمور ۔۔۔ کیا عشرت سے مانک پور کو پور
نپٹ ہو خرم و خوش والد اس کا ۔۔۔ فقیروں کو بہت انعام باٹا
بفضل حق پسر کا اسم نادر ۔۔۔ رکھا شاہ حمید عبد قادر

پیر و مرشد کی تلاش | جب قادر ولی سترہ سال کے ہوئے تو ان کے دل میں کسی کو اپنا پیر و مرشد بنانے کی تمنا جاگی، چنانچہ وہ ماں باپ سے رخصت لے کر پیر و مرشد کی تلاش میں نکل پڑے، اس سفر میں ان کی پہلی منزل گوالیار تھی، وہاں انھیں شاہ محمد غوث گوالیاری سے شرف نیاز حاصل ہوا، شاہ غوث نے انھیں اپنا مرید بنایا اور خرقۂ خلافت بخشا اور دس سال اپنی خدمت میں رکھنے کے بعد انھیں سفر حج پر جانے کی اجازت دیدی، چنانچہ بتایا ہے:

ہوی سترہ برس جب عمر قادر ۔۔۔ ہوئی اکثر کرامت اس سے صادر

کہا قادر ولی ماں باپ سے تب
کسی صورت مجھے رخصت کرو اب

بنا ہے دل مرا اب سخت شیدا
کروں گا جاکے کوئی پیر پیدا

بہ فضل حق کئی منزل کو طے کر
قدم رکھا ہے آ بستی کے اندر

تھا اس بستی کا نام خوش گوالیار
وہاں طالب کا مطلب تھا نمودار

ہوا فضل خدا تب اس کا دم ساز
دیا ہے غیب سے ہاتف نے آواز

ترا ہے پیر کامل صاحب اسرار
ہے جس کا نام سید غوث شطار

تو جا خدمت میں اسکی با عقیدت
بتاوے گا تجھے راہ حقیقت

ادھر ہو کشف سے مرشد بھی آگاہ
اسی کے آنے کی تھا دیکھتا راہ

یکایک یہ ادھر سے ہو کے بیکل
حضور پیر آیا سر سے تے چل

قدم بوسی کیا اور دست بیعت
کیا حاصل دو جگ کی شان و عزت

غرض خدمت میں مرشد کی جو دس سال
ہوا ہے فیضیاب وہ صاحب حال

خلافت کی ہوئی خلعت عنایت
بنا عالم کا ہادی ہدایت

خوشی سے الغرض قادر ولی کو
کہا مرشد نے اب کعبہ کو جا تو

کیا ہے یاں ادا تو حج اصغر
خدا کے گھر میں جا، کر حج اکبر

شاہ محمد غوث گوالیاری شطاری سلسلے کے ایک اہم بزرگ ہیں اور شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، شیخ ظہور حاجی حمید نے ان کو اور ان کے بھائی کو پالا پوسا اور سلوک باطن کی تعلیم دی، تیرہ سال کے ریاض کے بعد جب انھوں نے میدان عمل میں قدم رکھا تو ہندوستان میں مغلوں کی حکومت تھی، بابر اور ہمایوں دونوں انکے معتقد تھے مگر جب شیر شاہ برسر اقتدار آیا تو وہ ان سے معاندانہ برتاؤ کرنے لگا

جس کے نتیجے میں وہ اپنے مریدوں کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے اور تقریباً اٹھارہ سال وہاں گزارے، شیر شاہ کے بعد جب دوبارہ مغل برسر اقتدار آئے تو اکبر سے بھی ان کا رشتہ قائم ہو گیا مگر یہ رشتہ کچھ زیادہ مضبوط نہ تھا، حالات سے مایوس ہو کر وہ دوبارہ اپنے وطن گوالیار چلے آئے اور باقی زندگی وہیں گزاری۔

وہ صرف ایک صوفی نہیں بڑے عالم بھی تھے، رسالہ معراجیہ، جواہر خمسہ، کلید مخازن کنز الوحدت، ضمائر و بصائر اور بحر الحیوٰۃ ان کی مشہور تصانیف ہیں، ۱۵۶۲ء میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور گوالیار میں مدفون ہوئے، ان کا عالی شان روضہ آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔[۳۱]

سفر لاہور | قادر ولی سفر حج کو جانے سے پہلے اپنے مریدوں کے ساتھ لاہور گئے اور کچھ دن وہاں قیام کیا، چنانچہ لکھا ہے:

کئی دن جب چلے منزل بہ منزل — ہوئے لاہور کی بستی میں داخل
مشائخ اور عالم اس جگا کے — ملے حضرت سے استقبال آکے
گئے لے شان سے بستی کے اندر — اتارے مسجد جامع میں لاکر
ہوا پُر نور سارا شہر لاہور — بنا اس ملک کا کچھ اور ہی طور
کرامت کے فلک کا قطب عالی — سعادت کے ولایت کا وہ والی
کئی دن تک رہا اس شہر میں جب — ملے وہاں کے بزرگاں آن کر سب
کئے صحبت سے اسکے کام حاصل — ہوئے اپنے مراد دل سے واصل

سفر حج کا آغاز | سفر حج کے لیے خشکی سے زیادہ پانی کا سفر آسان ہوتا تھا، چنانچہ قادر ولی اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ اب شمال سے جنوب کی طرف چل پڑا، مصنف کی

وضاحت کے مطابق پہلے یہ قافلہ کچّی پہنچا اور پھر مالا بار اور کالی کٹ، جہاں سے قافلہ کے یہ سارے لوگ سفرِ حج کے لیے جہاز پر سوار ہوئے چنانچہ لکھا ہے :

کئی منزل کو طے کر شاہ والا
خدا کے فضل سے کچّی کو پہنچا

میاں! بندر ہے واں یک شہر کے پار
ہے پاس اسکے کلی کوٹ اور ملیبار

تمامی قافلہ کو لے کے ہمراہ
مقام اس گاؤں میں آکر کیا شاہ

مریدوں سے کہا دیکھو تو جاکے
کھڑا ہے ناؤ کوئی ریو یہ آکے

جہاز آکر اسی دن یک منور
کھڑا تھا ریو پردے کرکے لنگر

کہے آئے تھے یک بندر سے باہم
عرب کے ملک کو جاتے ہیں اب ہم

کہے جب شاہ سے سر بات آکر
بجالایا خدا کا شکر سرور

شتابی ناؤ کے نیول کو دیکے
چڑھا اپنے مریدوں ساتھ لے کے

ہوا کشتی کا گھر پُر نور و آباد
خلاصی اور معلم ہو گئے شاد

مثنوی نگار نے قادر ولی کے سفرِ حج کے سلسلے میں جنوبی ہند کی تین جگہوں کے نام لیے ہیں، کچّی، کلی کوٹ اور ملیبار۔ (۱) کچّی نام کا کوئی شہر اب اس علاقہ میں نہیں ہے شاید موجودہ کوچین (Cochin) ہی کو اس نے کچّی کے نام سے یاد کیا ہو۔ اس زمانے میں وہ ایک ہندو ریاست تھی اور اب کیرالا میں شامل ہے۔ (۲) کلی کوٹ کا موجودہ نام کالی کٹ (Calicut) ہے، ایک زمانہ میں وہ ہندوستان کے مغربی ساحل کی ایک اہم بندرگاہ تھی جہاں عربوں کے تجارتی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، بعد میں فرانسیسی اور انگریز تاجروں نے اسی کو اپنی تجارتی منڈی کے طور پر استعمال کیا اور آج بھی ایک ساحلی شہر ہونے کی وجہ سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ (۳) ملیبار (Malabar) کوئی

شہر نہیں ایک علاقہ ہے جو جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر واقع ہے، یہ سارے علاقے ہندوستان کی آزادی سے پہلے پرانے صوبۂ مدراس میں شامل تھے، لیکن آزادی کے بعد جب ہندوستان کی لسانی تقسیم عمل میں آئی تو ان علاقوں کو صوبۂ مدراس سے الگ کرکے ایک مستقل ریاست کا درجہ دے دیا گیا، اس ریاست کو آج ہم کیرالا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مناسک حج کی ادائیگی اور واپسی | یہ جہاز کالی کٹ سے چل کر جدہ میں لنگر انداز ہوا، قادر ولی اپنے مریدوں کے ساتھ وہاں اترے، احرام باندھا اور پا پیادہ ہی حرم کی طرف چل پڑے ایک ایک کرکے سارے مناسک حج ادا کیے پھر مدینہ منورہ جاکر روضۃ النبیؐ کی زیارت کی اور آخر میں نجف و کربلا اور بغداد کا سفر کرکے وہاں کی برکتوں سے مالا مال ہوئے، اس طرح یہ قافلہ حج و زیارت کے سارے فرائض انجام دینے کے بعد دوبارہ مالا بار لوٹ آیا، اس سفر حج کی بعض تفصیلات خود مثنوی نگار نے اس طرح بیان کی ہیں:

جہاز آکر کیا جدّہ میں لنگر — ولی اترا تب اس بستی کے اندر
کیا واں سے حرم کا جب ارادہ — لگا چلنے خوشی سے پا پیادہ
اتر یک باغ کے اندر وہ طاہر — کیا با پاک باطن غسل ظاہر
وہاں سے آ طواف حق ادا کر — دیا بوسہ حجر اسود کو جا کر
مقام خاص ابراہیم میں — مناسک سب ادا کر وہ معلی
مریداں اپنے یک یک لیکے ہمراہ — ادائے حج کیا الحمد للہ
وہاں سے پھر مدینہ کو گیا ہے — سعادت دین و دنیا کی لیا ہے
گیا واں سے نجف اور کربلا میں — سعادت یاب ہو وہ دو جہاں میں

کیا بغداد کی آکر زیارت لیا ہے روضۂ جد سے سعادت
کئی دن تک چلا واں سے جو یکبار جہاز شاہ آ پہنچا ملیوار

سفر مدراس | مالابار لوٹنے کے بعد قادر ولی اور ان کے مریدوں نے وہاں قیام نہیں کیا بلکہ اب وہ مدراس کے مغربی ساحل سے نکل کر اس کے مشرقی ساحل کارومنڈل (Coromandel) کی طرف چل پڑے، وہاں ان کا جن جن علاقوں سے گذر ہوا، اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہے، یہاں اس کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں'

مال دیپ (Maldives) یہ تقریباً دو ہزار چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے، یہاں پہلے ایک مسلم حکومت تھی، لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان پر انگریزوں کے مکمل قبضہ کے بعد یہ سارے جزائر بھی انگریزوں کی حفاظت میں لے لیے گئے، ۱۹۶۵ء میں انھیں آزادی ملی، اب وہ ایک آزاد مسلم ریاست ہے، یہ ریاست مدراس اور سری لنکا دونوں سے قریب ہے،

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کے عہد میں شاید یہاں کی زیادہ تر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی، اس لیے انھیں مسلمانوں کے اس قافلہ کا وہاں آنا ناگوار گذرا، چنانچہ انھوں نے ان لوگوں کو کھانے میں زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی جو ناکام رہی' اس سازش کا پتہ چل گیا تو وہ لوگ بہت شرمندہ ہوئے اور معافی مانگی اور پھر اپنے دوران قیام میں قادر ولی نے دیوی دیوتاؤں پر لڑکیوں کی بلی چڑھانے کی وہاں کی ایک پرانی رسم کو جس طرح توڑا اس سے وہاں کے عوام بہت متاثر ہوئے اور سب مسلمان ہوگئے۔ لکھا ہے :

چلے کتنے قدم پانی میں سب جب کہا سرور نے آنکھیں کھول دو اب

جو دیکھے کھول کے آنکھوں کو اس آن ہے شہر مالدیپ آگے نمایاں

فقیروں کو جو دیکھے لوگ وہاں کے ہوئے یکدست دشمن ان کی جاں کے

مسلمانوں سے تھا نت انکو انکار ہوئے تسنے سے ان کے سخت بیزار

ملا کر زہر میوے نذر لائے مرید و پیر سب یکبار کھائے

اثر اس زہر کا کچھ نہیں ہوا جب نہایت دل میں شرمندہ ہوئے سب

معافی چاہے بچوں پر رکھ کے سر کو گئے پھر واں سے اپنے اپنے گھر کو

عجب تھا رسم وہاں کا اس زماں میں بڑا تھا قاعدہ سب کافراں میں

کہ یک لڑکی کسی کی خوبصورت نہ ہوئے جسکے ثانی کوئی مورت

اسے آراستہ کر خوب فی الحال کسی دیول میں پہنچاتے تھے ہر سال

شتابی آکے یک جن اس جگا پر اسے لے کر کے جاتا تھا اڑا کر

وہاں آیا ہے جب وہ حاکم جن قضا را تھا بھگت دینے کا وہ دن

نگاہ جن پڑی جب شاہ دیں پر لگا ہے کانپنے دہشت سے تھرتھر

دیا تب حکم جن کو شاہ رہبر گیا بارا ہو وہ میتے کے اندر

پکڑ کر قید میں کرنے لگا آہ نہیں واں سے نکلنے کی رہی راہ

پھر اس بستی کا حاکم اور ارکان دل و جاں سے ہوئے خوش ہو مسلمان

نشتم اس نام کا کوئی شہر مدراس کے نقشے میں نہیں ملتا، البتہ مدراس کے ایک ضلع نگر کوئل (Nagercoil) کے انتہائی کنارے کیپ کومرین (cape comorin) کے قریب ایک چھوٹا سا ساحلی شہر ہے جس کا نام مٹم (Muttam) ہے۔ شاید مثنوی نگار نے اسی کو نشتم کے نام سے یاد کیا ہو۔ کیونکہ یہ مالدیپ سے بہت قریب پڑتا ہے۔

مثنوی میں بتایا ہے کہ یہ قافلہ مال دیپ سے نکل کر نتھم پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے پہلے تو بے اعتنائی برتی مگر جب ان لوگوں نے قادر ولی کا ایک کرشمہ دیکھا تو وہ ان کی اور ان کے مریدوں کی عزت کرنے لگے، سب مل کر قادر ولی کے پاس آئے اور ہاتھ جوڑے، ان کے سردار نے ان کی خدمت میں ایک تلوار بھی پیش کی، قادر ولی نے اسکو خوشی سے قبول کیا اور پھر لوٹا دیا، خدا نے سردار کے اس حسن عقیدت کے صلہ میں اس کے گاؤں کو اس کی ریاست میں بدل کر رکھ دیا جس پر اس کی موت کے بعد اس کی اولاد نے حکومت کی، لکھا ہے:

وہاں سے چل دیا جب شاہ عالم	ملا شہر یک تھا جس کا نام نتھم
گیا اس گاؤں میں وہ شاہ کامل	رفیق اس ساتھ سے آکر کی منزل
پھر اس بستی کے لوگاں مل کے تھوڑے	حضور شاہ آئے ہاتھ جوڑے
خوشی سے مرد یک تلوار لاکر	کیا ہے نذر شہ کرنش ادا کر
ولی حق نے اس تلوار کو لے	اٹھا کر ہاتھ میں یکدست دیکھے
اسی کو پھر دیے اپنی طرف سے	کیا ممتاز اس کو اس شرف سے
ہوئی اس روز سے اسکو فراغت	دیا سب گاؤں کی حق نے ریاست
پھر اس کے بعد اسکی ساری اولاد	حکومت سے رہے نت شاد و آباد (باقی)

حوالے

۱۔ شیخ محمد اکرام: آب کوثر، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۵۹ ۲۔ محمود بنگلوری: تاریخ جنوبی ہند، پبلشرز یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص ۲۹۵، ۲۷۰ ۳۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر، فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۴۱ - ۳۰۔

اموی دور کی غزلیہ شاعری

از جناب محمد سمیع اختر ریسرچ اسکالر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

عمر بن ابی ربیعہ عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعہ بن مغیرہ مخزومی کی پیدائش ۲۳ھ کو مکہ کے ایک قریشی خاندان میں عین حضرت عمرؓ کے انتقال کے روز ہوئی، اسی لیے اس کے گھر والوں نے اس کا نام عمر رکھ دیا[1]۔ اس کے دادا ابو ربیعہ مشہور بنو باذاہ اور والد عبداللہ مالدار تاجر تھے۔ اسکی پرورش عیش و تنعم میں ہوئی تھی۔ اس کی ماں کا تعلق یمن سے تھا۔ وہاں کی لطافت و نزاکت اور امیرانہ زندگی کے اثرات بھی اس پر پڑے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس کے والد عبداللہ کچھ دنوں یمن کے گورنر بھی رہے[2]۔ عیش و عشرت اور لہو و لعب کی زندگی کا اثر اس کی شاعری پر بھی پڑا جس میں زندہ دلی و ہوسناکی کے جذبات و احساسات کی بڑی بے باکی سے تصویر پیش کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زندگی کے آخری دنوں میں وہ ہر طرح کے لہو و لعب اور لغویات سے توبہ کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گیا تھا[3]۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑھاپے میں اس کے قویٰ جب بالکل مضمحل ہو گئے تو مجبوراً وہ اپنی حرکتوں سے باز آگیا[4]۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف و پیری کے زمانہ میں جب وہ شعر کہتا تو ایک غلام کو آزاد کرتا تھا[5]۔

---

[1] الاعلام ج ۵ ص ۱۹۲ [2] کتاب الاغانی ج ۱ ص ۳۸ [3] عمر بن ابی ربیعہ المخزومی عمر فروخ ص ۲۱ [4] التطور والتجدید فی الشعر الاموی — الدکتور شوقی ضیف ص ۲۱۳ [5] عمر بن ابی ربیعہ۔ جبور ج ۲ ص ۱۹۵۔

اس کی وفات کے بارے میں متعدد روایتیں ہیں جن میں قرین قیاس روایت یہ ہے کہ حج کے لیے آنے والی شریف عورتوں کے بارے میں غزلیہ اشعار کہنے کی وجہ سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اسے جلا وطن کر کے بحر احمر کے ایک جزیرے "دھلاک" کی طرف بھیج دیا تھا کچھ عرصہ بعد وہیں ۹۳ھ میں اس کی موت ہو گئی۔[1]

شاعری | عمر اباحیت پسند شعرا کا سرغنہ تھا اس نے شاعری کے اور اصناف کو نظر انداز کر کے صرف تغزل کی جانب توجہ کی۔ اس دور میں شاعری کسب معاش کا ذریعہ ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے شاعری کو پیشہ بنانے کے بجائے اسے صرف تشبیب اور تغزل کے دائرے تک محدود کر لیا۔

جدت طبع اس کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ ہر غزل کے اندر اس نے اپنے احساسات و خیالات کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر غزلوں میں وہ جاہلی شعرا کی تقلید کرتے ہوئے غزل کی ابتدا محبوب کے ذکر سے کرتا ہے پھر اس سے عشق و محبت اور وصل و ہم آغوشی کی داستان سناتا ہے۔ درمیان میں محبوب کے جسمانی محاسن اور گھوڑے کا وصف بیان کرتا ہے لیکن اس کے دالیہ قصیدے میں عشق و محبت کا نیا طرز دکھائی دیتا ہے، اس سے اس کے خیالات کی جدت و ابتکار اور تخیل کی بلند پروازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے یہاں عشق و محبت کے جذبات خارجی حالات اور اندرونی کیفیات کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ عذری شاعروں کے برعکس اس کی محبت اور سوزش ایک خاص وقت کے لیے ہوتی ہے۔

---

[1] مقدمۃ شرح دیوان عمر بن ابی ربیعۃ المخزومی۔ محمد محی الدین عبد الحمید ص۱۹۔

غزلیہ شاعری

عمر بن ابی ربیعہ کے نزدیک محبت کسی پاکیزہ اور مقدس جذبے کا نام نہیں بلکہ یہ لہو و لعب اور تفریح کا ایک ذریعہ ہے اس لیے اس کے غزلیہ اشعار میں متانت و سنجیدگی اور عفت و پاکدامنی کا کوئی تصور موجود نہیں، وہ عشقیہ خیالات اور شہوانی جذبات کے اظہار میں بسا اوقات مذہبی احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔[1] ذیل کی مثالوں سے اس کی تصدیق ہوگی۔

ولقد دخلت البیت اخشی اهله　　بعد الهدو وبعد ما سقط الندی

میں اس کے گھر والوں کے خوف سے اچھی طرح تاریکی اور خاموشی چھا جانے کے بعد اس کے گھر میں داخل ہوا۔

فوجدت فیه حرة قد زینت　　بالحلی تحسبه بها جمر الغضا

میں نے وہاں ایک ایسی شریف اور آزاد عورت کو دیکھا جو زیورات کے اندر کسی انگارے کے مانند دمک رہی تھی۔

لما دخلت منعت طرفی غیرها　　عمداً مخافة ان یری ریع الهوی

جب میں وہاں پہونچا تو میں نے قصداً اپنی نگاہ کو اس کی طرف سے ہٹا لیا کہ مبادا شہوانی جذبات عیاں نہ ہو جائیں۔

فاحببتها ان المحب معود　　بلقاء من یهوی وان خاف العدی[2]

میں نے اس سے اچھی طرح پیار کیا اور عاشق تو اپنے محبوب سے ضرور ملتا ہے خواہ اسے دشمن کا کتنا ہی خوف ہو۔

ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں عشق و محبت کرنا ضروری ہے

اذا انت لم تعشق ولم تدر ما الهوی　　فکن صخراً من یابس الصخر جلمدا

---

[1] حدیث الاربعاء۔ الدکتور طہٰ حسین ص۲۸۶ [2] دیوان عمر بن ابی ربیعہ تحقیق ابراہیم اعرابی ص۸۱

[3] الحب والغزل بین الجاهلیة والاسلام۔ عبداللہ انیس الطباع ص۱۰۶۔

اگر تم نے عشق نہیں کیا اور سوزش عشق کے متعلق تمہیں کچھ معلوم نہیں تو پھر تم میں اور ایک خشک چٹان میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہ رات کے ختم ہوجانے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے۔

فبتُّ قریر العین اعطیت حاجتی　　　　اقبل فاها فی الخلاء فاکثر

میں نے اطمینان اور سکون کے ساتھ رات بسر کی، میری خواہش کی تکمیل ہوئی میں نے تنہائی میں اسکے رخسار کا خوب خوب بوسہ لیا۔

فیالک من لیل تقاصر طوله　　　　وما کان لیلی قبل ذالک یقصر

برا ہوا اس رات کا جو اس قدر مختصر ہو گئی جب کہ اس سے قبل میری کوئی رات اتنی مختصر نہیں تھی۔

اس کا تصورِ عشق و محبت یہ تھا:۔

انی امرؤ مولع بالحسن اُتبعه　　　　لاحظ لی فیه الا لذة النظر

حسن جہاں کہیں بھی ہو میں اس کا پرستار ہوں، میرا مقصد اس کے سوا مزید کچھ نہیں کہ نگاہوں کو لذت حاصل ہو۔[1]

اس کے تغزل میں انانیت اور خود پسندی بھی ہے، اپنے مشہور لامیہ قصیدے میں وہ ان حسین عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو اس سے ملاقات کی خواہشمند ہیں اور آخر کے چند اشعار میں براہ راست اپنی ذات کو تعریف و توصیف کا موضوع بنا لیا ہے۔[2] اس کے دیوان میں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود محبوب کے دیدار یا وصال کے لیے مضطرب نہیں ہے بلکہ خود محبوب پریشان اور بے قرار رہتا ہے اور فرقت و جدائی کے وقت قاصد بھیجتا ہے اور بے قراری میں موت کی تمنا کرنے لگتا ہے۔

---

[1] الحب والغزل بین الجاهلیة والاسلام ص ۹۸-۲ [2] دیوان عمر بن ابی ربیعہ ص ۲۳۰

اس نے اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی کسی ایک محبوب کو اپنی تمناؤں کا مرکز نہیں بنایا۔ بلکہ ایک ہی وقت میں متعدد شریف زادیوں سے اظہار عشق و محبت کرتا ہے، ایک ہی قصیدے کے اندر ایک سے زیادہ محبوب کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے محبوبوں کی فہرست بہت لمبی ہے اور وہ ان سب سے اشارے کنائے میں نہیں بلکہ علانیہ تشبیب کرتا ہے۔

اس کے اشعار میں رات کی تاریکی کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ظاہر ہے لہو ولعب میں دلچسپی لینے والا شخص دن کی روشنی کے بجائے رات کی تاریکی کو ترجیح دے گا۔ اس کا عشق رات کی تاریکی میں ہی زیادہ پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قصائد کو "لیلیہ" بھی کہتے ہیں[1]

فنزی لیلنا اذا ثما اشمر		سمون یقلن الا لیتنا[2]

وہ اپنی سواریوں سے اتریں اور انھوں نے کہا! کاش ایسا ہوتا کہ ہمیشہ مہینوں تک رات ہی رات ہوتی۔

فیغفل ذا الناس عن لهونا		ونسمرہ کلہ مقمرا

اور لوگ ہماری لہو ولعب کی حرکتوں سے غافل ہوتے اور ہم پوری رات چاند کی روشنی میں باتیں کرتے ہوئے گذار دیتے۔

اس کی غزل کی ایک نمایاں خصوصیت رجائیت پسندی ہے۔ اس کے نزدیک عشق کا مطلب مایوسی و ناکامی نہیں ہے۔ وہ ہجر و فراق کے عالم میں آنے والی مشکلات و پریشانیوں کو برداشت کرنے اور ان پر صبر کرنے کو حقیقی عشق نہیں سمجھتا۔ وہ ایسی محبت کا سرے سے قائل نہیں جو تفریح کے بجائے دل کا روگ بن جائے، اس کے نزدیک محبت کچھ کھونے کا نہیں بلکہ کچھ پانے کا نام ہے۔ وہ عشق کی راہ میں قربانی دینے اور

---

[1] تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام ص۳۱۲ [2] عمر بن ابی ربیعہ جبور ج ۲ ص۲۷۹

اپنی ذات کو فنا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ وہ محبت کی ناکامی پر کبھی اظہار افسوس نہیں کرتا اگر ایک محبوب التفات وعنایت کا دروازہ بند کر دیتا ہے تو وہ دوسرے در پر دستک دیتا ہے اسکے بیشتر قصائد میں سہل پسندی اور سطحیت کا عنصر غالب ہے۔ وہ احساس وشعور کی گہرائیوں تک پہنچنے کے بجائے سطحی جذبات اور پامال خیالات کو پیش کرتا ہے وہ وصل کی حقیقی لذت سے ناآشنا ہے اور ہجر کی کلفت کا بھی اسے کوئی احساس نہیں۔ وہ محبوب کے ظاہری حسن وجمال پر فریفتہ اور مادی لذتوں میں گم رہتا ہے[۱]

عمر بن ابی ربیعہ کے غزلیہ اشعار میں اس دور کی معاشرتی واجتماعی زندگی کی پوری جھلک[۲] اس سے اس دور کی عورتوں کے طرز بود وباش کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔

وہ مشکل اور پرشوکت الفاظ کو استعمال کرنے کے بجائے سہل اور کثیر الاستعمال الفاظ کے انتخاب پر زور دیتا ہے۔ اس کے بیشتر اشعار عام فہم اور صنائع وبدائع کی مشکل بندشوں سے آزاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں کے درمیان مقبول ہے۔

اس کے اشعار کسی حکایت یا قصے کے مانند مربوط نظر آتے ہیں۔ اس نے اپنے احساسات وخیالات کی تعبیر کے لیے قصصی اسلوب کو اختیار کیا ہے۔ امرؤ القیس اور دوسرے جاہلی شعراء کے یہاں قصصی اسلوب شکاریات یا جنگوں کی روداد بیان کرنے میں ملتا ہے لیکن عمر بن ابی ربیعہ نے فنی مہارت کے ساتھ عشق ومحبت کی داستان بیان کرنے کے لیے اس اسلوب کو استعمال کیا اور اس کے اندر لطافت اور جدت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی[۳]

اس کی غزلیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے رسائل کی

---

[۱] تطور الغزل بین الجاهلیة والاسلام ص۳، مقدمہ شرح دیوان عمر بن ابی ربیعہ ص۲۶

[۲] الغزل منذ نشأته حتی صدر الدولة العباسیه۔ ص۳۲۔

زبان میں غزل کہنا شروع کیا۔ اس طرح کا سب سے طویل خط اس نے ام عثیم کے نام تحریر کیا۔ بسم اللہ سے خط کو شروع کیا۔ سلام و دعا کے بعد اسے اپنی وفا اور محبت کا یقین دلایا۔ اس کے بعد قاصد کی شکایت کی کہ وہ ہمارے مابین پیغام رسانی کا کام اچھی طرح انجام نہیں دے رہا ہے[1]۔ بعض غزلیہ رسائل کے اندر محبوب کی جانب سے ملنے والے خط کے جواب کا ذکر بھی کرتا ہے۔ یہ اس کی شاعری کا بالکل نیا رنگ ہے جو نہ جاہلی دور کی شاعری میں ہے اور نہ اسلامی دور کی شاعری میں۔

عمر بن ابی ربیعہ نے عربی غزل گوئی کو مستقل فن کی شکل دے کر اسے ترقی کی آخری منزلوں تک پہونچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف اموی دور کی بلکہ عربی غزل گوئی کا امام کہے جانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد کے اکثر غزل گو شعراء نے اس کی خوشہ چینی کی ہے۔

وضّاح یمن | عبدالرحمٰن بن اسماعیل وضّاح یمن بھی اموی دور کا مشہور غزل گو شاعر ہے۔ جس کی غزل گوئی میں اباحیت پسندی اور مذہبی و اخلاقی قیود سے آزادی کا رجحان پایا جاتا ہے، اس کی وفات سنہ ۹۰ھ میں ہوئی[2]۔ بعض لوگ اسے ایرانی الاصل بتلاتے ہیں۔ جہاں سے اس کے آبا و اجداد کسی زمانے میں یمن میں آکر آباد ہو گئے تھے[3]۔ دوسرے لوگ اسے عربی نژاد بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بچپن میں اس کے والد کے بعد اس کی ماں نے ایک ایرانی شخص سے شادی کر لی تھی اور یہ اسی کی گود میں پروان چڑھا اور چچا کے مطالبہ کے باوجود اسے دینے سے انکار کر دیا، مقدمہ قاضی کے پاس پہونچا تو ایرانی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ عبدالرحمٰن بڑا خوبصورت تھا۔ قاضی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تم "وضّاح یمن" ہو۔

---

[1] دیوان عمر بن ابی ربیعۃ ص۳۰۹ اور ص۳۱۳ [2] الاعلام ج ۳ ص ۲۹۹ [3] عمر بن ابی ربیعۃ المخزومی وتطور الغزل والنسیب فی الشعر العربی ص۲۰ ۔

اسی وقت سے اس کا یہ لقب مشہور ہوگیا[1]۔ عمر بن ابی ربیعہ کی طرح یہ بھی حج کے زمانے میں چھپ کر عورتوں کو دیکھا کرتا تھا۔ اسی درمیان اسے یمن کی روضہ نام کی ایک حسین لڑکی سے عشق ہوگیا۔ روضہ بھی اس سے محبت کرنے لگی۔ وضاح نے اس سے شادی کا ارادہ کیا لیکن روضہ نے انکار کر دیا کیونکہ اسی دوران اسے جذام (برص) جیسا مہلک مرض لاحق ہوگیا۔ اکثر اشعار میں وہ روضہ سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اسکے بعد ولید بن عبدالملک کی بیوی ام بنین سے جو بڑی حسین وجمیل تھی عشق ہوگیا۔ ام بنین بھی اس سے محبت کرنے لگی تھی، اسی اظہار عشق کے جرم میں ولید نے اسے دھوکے سے قتل کرا دیا تھا[2]۔

اس نے اپنے اشعار میں دقیق اور فلسفیانہ افکار کو بیان کرنے کے بجائے عشق ومحبت کے عام انسانی جذبات واحساسات کو آسان الفاظ، سہل ترکیب اور مناسب تشبیہات کی مدد سے مکالماتی انداز میں موزوں کیا ہے۔ اس کے اشعار میں بھی عمر بن ابی ربیعہ کی شاعری کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔ وہ روضہ سے متعلق اپنی الفت ومحبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

الا لیت الریاح لنا رسول : الیکم ان شمالا او جنوبا

اے کاش کہ شمال اور جنوب سے چلنے والی ہوائیں ہمارے درمیان پیغام رسانی کا کام انجام دیتیں۔

فتاتیکم بما قلنا سریعا ویبلغنا الذی قلتم قریبا

(اگر ایسا ہوتا) تو میری باتیں تم تک اور تمھاری باتیں مجھ تک جلد پہنچ جایا کرتیں۔

الا یا روض قد عذبت قلبی فاصبح من تذکرکم کئیبا

اے روضہ سنو! تم نے میرے دل کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے اور میں تمھاری یاد میں حزن وافسردگی

---

[1] حدیث الاربعاء ج ا ص ۲۴۸ [2] الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیہ ص ۱

کی زندگی گذار رہا ہوں۔

وبر تقققنی ھواك وكنت جلدًا   وابدیٰ فی مفارس تی المشیب[1]

مجھے تیری محبت نے نحیف اور کمزور بنا دیا ہے جب کہ میں قوی اور توانا تھا اور میرے سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں۔

اس کے الفاظ کی سہل پسندی، صفائی اور روانی، مفہوم کی سادگی اور مکالماتی اسلوب کا اندازہ دوسرے اشعار سے بھی ہوتا ہے دراصل اس کی شاعری میں اباحی غزل گوئی کی اکثر خصوصیات موجود ہیں۔ نہ اس کے خیالات میں کوئی پیچیدگی ہے اور نہ الفاظ و اوزان کے اندر غرابت،

عرجی | محمد بن عبدالرحمٰن مخزومی عرجی مکہ کے مشہور اباحیت پسند غزل گو شعرا میں تھا۔ وہ خالص عربی النسل تھا اور اس کا تعلق حضرت عثمانؓ کے خاندان سے تھا۔ عمر بن ابی ربیعہ کی طرح اسکے پاس بھی ثروت و دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ طائف کے قریب ہی "عرج" نام سے اس کا ایک علاقہ تھا۔ اس کے باپ دادا اس علاقے کے زمیندار تھے۔ عرجی اسی کی جانب نسبت ہے[2]۔ ابتدا میں عرجی نے شہرت و عزت حاصل کرنے کیلئے بڑی تگ و دو کی، بے دریغ روپیہ خرچ کیے اور داد و دہش کی، غزوات میں بھی شریک ہوا اور اپنی شجاعت و بہادری کا سکہ بیٹھا دیا مگر جب اپنے مقصد میں ناکام رہا اور اموی حکمرانوں نے اس کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا تو مایوس ہوکر لہو و لعب کی طرف راغب ہوگیا[3]۔ اور عمر بن ابی ربیعہ کی روش اختیار کرکے اباحی غزل گوئی کو اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ گو دونوں کی زندگی میں فرق ہے عمر تعیشات اور لہو و لعب کے مشاغل پر قانع تھا لیکن عرجی کی غزل گوئی ایک طرح کا ردعمل ہے۔ اس کے

---

[1] عمر بن ابی ربیعہ مخزومی۔ عمر فروخ ص ۲۸ [2] کتاب الشعر والشعراء ج ۲ ص ۵۵۶ [3] حدیث الاربعاء ج ۱ ص ۲۴۸۔

اندر کچھ حاصل کرنے کا جذبہ اور لگن ہے۔ ناکامی کی وجہ سے اس کے دل میں اموی بادشاہوں کے خلاف بغض و نفرت کا جذبہ موجزن تھا اور وہ ان کی ہجو کرتا تھا ان کے خاندان کی شریف زادیوں کے ساتھ تغزل کرتا تھا[1] ظرافت بھی اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے اس کے تغزل کا اندازہ کرنے کے لیے ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

عوجي علينا ربة الهودج　　　انك إلا تفعلي تحرجي[2]

اے پردہ نشین خاتون! میری طرف بڑھو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نقصان میں رہوگی۔

اسکی فحش گوئی وغیرہ کی وجہ سے محمد بن ہشام نے اس کی بڑی تذلیل کی اور نو سال تک قید میں رکھا، اسی زمانہ میں اس نے یہ اشعار کہے:

اضاعوني وای فتی اضاعوا　　　ليوم كريهة وسداد ثغر

ان لوگوں نے مجھے ضائع کر کے ایک ایسے نوجوان کو کھو دیا ہے جو شدید جنگ کا مقابلہ کرنے والا اور سرحدوں کا محافظ تھا۔

وصبر عند معترك المنايا　　　وقد شرعت اسنتها بنحری

میں نازک موقعوں اور گھمسان کی جنگوں میں بھی ثابت قدم رہنے والا ہوں جبکہ مجھ پر نیزوں کی بارش ہوتی ہے

اجر في الجوامع كل يوم　　　فيا لله مظلمتي وصبري[3]

مجھے ہر روز محفلوں میں گھسیٹا جاتا ہے، ہائے رے میری مظلومی اور ہائے رے میرا صبر۔

بالآخر قید ہی میں انتقال ہوگیا۔

حارث بن خالد مخزومی | حارث بن خالد مخزومی اموی دور میں مکہ کا مشہور غزل گو شاعر اور

---

[1] کتاب الاغانی ج ۱، ص ۱۵ [2] فصول فی تطور الغزل والنسیب فی الشعر العربی ص ۲۶ - [3] کتاب الشعر والشعراء ج ۲ ص ۵۵ -

عمر بن ابی ربیعہ کا دوست تھا۔ وہ نسباً قرشی تھا۔ شروع ہی سے اس کا میلان لہو ولعب تعیش اور رندی و ہوسناکی کی طرف تھا۔ اس کو سیاست و حکومت کے معاملات سے بھی دلچسپی تھی۔ عبدالملک بن مروان کے عہد میں یہ مکہ کا گورنر بنا۔ مگر بعد میں معزول کر دیا گیا تھا۔

عمر کی طرح اس کی شاعری کا بھی خاص میدان غزل گوئی تھی۔ وہ عمر کا دوست بھی تھا۔ موسیقی، غنا اور عشق و محبت سے دونوں کو یکساں دلچسپی تھی اور وہ اسی کے رنگ میں شعر بھی کہتا تھا۔ خیرالدین زرکلی کے مطابق اس کا دیوان چھپ چکا ہے[1]۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

وترعی من الود الذی کان بیننا فما یستوی راعی الامانۃ والمبدی

باہمی الفت و محبت کا کچھ تو خیال کرو، امانت کا پاس کرنے والے اور خیانت کرنے والے دونوں یکساں نہیں ہو سکتے

وقل قد وعدت الیوم وعداً فانجزی ولا تخلفی لاخیر فی تخلف الوعد

(ذرا کوئی اس تک میرا پیغام پہنچا دے) اس نے آج جو مجھ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرے اور وعدہ خلافی نہ کرے کیونکہ وعدہ خلافی اچھی چیز نہیں ہے۔

وجودی علیّ الیوم وعدا فانجزیہ ولا تبخلی قد مت قبلک فی اللحد[2]

آج تم اپنے وصال کے وعدے کو اچھی طرح پورا کر دو اور اس میں کوئی بخالت نہ کرو کیونکہ میں تم سے پہلے قبر میں جانے والا ہوں۔

سنہ ۹۰ھ میں انتقال ہوا۔ (الاعلام ج ۲ ص ۲۵۴)

احوص بن محمد انصاری | عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن عاصم انصاری کا شمار بھی اموی دور کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ اس نے بھی عرجی کی طرح شروع میں شہرت کے لیے سیاست کے میدان میں قدم رکھا لیکن اموی حکمرانوں کی بے التفاتی دیکھ کر عمر بن ابی ربیعہ کی طرح

---

[1] الاعلام ج ۲ ص ۱۵۴ [2] عمر بن ابی ربیعہ جبور ج ۲ ص ۸۳۔

لہو و لعب اور تفریحی مشاغل کو زندگی کا مقصد بنا لیا اس کی تشبیب فحش گوئی اور ابتذال کی حد تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے اسے جلاوطن کر دیا گیا تھا[۱]

اس کی غزلیہ شاعری میں اباحیت پسندی کا رنگ ہے لیکن تشبیب میں فحش گوئی کا رنگ بھی ہے۔ اس نے مدح اور ہجو میں بھی طبع آزمائی کی۔ زبان و بیان کی پختگی اور الفاظ و اوزان کی بندش کے اعتبار سے اس کی شاعری میں کوئی نقص نہیں وہ لفظوں کے انتخاب میں تکلف سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ موقع و محل اور موضوع کے اعتبار سے موزوں الفاظ کا انتخاب کرتا تھا۔ اس نے لفظ و معنی دونوں کی خوبی پر زور دیا اور فطری سادگی، روانی اثر آفرینی اور شیرینی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ادور ولولا ان ارى ام جعفر   بابیاتکم مادرت حیث ادور

جب تک میں ام جعفر کو نہ دیکھ لوں میں برابر اپنے اشعار کے ذریعہ اسکے ساتھ تشبیب کرتا رہوں گا۔

وماکنت زوارا ولکن ذا الهوى   اذا لم یزر لا بد ان سیزور[۲]

اور میں ملاقات سے زیادہ بھی کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میں ہوس کا پجاری ہوں اور جب تک ملاقات نہیں ہو جاتی میں انتظار کروں گا۔

عبید اللہ بن قیس الرقیات[۳] ابن قیس رقیات کا شمار بھی اموی دور کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ سیاست میں وہ زبیری فرقے کا ہمنوا تھا[۴]۔ اس کی حمایت میں اس نے اموی حکمرانوں سے سیف و قلم دونوں کے ذریعہ جہاد کیا۔ اس نے غزل گوئی کو تفریح کے علاوہ اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و نفرت کے اظہار کا ذریعہ

۱؎ کتاب الاغانی ج ۳ ص ۲۵ ۲؎ کتاب الشعر والشعراء ج ۱ ص ۵۱۰ ۳؎ وہ "رقیۃ" نام کی تین عورتوں سے عشق کرتا تھا اسلیے رقیات کے لقب سے مشہور ہوا۔ کتاب الشعر والشعراء ج ۱ ص ۵۲۳ ۴؎ خزانۃ الادب بغدادی ج ۳ ص ۲۶۷۔

بھی بنایا۔ اس کی تشبیب میں اس کے سیاسی حریفوں کی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے جس سے اسکی اباحیت پسند طبیعت کو سکون بھی ملتا تھا اور اس کے انتقام و حسد کی آگ کو ٹھنڈک بھی ملتی تھی۔ اس کی تشبیب و غزل کا موضوع مختلف عورتیں تھیں۔ اموی حکمرانوں اور ان کی عورتوں کے خلاف بدگوئی کی بنا پر انھوں نے اس کا خون مباح کر دیا تھا۔ ایک سال تک کوفہ کی ایک عورت کثیرہ نے اسے پناہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ ام بنین کی سفارش پر ولید بن عبدالملک نے اسے جان کی امان دی[1]۔ اس کی شاعری پر عمر بن ابی ربیعہ کا زیادہ اثر ہے۔ وہ اپنے خیالات کو سیدھے سادے الفاظ لیکن موثر انداز میں بیان کرتا ہے۔

اموی دور میں غزل گوئی کا ایک تیسرا طبقہ بھی تھا یہ روایتی یا تقلیدی غزل گو شعرا کا طبقہ ہے۔ ان لوگوں نے بھی تشبیب کو موضوع بنایا لیکن تغزل کو مرکزی حیثیت نہیں دی، بلکہ جاہلی شعرا کی طرح (مدح، ہجو، فخر، حماسہ وغیرہ) کے تحت قصائد کے آغاز میں تشبیب سے متعلق اشعار کہے۔ اموی دور کے اس طرح کے شعرا میں جریر، اخطل اور فرزدق وغیرہ سر فہرست ہیں۔

---

[1] کتاب الشعر و الشعراء ج ۱ ص ۵۲۵۔

ایک ضروری تصحیح

معارف (دسمبر) ص ۴۲۲ سطر ۲ "انیسویں صدی کے اوائل" کی جگہ "۱۹ ویں صدی کے اواخر" پڑھا جائے۔

ص ۴۴۶ اسامہ بن منقذ کی جس جگہ گمشدہ تصنیف کے اکتشاف کا میں نے ذکر کیا ہے وہ "التاریخ البدری" نہیں "کتاب اخبار النساء" ہے۔ دونوں کے مصنف اسامہ ہیں اور ابھی حال تک دونوں مفقود تھیں۔ الحمد للہ کہ "اخبار النساء" کا ایک نسخہ غیر مرتب اور ناقص سہی ڈاکٹر احمد خاں صاحب (اسلام آباد) کے پاس دستیاب ہو گیا جس کے متعلق عزیز گرامی محمد عزیر شمس (مکہ مکرمہ) کو یقین ہے کہ یہ اسامہ کی تصنیف ہے۔

(پروفیسر) مختار الدین احمد (علی گڑھ)

قاضی سراج الدین ہندی

از

محمد عارف اعظمی عمری، دارالمصنفین

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں علوم و فنون کی ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے ہندوستانی علماء کی ضو فشانیوں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری علمی دنیا منور تھی۔ انہی علماء و فضلا میں قاضی سراج الدین ہندی بھی تھے جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ پھر وہ مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مصر پہونچے اور یہاں اپنے علم و فن کا سکہ بیٹھا دیا۔

نام قاضی سراج الدین کا نام عمر، والد کا نام اسحاق اور دادا کا نام احمد تھا اور ابو حفص ان کی کنیت تھی[1]

ابتدائی حالات ان کے ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ تاہم ان کی نسبت الغزنوی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کے آباء و اجداد کا اصل وطن غزنی تھا، جہاں سے یہ لوگ ہندوستان آئے اور یہیں ۷۰۴ھ میں قاضی سراج الدین کی ولادت ہوئی[2] صاحب تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ نے ان کا سن ولادت ۷۱۴ھ کے قریب بتایا ہے[3] جو صحیح نہیں معلوم

۱؎ الدرر الکامنہ/ابن حجر جلد ۳ ص ۱۵۴ ۲؎ نزہۃ الخواطر جلد ۲ ص ۹۵ ۳؎ تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ قاسم بن قطلوبغا ص ۱۲۰ مطبوعہ لیپزیک۔

ہوتا کیونکہ خود قاضی سراج الدین ہندی کی یہ تحریر موجود ہے کہ ان کا سن پیدائش ۷۰۴ھ ہے[1]

ابتدا میں قاضی سراج کی تعلیم کیسے اور کہاں ہوئی، اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا تاہم اسکی تصریح ملتی ہے کہ انھوں نے شہر دہلی میں امام وجیہ الدین رازی سے فقہ پڑھی[2]۔ اور ان کے علاوہ دہلی اور بدایوں کے متعدد علمائے کبار سے بھی کسب فیض کیا جن میں سراج الدین ثقفی، شمس الدین خطیب الدوی اور رکن الدین بدایونی کے اسمائے گرامی شامل ہیں[3]۔

قاضی سراج الدین کے یہ تمام اساتذہ شیخ ابو القاسم التنوخی کے اہم ترین شاگردوں میں تھے، جن کو حمید الدین ضریر سے اور ان کو کردی کے واسطہ سے صاحب ہدایہ سے شرف تلمذ حاصل تھا[4]۔ اس سے قاضی صاحب کی عظمت و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

سفر حجاز | ہندوستان میں حصول علم کے بعد قاضی سراج حج بیت اللہ اور حرمین کی زیارت کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں بھی انھوں نے علم و فن کی طلب و جستجو جاری رکھی۔ چنانچہ مکہ مکرمہ میں سدرہ نامی رباط کے ایک شیخ خضر سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف کا درس لیا، جنھوں نے قطب قسطلانی سے اور انھوں نے براہ راست مولف سے یہ کتاب پڑھی تھی[5]۔

قاہرہ میں آمد | سنہ ۷۴۰ھ میں قاضی سراج اپنے عہد شباب سے پہلے جب مصر پہونچے[6] تو

---

[1] ابن العماد شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۹ [2] ایضاً ص ۲۲۸ [3] تاج التراجم ص ۳۶، مفتاح السعادہ ص ۹۱ و نزہتہ الخواطر ص ۹۵ [4] نزہتہ الخواطر ج ۲ ص ۳۵۔۳۶۔۴۹۔۹۵۔۱۰۶ [5] تاج التراجم ۳۶ و نزہتہ الخواطر جلد ۲ ص ۶۹ [6] الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۴۔ قاضی صاحب کے مصر پہنچنے کا متعین سال تو معلوم نہیں ہو سکا۔ حافظ ابن حجر نے قبل الاربعین (سنہ ۷۴۰ھ سے پہلے) لکھا ہے مگر قاضی سراج کے مصری استاذوں میں ایک بزرگ احمد بن منصور کا نام ملتا ہے جن سے انھوں نے حدیث پڑھی تھی، حافظ ابن حجر ہی کی تصریح کے مطابق ان بزرگ کا انتقال ۷۳۵ھ میں ہوا تھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۷۳۵ھ سے بھی پہلے مصر پہنچ گئے تھے۔

ابتدا میں ان کا قیام وہاں کے حنفی مدرسوں میں رہا[1] اس عرصہ میں انھوں نے مصر کے ایک جلیل القدر عالم شیخ احمد بن منصور الجوہری سے حدیث پڑھی[2] حافظ ابن حجر کے بیان کے مطابق جب وہ مصر پہونچے تو صاحب علم و فضل ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے وہاں کے دوسرے علماء سے بھی اکتساب فیض کیا جن میں علاء الدین ابن ترکمانی مصنف الجوہر النقی اور شمس اصفہانی جیسے مشاہیر شامل ہیں[3] اور خود اہل مصر نے بھی قاضی سراج سے استفادہ کیا[4]

ذہانت اور بحث و مناظرہ سے دلچسپی قاضی سراج بڑے ذہین اور قوی الحافظہ تھے، ذہانت اور یاد داشت کا یہ حال تھا کہ انھیں اپنے مذہب کے فروع ہر وقت مستحضر رہتی تھیں[5] جزئیات پر عبور کی وجہ سے وہ بحث و مناظرہ میں فائق رہتے تھے جس سے ان کو خاص دلچسپی تھی وہ نہایت جری، بیباک، حاضر جواب اور فصیح البیان تھے، اپنی طلاقت لسانی حاضر جوابی اور جرأتمندی کی وجہ سے وہ اپنے حریفوں پر چھا جاتے تھے۔

فقہی مذہب قاضی سراج کو حنفی مذہب میں بڑا غلو تھا اور ان کی بدولت اس مذہب کو بڑا فروغ نصیب ہوا، متشدد حنفی ہونے کے باوجود وہ دوسرے مذاہب کے ائمہ کا بھی احترام کرتے تھے، ایک دفعہ ان کو بیماری سے شفا ہوئی تو اسے امام شافعی کی برکت اور فیض کا نتیجہ بتایا[6]

مصر میں انکی شہرت اور عہدہ قضاء پر تقرر رفتہ رفتہ قاضی سراج کی علمی شہرت مصر میں پھیل گئی۔ چنانچہ وہ فوج کے قاضی مقرر کیے گئے[7] اور یہ مصر کی تاریخ میں پہلا واقعہ تھا کہ کوئی حنفی

---

[1] تاریخ التراجم ص ۲۰۱ [2] ایضاً ص ۲۰۶ [3] الدرر ج ۳ ص ۱۵۴ البدر الطالع / شوکانی جلد اول ص ۵۰۵ [4] درر ج ۳ ص ۱۵۴ [5] الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۱۵۵ نزہۃ الخواطر ج ۲ ص ۹۶ [6] الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۱۵۵ [7] درر ج ۳ ص ۱۵۵۔

عالم اس منصب پر فائز ہوا[1] پھر جمال الدین ابن ترکمانی کے جو وہاں کے قاضی القضاۃ تھے نائب مقرر ہوئے[2] لیکن قاضی سراج محض کہنے کو نائب تھے دراصل عملاً وہی قاضی القضاۃ تھے[3] شعبان ۷۶۹ھ میں جمال الدین ترکمانی کا انتقال ہوا تو وہ باضابطہ قاضی القضاۃ بنا دیئے گئے اور اس منصب پر وہ تاحیات برقرار رہے[4] قاضی صاحب نے عہدہ قضا پر مامور ہونے کے بعد حنفی مذہب کو بڑا فائدہ پہونچایا۔

مصر میں عرصۂ دراز سے شافعی علما کو غلبہ و اقتدار حاصل تھا اس کے مقابلہ میں احناف کا زیادہ اثر و رسوخ نہ تھا، قاضی سراج نے سب سے پہلے اس کے خلاف سرگرم جد و جہد کی اور سرکاری سطح پر حنفیوں کو شوافع کا ہمسر بنا دیا جس کے لیے انھوں نے حکام سے باقاعدہ گفتگو کرکے یہ فرمان جاری کرایا کہ وہ بھی شافعی قاضیوں کی طرح طرحہ[5] پہنیں گے اور دارالخلافت کے علاوہ دوسرے شہروں میں بھی اپنے نائبین کا تقرر کریں گے اور حنفی خاندان کے یتیموں کی جائداد کے متولی بھی وہی قرار پائیں گے[6] جب کہ اس سے پہلے اس قسم کی اجازت وہاں حنفیوں کو حاصل نہ تھی۔

قاضی القضاۃ مقرر ہونے کے بعد قاضی سراج شافعی اوقاف کے بھی نگراں ہو گئے تھے۔ اس وقت انھوں نے جامع ابن طولون کی تولیت کے بارہ میں مصری حکام سے گفت و شنید کی اور انھوں نے وقف طرح کی تولیت حنفیوں کو واپس دلائی جو اس سے پہلے وہاں کے سربرآوردہ لوگوں کو حاصل تھی۔ کیونکہ اس کے واقف کی یہ شرط تھی کہ اس کے متولی احناف ہی ہوں گے[7]

---

[1] تاج التراجم ص ۱۲۰ [2] ایضاً و درر ج ۳ ص ۱۵۵ [3] شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۸ [4] درر ج ۳ ص ۱۵۵ تاج التراجم ص ۱۲۰ [5] یہ ایک مخصوص قسم کا لباس تھا جو سرکاری قاضی پہنتے تھے [6] درر ج ۳ ص ۱۵۵ [7] ایضاً۔

جامع طولون میں تفسیر کا درس | جامع طولونی میں شیخ بسطامی تفسیر کا درس دیتے تھے، ۷۷۱ھ میں ان کے انتقال کے بعد یہ خدمت[1] قاضی سراج کے سپرد ہوئی[2] جس کا سلسلہ مدۃ العمر جاری رہا ہوگا، صاحب کشف الظنون نے فن تفسیر میں ان کی ایک تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے[3] جس کے متعلق مزید تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

وفات | ۷ رجب ۷۷۳ھ کو قاضی سراج کا انتقال قاہرہ میں ہوا اور وہیں دفن کیے گئے[4]۔ بعض لوگوں نے سن وفات ۷۶۳ھ[5] اور تاریخ ۴ رجب بتلائی ہے[6]، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

ازدواج و اولاد | قاضی سراج کے ازدواج و اولاد کا کوئی تذکرہ کتابوں میں نہیں ملتا ہے، ابن قطلوبغا کا بیان ہے کہ انھوں نے شادی ہی نہیں کی تھی[7]۔

تصنیفات | قاضی سراج کو فقہ و افتا اور منطق و کلام پر بڑا عبور تھا[8]۔ ان کی بیشتر تصنیفات انہی موضوعات پر ہیں، ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ التوشیح :۔ یہ ہدایہ کی شرح تھی۔ انھوں نے ہدایہ کی دو شرحیں لکھی تھیں، ایک مطول اور ایک مختصر[9]۔ التوشیح ان کی مطول شرح ہے[10]۔ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے مکمل نہیں کر سکے تھے[11]۔ ان کی مختصر شرح بھی چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی[12] اور اس میں بحث و گفتگو کے لیے استدلال کا پیرایہ اختیار کیا تھا[13]۔

۲۔ الشامل :۔ اس کا موضوع بھی فقہ ہے، جس میں صرف فروعی مسائل کا بیان تھا[14]۔

---

[1] درر جلد ۳ ص ۱۵۵ [2] کشف الظنون جلد اول ص ۴۸۸ اسطنبول [3] تاج التراجم ص ۱۲۰ [4] درر جلد ۳ ص ۱۵۵ [5] الطبقات للکفوی بحوالہ الفوائد البہیۃ ص ۶۰ [6] البدر الطالع، شوکانی جلد اول ص ۵۰۵ [7] تاج التراجم ص ۱۲۰ [8] درر جلد ۳ ص ۱۵۴، البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۵ [9] تاج التراجم ص ۱۲۰ [10] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۵ [11] درر ج ۳ ص ۱۵۵ [12] تاج التراجم ص ۳۶ [13] ایضاً و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۳۵ [14] تاج التراجم ص ۳۶ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۲۵۔

۳۔ شرح المغنی :۔ یہ دو جلدوں میں شیخ عمر بن محمد خبازی کی المغنی فی اصول الفقہ کی شرح تھی۔[1]

۴۔ شرح البدیع :۔ اصول فقہ میں امام احمد بن علی الساعاتی البغدادی کی کتاب نہایۃ الاصول الی علم الاصول ایک مشہور کتاب ہے مصنف نے اس میں اس کی شرح کی ہے[2] جو چار جلدوں میں تمام ہوئی ہے[3]

۵۔ شرح الزیادات :۔ یہ امام محمدؒ کی کتاب الزیادات فی فروع الحنفیہ کی شرح تھی۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق یہ شرح نامکمل تھی[4]

۶۔ شرح الجامعین :۔ اسی طرح امام محمدؒ کی الجامع الکبیر اور الجامع الصغیر کی شرحیں بھی انھوں نے لکھی تھیں، مگر یہ ناتمام تھیں[5]

۷۔ زبدۃ الاحکام فی اختلاف ائمۃ الاعلام :۔ اس کتاب کا ذکر ابن قطلوبغا اور صاحب کشف الظنون دونوں ہی نے کیا ہے[6] بظاہر یہ اختلافی مسائل میں اعتدال اور توافق کے موضوع پر کوئی کتاب تھی۔

۸۔ شرح التائیہ ابن الفارض :۔ یہ شیخ عمر بن فارض حموی کے قصیدہ تائیہ کی شرح ہے، قاضی سراج ان سے بڑی عقیدت رکھتے تھے[7] کیونکہ یہ وحدۃ الوجودی صوفی تھے[8] اور قاضی سراج کو تصوف اور صوفیہ سے بڑی مناسبت تھی، چنانچہ مصر کے ایک حنفی المسلک عالم ابن ابی حجلہ نے جب ابن فارض کے قصیدہ کی تردید لکھی تو قاضی سراج

---

[1] تاج التراجم ص ۴۳ و کشف الظنون جلد دوم ص ۹۴۹، [2] کشف الظنون جلد دوم ص ۱۱۹۱ [3] تاج التراجم ص ۴۴ [4] جلد دوم ص ۹۶۲ [5] تاج التراجم ص ۴۳ [6] ایضاً و کشف جلد دوم ص ۹۵۰ [7] کشف جلد اول ص ۲۶۶ [8] شذرات الذہب جلد ۶ ص ۲۲۸-۲۲۹۔

نے اس پر سخت احتجاج کیا۔[1]

۱۰۔ الغرۃ المنیفۃ فی ترجیح مذہب ابی حنیفۃؒ :۔ یہ فقہ حنفی کی تائید میں امام رازی کی ایک فارسی کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ امام رازی نے یہ کتاب سلطان بہاء الدین کے لیے لکھی تھی قاضی سراج نے اس میں مزید دلائل وغیرہ کا اضافہ کرکے اسے امیر ضر غتمش کی فرمائش پر عربی میں منتقل کیا، یہ ترجمہ شعبان ۷۵۹ھ کو مکمل ہوا[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی سراج کو عربی کی طرح فارسی پر بھی پوری قدرت اور مکمل عبور تھا۔

قاضی سراج نے تصوف، کلام وعقائد اور خلافیات پر ان کے علاوہ بھی کتابیں لکھیں تھیں مگر اب وہ سب ناپید ہیں۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۴۰ و درر ج ۱ ص ۳۰۳ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۱۹۸۔

دار المصنفین کی نئی کتاب

تذکرۃ المحدثین (حصہ سوم)

تذکرۃ المحدثین حصہ سوم چھپ کر تیار ہوگئی ہے یہ دراصل ہندوستانی محدثین کی پہلی جلد ہے جس میں امام صغانی، شیخ علی متقی، شیخ محمد بن طاہر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، انکے فرزند شیخ نور الحق دہلوی اور ان دونوں کی اولاد و احفاد شیخ الاسلام محمد اور مولانا سلام اللہ محدث رامپوری وغیرہ کے فضل وکمال اور علمی و دینی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے اور حدیث میں انکے امتیازات اور کارنامے دکھائے گئے ہیں شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں علم حدیث کی اہمیت و ضرورت اور محدثین کی کاوش و دیدہ ریزی واضح کرنے کے بعد ہندوستان میں علم حدیث کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

مرتبہ :۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ قیمت :۔ ۴۵ روپیے

اخبار علمیہ

کوپرنیکس اور گلیلیو کے زمانہ سے سائنسدانوں نے حیرت انگیز اور تعجب خیز معلومات فراہم کرنے میں کمی نہیں کی ہے، اب ماہرین فلکیات نے ایک نئے ستارہ کے ظہور کی خبر دی ہے، یہ رقبہ میں روم کے برابر لیکن وزن میں ہمارے سورج سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ سائنسدانوں نے اس ستارہ کو کائنات کا عجوبہ قرار دیا ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ستارہ زمین کے برابر ایک اور روشن ستارہ کے گرد طواف کر رہا ہے، انسان کے علم میں اب تک اس قسم کا صرف ایک ستارہ تھا، یہ انکشاف آسٹریلیا کے ایک ریڈیو ٹیلی اسکوپ اسٹیشن پر ہوا اور سائنسی جریدہ نیچر میں اس کی تفصیلات شایع ہوئیں۔

سائنسدانوں کی حیرت اور مسرت ابھی کم نہ ہوئی تھی کہ انگلینڈ کی ڈرہم یونیورسٹی کے ماہرین فلکیات نے ایک نئی کہکشاں کے وجود کی خبر دی اور یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ آدھی کائنات پر محیط ہے پروفیسر رچرڈ ایلیف، ڈاکٹر جرمی النگورتھ اسمتھ اور مسٹر لان اسمال وغیرہ اینگلو ڈچ ولیم ہرشل ٹیلی سکوپ پر مزید طاقتور شیشوں کی مدد سے کہکشاں ABELL 963 کا نظارہ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں ان کو چند ہیولے نظر آئے جو دو کمانوں کے مانند تھے، غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ قوسین درحقیقت کسی اور نامعلوم کہکشاں کی روشنی کو ایک عدسہ کی شکل میں جذب کر کے اور کئی گنا زیادہ کر کے عمل انجذاب انعکاس میں مصروف ہیں، بعد میں ABELL 963 سے ا پنی

توت کشش سے اس ریشنی کو ہرشل ٹیلی سکوپ کے شیشوں پر منعکس کیا اس کے بعد ۲۰۰۰ ملین نوری سال کی اس کہکشاں کا دیدار ہمارے سائنسدانوں کو نصیب ہوا، مخروطی شکل کی خم دار اس کہکشاں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب یہ کائنات اپنی نوعمری میں تھی تب یہ اور اس جیسی دوسری انتہائی فاصلہ والی کہکشائیں وجود میں آئی تھیں۔ اب سائنسداں خوش ہیں کہ تخلیق کائنات کے سربستہ اسرار کا ایک اہم اشارہ انھوں نے پالیا ہے، ہرشل کی ۲ء۴ میٹر دوربین، دنیا کی تیسری سب سے بڑی مشاہداتی دوربین ہے۔

ایک طرف سائنسداں آیات سماوات کی دریافت میں مصروف ہیں تو دوسری طرف اور میدانوں میں بھی سائنسداں علم اشیاء کی جہاں گیری میں مشغول ہیں، واشنگٹن پوسٹ کے ایک تازہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ قمیص کے بٹن کے برابر کمپیوٹر اور ۹۰ میل فی گھنٹہ کے HAMPSTER سائنس اور ٹکنولوجی کے جدید ترین مدارج ہیں، سائنس کی ان ترقیوں کو دیکھتے ہوئے اختصار اور صغر حجم کے لیے اب منی اور مائکرو جیسے الفاظ غیر موزوں ہوگئے ہیں اب نانو NANO پیکو Pico اور فیمٹو FEMTO جیسے انتہائی چھوٹے آلات کا دور ہے جو ایک سکنڈ یا ایک میٹر کے لاکھوں، اربوں اور کھربوں حصے ہیں۔

کمپیوٹروں کے متعلق لاس ویگاس کی ایک خبر یہ ہے کہ ۱۹۹۵ء تک چھوٹی جیبی ڈائریوں کے مانند نہایت مختصر اور ہلکے کمپیوٹر تیار ہوجائیں گے جو اپنے مالک کی تحریر، آواز اور صاف و شفاف سہ رخی عکس کو ایک باریک سپاٹ پردہ پر ظاہر کردیں گے، ان کو جالی دار فون یا ریڈیو کی طرح تمام دنیا سے پیغامات، خبریں بلکہ دستاویزیں وغیرہ بھیجنے اور قبول کرنے کے قابل بھی بنا دیا جائے گا۔

قدیم زمانہ میں خاص طور پر بدھوں کے قدیم مخطوطات کی کتابت میں ایک خاص قسم کی روشنائی استعمال کی جاتی تھی جو سونے، چاندی، تانبہ، مرجان، موتی اور دوسرے قیمتی

معدنیات سے تیار کی جاتی تھی، اسے ہفت جواہر کہتے تھے۔ تبت کے قدیم بدھ صحیفوں گنجور، دنجور کی کتابت اسی ہفت جواہر روشنائی سے کی گئی ہے، سنہرے روغنی ورقوں پر قدیم منگولیائی حروف توس قزح کے تمام رنگوں کی طرح جھلملاتے تھے، اب روس کے سائنسدانوں نے اس قدیم العہد روشنائی کے عناصر کی ترکیب میں از سر نو کامیابی حاصل کر لی ہے۔

قدیم و جدید کی یہ دریافتیں حقیقت میں قدرت خداوندی کا مظہر اور درس عبرت و بصیرت ہیں، ویرونا کے شہر LAZiSE میں عرصہ ہوئے آثار قدیمہ کی تلاش میں گارڈا جھیل کی تہہ سے ایک روٹی کا ٹکڑا برآمد ہوا تھا اسے ویرونا کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں رکھ دیا گیا تھا۔ برسوں بعد اس میوزیم کی صفائی میں اس ٹکڑے کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ برونز عہد (۱۸۰۰ - ۱۵۰۰ ق۔م) یعنی دو ہزار سال قبل مسیح کا ہے، میوزیم کے ڈائرکٹر سارٹوینی کے الفاظ میں "یہ دریافت اپنی مدت اور کیفیت دونوں اعتبار سے بہت اہم ہے، ۱۰ اسینٹی میٹر کی یہ ایک سیاہ رنگ کی نرم روٹی ہے اور ماقبل تاریخ کی طباخی کی جھلک پیش کرتی ہے، خوردبین کے ذریعہ معلوم ہوا کہ یہ گیہوں، جو اور شاید اسی کے بیج سے تیار کی گئی تھی۔ گیہوں کا آٹا بھوسی سمیت ۔۔۔۔۔ اپنی صحیح ہیئت میں نظر آیا، ماہرین کے بقول یہ روٹی ہزاروں سال اس لیے محفوظ رہی کہ مرطوب آب و ہوا میں نباتات صحیح سلامت رہتے ہیں جبکہ تیزابی ماحول میں وہ زمین میں جذب ہو جاتے ہیں۔

سینۂ گیتی میں محفوظ و مدفون ان شہادتوں کی تصدیق و تکذیب کا اثر کسی نہ کسی حد تک تاریخی حقائق پر ضرور پڑتا ہے، ہندوستان میں اجودھیا میں بھی اسی مقصد کے تحت آرکائیولوجیکل سروے آف انڈیا کے تحت ۷۵ء سے ۸۰ء تک آرکائیولوجی آف دی رامائن سائٹس کے نام سے کھدائی کا ایک پروگرام عمل میں آیا، اس کے نگراں (ASi) کے سابق ڈائرکٹر جنرل پروفیسر بی لال تھے، انھوں نے اس تفتیش کی مکمل رپورٹ حکومت ہند کے

سپرد کردی لیکن یہ اب تک شایع نہ ہوسکی، البتہ انڈین آرکائیولوجی ریویو ۷۶-۷۵ء اور ۸۰-۷۹ء میں جو مجمل رپورٹ شایع ہوئی اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رام جنم بھومی کی فرضی جگہ پر پختہ اینٹوں کے ستونوں کا کہیں وجود نہیں تھا جن سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ جہاں اب بابری مسجد ہے وہاں کسی مندر کا وجود تھا اور جسے منہدم کردیا گیا تھا، اس کھدائی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا کی قدامت زیادہ سے زیادہ ساتویں صدی قبل مسیح کی ہے۔ اس رپورٹ کے متعلق ٹائمز آف انڈیا میں سکینہ یوسف خاں نے مزید معلومات بیان کیے ہیں۔

سکینہ یوسف خاں نے اسی اخبار کے ایک شمارہ میں ہندوستان کی مختلف قوموں قبیلوں اور ذاتوں کے متعلق بھی ایک دلچسپ رپورٹ دی ہے، ہندوستان کے ایک ادارہ انتھروپولوجیکل سروے آف انڈیا (ASI) نے پیپلز آف انڈیا پروگرام کے تحت ہندوستان کی تمام قوموں اور ذاتوں کا بالاستیعاب جائزہ لیا، یہ پروگرام ۲ اکتوبر ۸۵ء سے شروع ہوا اور ۵ سال کے بعد سنہ ۹۰ میں اسے مکمل کیا گیا اسمیں تقریباً ۵۰۰ ماہرین علم الانسان نے حصہ لیا، ۲۱،۵۳۶ لوگوں سے بات چیت کی گئی، ان میں ۵،۳۵۳ عورتیں بھی شامل ہیں، تقریب ۱۰۰ ورکشاپوں کا اہتمام کیا گیا، ان ماہرین نے ہندوستان کی ۴،۶۱۴، ۵ قوموں کا مطالعہ کیا، ان کی بنیاد حکومت ہند کی تیار کردہ فہرست کے مطابق ۴۸۰ شیڈول کاسٹ اور ۵۵۸ شیڈول ٹرائب پر تھی، ان کے علاوہ صوبائی حکومتوں کی فہرستوں کے مطابق ۱۱۳۱ بیک ورڈ طبقے اور منڈل کمیشن کی دوسری بیک ورڈ ذاتوں کے ۱۲۸۱ طبقے بھی اس میں شامل تھے۔ ماہرین نے ان تمام فہرستوں کو جانچنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اس وقت ہندوستان میں ۴۶۳۴ قومیں آباد ہیں، بعد میں ہم مرتبہ ذاتوں اور قبیلوں کی درجہ بندی اور بعض اقوام سے متعلق ذیلی قبیلوں کے احاطہ کے بعد یہ تعداد گھٹ کر ۲۵۸۰ رہ گئی، اب اس جدید و مکمل فہرست

کی رو سے اگلی ذات کے ہندوؤں میں ۳۰۰، او بی سی میں ۱۰۲۶، شیڈول کاسٹ میں ۴۳۹ شیڈول ٹرائبس میں ۴۲۶، مسلمانوں میں ۲۸۹ عیسائیوں میں ۲۰، جینیوں میں ۷۰، بدھوں میں ۱۰ اور یہودیوں اور پارسیوں میں بھی دس دس ذاتیں مقرر ہوئیں، ماہرین نے ان تمام قوموں اور ذاتوں کا مطالعہ کیا، چند دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر ۴۳۸ ضلعوں اور ۲۴ تہذیبی علاقوں میں ان کا جائزہ لیا گیا اور تقریباً ۵ ہزار صفحات میں ان کی تہذیب، ثقافت، بود و باش رہن سہن، سماجی تقسیم، عمل وراثت، شادی بیاہ، عورت کی حیثیت، مذہبی معاملات، مواشی جد و جہد وغیرہ موضوعات پر داد تحقیق دی گئی بعض نئے معلومات بھی سامنے آئے مثلاً عام خیال یہ تھا کہ ہندوستان کی زیادہ تر آبادی سبزی خور ہے لیکن اس سروے سے معلوم ہوا کہ ۸۰ فیصد آبادی غیر سبزی خور ہے اور گائے اور خنزیر کا گوشت عام طور سے کھایا جاتا ہے۔ شادی بیاہ میں عام تصور تھا کہ یہاں کی شادیاں طے کی جاتی ہیں مگر معلوم ہوا کہ زیادہ تر رواج مرضی کے مطابق رفیق حیات کے انتخاب کا ہے، اس عظیم سروے کا مکمل مجموعہ ۴۰۰ جلدوں میں مارچ ۱۹۹۶ء تک چھپ جانے کی توقع ہے، عمدہ بات یہ ہے کہ یہ تمام ذخیرہ کمپیوٹر میں آگیا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی ذات و قوم کے متعلق تمام معلومات چند لمحوں میں حاصل ہو سکیں گی۔

طبقہ واریت اور انسان کے خود ساختہ طبقاتی امتیاز و فرق کے طرفدار اور تاریخی حقائق یکسر رد کر دینے والے متعصب مزاج و ذہن نے اس وقت ملک کو تشدد و خوں ریزی کے جس عالم میں پہونچا دیا ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، ٹائمز آف انڈیا میں یورپ کے ایک مراسلہ نگار ولیم بیچ کا ایک خط .... شایع ہوا ہے جس میں انھوں نے ہندوستان اور فلسفہ ہندو مت سے شیفتگی کے اظہار کے بعد لکھا ہے کہ "اس وقت ہندو مذہب کے مغربی نقادوں اور نکتہ چینوں

کا دفاع دشوار ہو گیا ہے، جن کی سب سے بڑی نکتہ چینی یہ ہے کہ "ہندو مذہب کا فلسفہ جتنا قابل قدر اور وسیع ہے عملاً وہ اتنا ہی محدود ہے، اپنیشد کی نظر میں سارے انسان برہمن ہیں، ساری کائنات برہمن کے وجود میں ہے اس لیے وہ ساری کی ساری مقدس ہے، اس فلسفہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ایسا سماجی نظام ہو جو حریت و مساوات پر مبنی ہو، جس کا ہر جیو، شیو ہو، لیکن مغرب یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ بعید از انصاف ناہمواریاں جیسے ذات پات کا طبقاتی نظام اس معاشرہ میں کیسے رائج ہے، اگر آج سوامی ویویکانند زندہ ہوتے تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرم ہو جاتے، اگر ہندوؤں کا منصف اور شریف الطبع طبقہ اس نازک مرحلہ پر بیدار نہ ہوا تو پھر بدترین ہندوؤں کا تسلط عام ہوگا اور نفرت کی بنیاد پر جو تشدد ہوگا وہ پورے ہندوستان کی بربادی کا باعث ہوگا۔ ہندوؤں کو اب یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جس ورثہ اور عمل کی وہ تبلیغ کرتے ہیں اس کے وہ اہل بھی ہیں یا نہیں"

ولیم بیچ کا یہ سوال ہندوؤں کے علاوہ خود مسلمانوں کے لیے بھی ہے، گذشتہ دنوں مگدھ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور ممتاز اہل قلم جناب ڈاکٹر سید محمد حسنین صاحب پاکستان گئے تو انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اس کا مشاہدہ کیا، انکے مشاہدات کا یہ حصہ عبرت کے لائق ہے "سندھ کے اندرونی مشرقی اور پنجاب کے اندرونی غربی علاقے میں ایسی کورذہن مسلم آبادیاں اب بھی موجود بتائی گئی ہیں جہاں موروثی دولت کے تحفظ کی خاطر والدین بیٹی کی شادی انجام نہیں دیتے یا ان کا عقد قرآن مجید سے کر دیتے ہیں، یہ معاشرتی زبوں حالی، قدیم ہند کی ان تاعمر کنواریوں کی یاد دلاتی ہے جو دیوداسیاں بن کر زندگی گزار دیا کرتی تھیں۔"

ع۔ ص۔

وفیات

مولانا قاضی سجاد حسین

از

پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ

علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ اواخر دسمبر ۱۹۹۰ء میں قاضی سجاد حسین دہلی میں رحلت فرما گئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

قاضی صاحب اپنے وطن کرت پور ضلع بجنور میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ متوسطات کی تعلیم حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند گئے جہاں ۱۹۲۸ء میں ۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے علوم اسلامی کی تکمیل کی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی دیا اور اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ فراغت کے بعد انکا تعلق مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری دہلی سے ہوا جہاں وہ ۴۵ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تقریباً تیئس سال تک اسی مدرسے میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیے۔ وہ عرصے تک اس مدرسے کے صدر مدرس رہے۔ انکے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچی گی۔ ۱۹۶۷ء میں حکومت ہند نے انکے علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں پریسیڈنٹ ایوارڈ تفویض کیا۔

تالیف و تصنیف و ترجمے کا شوق انھیں ابتدا ہی سے تھا۔ انکی پہلی تصنیف جو راقم الحروف کی نظر سے گذری وہ "التوشیحات علی السبع المعلقات" تھی۔ سبعہ معلقہ کی اردو میں انکی یہ شرح عرصہ ہوا شائع ہوئی تھی، اب یہ عام طور پر نہیں ملتی۔ قاضی صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ترجمہ گلستان سعدی — سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۲ء

۲۔ ترجمۂ بوستان سعدی سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۱

۳۔ حاشیہ مالا بدمنہ مصنفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (متوفی ۱۲۲۵ھ) اسکے آخر میں کلمات الکفر منقول از فتاواے برہانی، وصیت نامۂ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، احکام اضحیہ و وجوب آن اور رسالۂ احکام عقیقہ از مولانا عبد الغفار لکھنوی بھی بطور ضمائم شامل ہیں۔ سب رنگ کتاب گھر دہلی ۱۹۵۶ء

۴۔ ترجمۂ دیوان حافظ، سب رنگ کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۳ء

۵۔ ترجمۂ مثنوی مولانا روم (دفتر اول تا ششم) سب رنگ کتاب گھر، دہلی ۱۹۷۴-۱۹۷۸ء

ان کے علاوہ قاضی صاحب نے دو فارسی و عربی متون مرتب کرکے شایع کیے ہیں:

۶۔ سراج الہدایہ (ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشت، ۷۰۷-۷۸۵ھ) یہ پروفیسر سید نور الحسن کی توجہ سے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شایع ہوئی، کتاب کا تعارف پروفیسر سید نور الحسن کے قلم سے ہے۔

۷۔ قاضی صاحب مرحوم و مغفور کی زندگی کے آخری پانچ سات سال، آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم و فقیہ شیخ عالم بن العلاء الانصاری الاندرپتی الدھلوی (متوفی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کی ضخیم کتاب الفتاوی التاتارخانیہ کی تصحیح و اشاعت میں گزرے۔ عہد فیروز شاہ (۷۵۲-۷۹۰ھ) کے اس مصنف نے تقریباً تیس ۳۰ فقہی مصادر سے (جن میں متعدد اب مفقود ہیں) یہ ضخیم کتاب مرتب کی تھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جب اس کتاب کی ترتیب کی خبر فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۰ھ) کو ملی تو اس نے مصنف سے خواہش ظاہر کی کہ وہ یہ کتاب اس کے نام پر فتاواے فیروز شاہی رکھیں۔ مصنف نے خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے بادشاہ وقت کی خواہش کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کے ایک سردار تاتارخاں کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھا۔ ہرچند نزھۃ الخواطر میں اس کا نام 'زاد السفر' یا 'زاد المسافرین' لکھا ہے (ممکن ہے پہلے مصنف کے ذہن میں یہی نام ہو) لیکن یہ کتاب "الفتاوی التاتارخانیہ"

ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

ڈاکٹر زبید احمد مرحوم نے اس کے نسخ قاہرہ، پشاور، رام پور، حیدرآباد، بانکی پور کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ قاضی صاحب کے پیش نظر چار نسخے رہے جن میں دو تو یہی آصفیہ حیدرآباد اور کتبخانہ خدابخش کے نسخے ہیں لیکن انھیں دو نئے نسخے بھی حاصل ہوگئے، ایک مفتی عبدالشکور کے کتب خانہ خاص میں اور دوسرا متحف سالار جنگ حیدرآباد میں۔ آخر الذکر دونوں نسخوں کا اکتشاف بعد کو ہوا اس لیے ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب ان کے ذکر سے خالی ہے۔ قاہرہ کا نسخہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، بہت اچھا نسخہ ہے، میں نے قاضی صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اس کا بھی عکس منگوالیں لیکن اس کی طرف توجہ کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ بہرحال نسخہ سالار جنگ مکمل نسخہ ہے جو ۹ جلدوں میں تمام ہوا ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، اس سے مرتب کو بہت مدد ملی ہوگی

فتاویٰ کی ضخامت کے پیش نظر نویں صدی ہجری میں اس کی تلخیص کا کام ہوا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے "ہندوستانی مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" میں لکھا ہے کہ علمائے حلب میں ایک عالم "ابراہیم بن محمد" نے اس کی تلخیص "الفوائد المنتخبہ" کے نام سے کیا ہے۔ وہ بظاہر مصنف کی تشخیص نہ کرسکے کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ ابراہیم بن محمد سے تو کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اس صدی کے مشہور عالم و مصنف اور محدث سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں جن کا نام برہان الدین ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن خلیل سبط ابن العجمی تھا۔ یہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور ان کی چند کتابیں شائع بھی ہوچکی ہیں۔ متعلقات حدیث پر ان کے تین رسالوں کے نسخے جو مصنف کی نظر سے گزرچکے ہیں اور جن پر ان کی ترمیمات و اضافات ہیں راقم اشاعت کے لیے مرتب کررہا ہے۔

خدا جزائے خیر دے پروفیسر سید نورالحسن کو جو ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ کے ماہروں میں ہیں اور جنھیں فیروز شاہ کے عہد سے خاص دلچسپی ہے، جب انھوں نے وزارتِ تعلیمات کا قلمدان سنبھالا تو "الفتاویٰ التاتارخانیہ" کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی ترتیب و تصحیح کی طرف قاضی سجاد حسین کو متوجہ کیا اور اس کی تصحیح و ترتیب و اشاعت کے لیے لاکھوں روپیے حکومت ہند سے منظور کرائے۔

پروفیسر سید نورالحسن نے جب وہ علی گڑھ میں صدر شعبۂ تاریخ تھے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ فقہی اہمیت تو اس کتاب کی ظاہر ہے لیکن اس کی تاریخی و معاشرتی اہمیت بھی ہے، اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ عہد فیروز شاہ میں کس قسم کے مسائل سے لوگوں کا سامنا تھا اور کس قسم کے استفسارات، عوام و خواص مفتیانِ دین سے کیا کرتے تھے، فتاوائے تاتارخانیہ سامنے آجائے تو ان مسائل پر روشنی پڑسکتی ہے۔

"الفتاویٰ التاتارخانیہ" کی طباعت کا اہتمام مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں ہوا، اس کی جلد اول و دوم ۱۹۸۴ء میں تیسری جلد ۱۹۸۶ء میں اور چوتھی ۱۹۸۷ء میں شایع ہوئی۔ ممکن ہے ایک آدھ جلد اور چھپی ہو لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزری۔ خدا کرے قاضی صاحب مغفور نے بقیہ مجلدات کی ترتیب و تصحیح کا کام مکمل کرلیا ہو اور کسی دن پوری کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوجائے۔

قاضی سجاد حسین کی وفات دہلی میں ۵ر جمادی الآخر ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۴ر دسمبر ۱۹۹۰ء کو ہوئی، دوسرے دن اینگلو عربک اسکول میں نمازِ جنازہ ہوئی اور حوض رانی دہلی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

مطبوعات جدیدہ

حدائق البیان فی معارف القرآن مرتبہ مولوی محمد عبدالغفور صاحب فاروقی۔
تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۵۰، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: جناب
مدحت کریم، محمد آباد گوہنہ، اعظم گڈھ، ۲۷۶۴۰۳۔

مولوی عبدالغفور صاحب مرحوم محمد آباد اعظم گڈھ رئیس اور اعلا سرکاری عہدیدار ہی نہیں بلکہ ایک صاحب علم و کمال شخص تھے، انکا ذاتی کتب خانہ انکی علمی دلچسپی کا ثبوت تھا، جسکی اکثر کتابیں بعد میں دارالمصنفین میں منتقل ہوگئی تھیں، انکو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی تھا، اس صدی کے اوائل میں مصباح الکلام فی طریق الاسلام اور حدائق البیان فی معارف القرآن کے نام سے انھوں نے دو اہم اور مفید کتابیں لکھی تھیں، لیکن اب یہ نایاب تھیں اس لیے انکے ایک لایق خلف جناب مدحت کریم نے موخرالذکر کا دوسرا اڈیشن شایع کیا ہے اس کے ۳۰ حدائق میں قرآن مجید کے حسب ذیل علوم و معارف بیان کیے گئے ہیں، وحی و قرآن، سورہ و آیت کا مفہوم، نزول قرآن کی کیفیت، سورتوں، آیتوں، کلمات، حروف و حرکات کی تعداد، مکی و مدنی سورتیں، قرآن کی پاروں اور منزلوں میں تقسیم، اوقاف، جمع و ترتیب قرآن، قرآنی رسم الخط، اعجاز قرآن، مشہور قرأتوں اور قاریوں کا تذکرہ، قرآن کے تحریف سے پاک ہونے، بسم اللہ کے جزاور آیت قرآن ہونے، نماز میں سورہ فاتحہ کے پڑھے جانے، امام ابوحنیفہؒ کے حالات و کمالات، تعوذ، قرآن و سنت، قرآن پڑھنے کے فضائل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن سورتوں کو نماز میں پڑھتے تھے، قرآن پڑھنے اور اسکی تعلیم دینے پر اجرت، اسکو یاد کرنے کی فضیلت اور یاد کرکے بھول جانے پر وعید، تلاوت قرآن کے آداب وغیرہ اور ان کے ضمن میں دوسرے ضروری اور متعلقہ

امور پر اپنے زمانہ کے انداز و رجحان کے مطابق سیر حاصل بحث کی ہے جن کو اب بھی پڑھنا فائدہ سے خالی نہیں، اس لحاظ سے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے۔

انڈیا ونس فریڈم ایک مطالعہ از پروفیسر ریاض الرحمان خاں شیروانی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۷۳، قیمت ۴ روپیئے

پتہ: اکیڈمک بکس، ڈگی روڈ، علی گڑھ۔

انڈیا ونس فریڈم مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی بڑی متنازعہ فیہ تصنیف ہے، اس میں زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے کی بنا پر مولانا سے اپنے اور بیگانے دونوں ناخوش ہیں، ایک گروہ تو اسے مولانا کی تصنیف ہی نہیں سمجھتا، پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی کے تعلقات مولانا سے پشتینی ہیں اور وہ خود بھی انکے عقیدتمند اور بڑے مزاج شناس ہیں، انھوں نے مولانا پر اتنا لکھا ہے کہ وہ ان پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کتاب میں انڈیا ونس فریڈم کے مشمولات کا جائزہ بڑی دقت نظر سے لے کر اس پر کی جانے والی تنقیدوں کا جواب دیا گیا ہے اور شروع ہی میں وثوق و اعتماد سے اسے مولانا کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، مصنف نے بتایا ہے کہ پروفیسر ہمایوں کبیر نے مولانا کے خیالات میں کوئی رد و بدل نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اردو کو انگریزی کا جامہ پہنا دیا ہے اور یہ کام بھی اپنے امکان بھر خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے، مولانا کی کتاب تین حصوں پر مشتمل تھی، زیر نظر کتاب بھی تین حصوں پر مشتمل ہے لیکن اس میں مولانا کی زندگی کے ان واقعات و حالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے درمیان پیش آئے، دراصل مولانا کی کتاب کا زیادہ اہم اور جاندار حصہ یہی ہے، کیونکہ ۳۵ء کی دستوری اصلاحات کے بعد کا

زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑا اہم ہے، اس زمانے میں ملک میں دو عام انتخابات ہوئے، اکثر ریاستوں اور مرکز میں کانگریس کی حکومت بنی، ملک کو آزادی ملی، اور وہ منقسم بھی ہوا، ہولناک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور گاندھی جی گولی کا نشانہ بنے، غرض اس دور میں متعدد دور رس نتائج کے حامل واقعات اور اہم سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے مولانا عینی شاہد ہی نہیں تھے بلکہ ان سب میں ان کا موثر اور فیصلہ کن حصہ رہا ہے، انڈیا ونس فریڈم میں ان پر جو بحث و تنقیح اور تبصرہ و تجزیہ کیا گیا ہے مصنف نے بڑی دیدہ ریزی سے اس کا جائزہ لیکر دکھایا ہے کہ عموماً مولانا کے اخذ کردہ نتائج انصاف و حقیقت پر مبنی ہیں اور ان سے انکی ہوشمندی، دور اندیشی، سیاسی بصیرت، خود اعتمادی، جرأت کردار اور قومی و وطنی سیاست میں انکے بلند درجہ کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا کے حریفوں اور حلیفوں نے ان پر جو چھینٹے ڈالے ہیں وہ انکی غلط بینی اور کج اندیشی کا نتیجہ ہیں، مصنف کی کتاب کا یہ حصہ اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب مولانا کی کتاب کا پہلا نامکمل اڈیشن ۱۹۵۹ء میں چھپا تھا، دوسرے حصہ میں انڈیا ونس فریڈم کے ان مندرجات کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۳۰ برس بعد ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئے تھے، لائق مصنف نے اسی جدید مواد کو دوسرے حصہ میں زیر بحث لائے ہیں ان میں مندرجۂ ذیل حضرات مولانا کی تنقید کا نشانہ بنے ہیں، ڈاکٹر سید محمود، شری کرشنن مینن، سردار ولبھ بھائی پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو، معترضین نے اور لوگوں سے قطع نظر کرکے صرف پنڈت جی سے اختلاف کو زیادہ ہوادی ہے، اس لیے لائق مصنف نے جہاں ان سے مولانا کے اختلاف کو درست بتایا ہے وہاں دونوں کے خوشگوار تعلقات بھی دکھائے ہیں، اس اشاعت کے بعد راج موہن گاندھی نے مولانا کے جواب میں جو کتاب لکھی ہے اسے بے وزن اور ناقابل اعتبار بتایا گیا ہے، انڈیا ونس فریڈم کی پہلی اشاعت کے بعد اس کا پہلا اردو ترجمہ

مرحوم رئیس احمد جعفری نے کیا تھا، اس میں ہر باب کے آخر میں مولانا پر جو تعریض کی گئی ہے، تیسرا حصہ اسی کا جواب ہے، یہ کتاب نصف صدی پیشتر کے واقعات کی ایک مستند تاریخی دستاویز ہے، جس سے اس دور کے قومی و سیاسی حالات کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس کی اشاعت پر مصنف و ناشر دونوں آفریں کے مستحق ہیں۔

صہبائے ہند از جناب نشور واحدی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۶۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۸۰ روپیے، پتہ: (۱) دانش محل، امین آباد لکھنؤ (۲) ماڈرن بکڈپو، بیکن گنج، کانپور۔

جناب نشور واحدی مرحوم فارسی و عربی کے منتہی اور اردو کے مشہور و ممتاز شاعر تھے، ان کی توجہ نثر نگاری کی طرف بھی رہی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کو زیادہ شہرت ملی۔ مشاعرے ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے اور وہ اپنے حکیمانہ خیالات سے زیادہ اپنے اچھے ترنم کی وجہ سے مشاعروں میں بہت پسند کیے جاتے تھے، نظم و نثر میں مرحوم کی کئی تصانیف شایع ہو چکی ہیں، ان کا پہلا مجموعہ کلام صہبائے ہند کے نام سے نصف صدی قبل طبع ہوا تھا جو دراصل مثنوی ہے، اس میں آفاقیات و ماورائیات کے عنوانات سے اہم فلسفیانہ خیالات پیش کیے گئے ہیں، ماورائیات میں مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کے بعض حصوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو کیفیت اور دلکشی سے خالی نہیں ہے، مجموعہ کے آخر میں غزلیں، رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار دیے گئے تھے، اب نشور مرحوم کے صاحبزادے جناب نیاز واحدی نے اس مجموعہ کو دوبارہ نہایت خوشنما حالت میں شایع کیا ہے، اس کے شروع میں وہ تمام تحریریں بھی اکٹھا کر دی گئی ہیں جو وقتاً فوقتاً نشور صاحب کے کلام کے بارے میں لکھی گئی تھیں، بنیادی طور پر نشور صاحب فلسفیانہ خیالات رکھنے والے

ایک شاعر تھے۔ ابتدا میں یہ رنگ اتنا نمایاں تھا کہ اس کی وجہ سے ان کی شاعری مشکل اور دقیق خیال کی جاتی تھی مگر پختگی کے بعد انھوں نے خود اس کو کم کرنے کی کوشش کی، غزلوں میں پاکبازانہ تخیل کے ساتھ رندانہ انداز اور بڑی سرمستی و سرشاری نظر آتی ہے اور نظموں اور غزلوں دونوں میں نشور صاحب کا مخصوص رنگ نمایاں ہے زبان وبیان کی نفاست و لطافت اور ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی شگفتگی و دلآویزی نے ان کی شاعری کو کیف و اثر سے معمور کر دیا ہے۔ ابھی تک نشور صاحب کی طرف استقدر توجہ نہیں دی گئی ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ نیاز صاحب نے یہ مجموعہ شایع کر کے نشور صاحب کے جلائے ہوئے چراغِ محبت کو ہواؤں کی زد سے بچانے کی کوشش کی ہے، خدا کرے وہ اس میں کامیاب ہوں۔

ختم المرسلین صلعم کے چراغ از جناب عروج زیدی مرحوم، مرتبہ جناب عرفان زیدی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۸۴ و ۱۹۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت بالترتیب ۷، ۱ و ۹ روپیے پتے: (۱) جناب عرفان زیدی، حضرت عروج زیدی روڈ، رام پور (۲) مکتبہ ذکری گھیر سیف الدین خاں رام پور۔

جناب عروج زیدی مرحوم کو نظم و نثر دونوں کا اچھا ذوق تھا اور انھوں نے دونوں میدانوں میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کا رجحانِ طبع شاعری کی طرف زیادہ تھا اور وہ ایک پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے، شاعری کی مختلف صنفوں میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، ان کی شاعری فکر و ریاض کا نتیجہ اور رکاکت و ابتذال سے خالی ہوتی تھی۔ ان کی بامقصد شاعری سے صحیح اور صالح رجحانات کو قوت و تازگی ملی تھی، ترقی پسندی اور جدیدیت کے شور و غوغا میں بھی وہ ان کی بے راہ روی سے محفوظ رہے، کلاسیکل شاعری کی

صحت مند روایتوں کو عزیز رکھنے کے باوجود انھوں نے ادب کے نئے رجحانات کا خیر مقدم کیا ہے، وہ موجودہ حالات اور لوگوں کے دکھ درد اور ماحول کی خرابیوں پر بھی نظر رکھتے تھے اور ان کا مداوا اور حل پیش کرتے تھے، پُر آشوب حالات میں بھی وہ ہمت و حوصلہ کو قائم رکھکر ہوا کے جھونکوں میں اپنے چراغِ دل کو روشن کر کے دوسروں کو روشنی دیتے رہے ہیں، ان کا پیرایہ اظہار اثر انگیز اور اندازِ بیان رچا ہوا ہے، اس لیے بوجھل موضوعات اور خشک خیالات کے باوجود ان کی شاعری پُر کیف اور تغزل کی لطافت و دلآویزی سے معمور ہوتی ہے، عروج صاحب کی زندگی میں ان کے کلام کے متعدد مجموعے چھپے ہیں جن سے ان خصوصیات کا پتہ چلتا ہے، اب ان کے لائق اخلاف خصوصاً بڑے صاحبزادے جناب عرفان زیدی نے اُن کی اِن غیر مطبوعہ تصانیفِ نظم و نثر کو شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جن کو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں، یہ دونوں مجموعے اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اول الذکر نعتوں پر مشتمل ہے، نعت بڑی مشکل اور نازک صنف سخن ہے اس میں ذرا بھی افراط و تفریط ناروا ہے لیکن عروج صاحب کی مشاقی نے یہ مرحلہ بھی طے کرنے کی کوشش کی ہے گو کہیں کہیں اس راہ میں نازک مقام آگئے ہیں۔ لائق مصنف فضائل کی ضعیف اور رطب و یابس روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں تاہم اس سے ان کی طبیعت کی سرشاری اور مستی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اور والہانہ تعلق کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، دوسرا مجموعہ غزلوں اور قطعات پر مشتمل ہے جو زیدی صاحب مرحوم کے حسن بیان اور رعنائی خیال کا نمونہ اور اچھے ادبی ذوق اور سنجیدہ و با مقصد شاعری کا ثبوت ہے، امید ہے کہ ان کے پہلے مجموعوں کی طرح انھیں بھی شہرت و قبولیت نصیب ہوگی۔

"ض"

جلد ۱۴۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۱ء عدد ۳

مضامین

مقالات

وفیات

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں فی شمارہ ۴ روپیے سالانہ چندہ ۴۰ روپیے

پاکستان میں سالانہ چندہ سو روپیے

چندہ بھیجنے کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس۔ ایم کالج، اسٹریچن روڈ، کراچی۔ پاکستان

بیرونی ملکوں میں ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر

" " بحری ڈاک سے " " ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر

شذرات

اتحادیوں اور عراق کے درمیان تقریباً ڈیڑھ ماہ تک جاری جنگ بعد از خرابی بسیار ختم ہوگئی عراق نے کویت کے بے قصور اور غریب عوام کو جس بے رحمی سے تہ تیغ کیا تھا اور وہاں جیسی سنگدلانہ تباہی مچائی تھی اس سے کہیں زیادہ عبرتناک حشر اس کا ہوا، اس کے لاکھوں فوجی قتل ہوئے، اور قیدی بنائے گئے، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ۔

ابھی تک نقصانات کی تفصیل پوری طرح سامنے نہیں آئی ہے، لیکن یہ طے ہے کہ عراق کو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی اور اسے ہر طرح کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا، ان سطروں کی تحریر کے وقت وہاں بے اطمینانی بڑھنے کی خبریں بھی آرہی ہیں، بغداد بارہا شکست و ریخت کا سامنا کرچکا ہے، لیکن اس نوعیت کی تباہی و بربادی کی مثال مشکل سے ملے گی جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہوسکے گی ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔

زمانے کے انقلابات بھی عجیب ہوتے ہیں، آج عراق کی تباہی پر اگر ایک طرف اس کے اور اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں اور ان کی گود میں پل کر جوان ہونے والے اسرائیل کو مسرت ہے تو دوسری طرف خود عراق کے ان بھائیوں کو بھی خوشی ہے جو کل تک ہر موڑ پر اس کا ساتھ دے رہے تھے، يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِى الْمُؤْمِنِيْنَ کا ایک نمونہ یہ بھی ہے فَاعْتَبِرُوْا يَآاُولِى الْاَبْصَارِ، آج کس کس بات کا ماتم کیا جائے؟ عراق کے قائد کی فکری و اعتقادی گمراہی، اپنوں سے اس کے کٹ جانے اور ہوش و تدبر سے عاری اس کی پالیسی کا، یا شماتتِ ہمسایہ، حکمت افرنگ سے عربوں کے دو نیم ہونے اور دام فرنگ میں پھنس کر اسرائیل کے قوت بازو بن جانے کا یا جس قوم کے افسانوں سے بوئے خوں آتی تھی، شمشیر و سنان سے اس کی دستبرداری اور طاؤس و رباب سے اس کی شیفتگی و گرویدگی اور دوسروں کی قوت و حکمت کے بل پر جوشِ جنوں میں اپنے ہی آشیاں کو پھونک ڈالنے کا ؎

اہلِ چمن بتاؤں میں کیا عالمِ جنوں　　　خود آشیاں کو آگ لگا دی بہار میں

عراق گذشتہ دس برس سے برادرکشی اور ناحق خونِ مسلم بہانے میں مصروف تھا، قوت کے گھمنڈ میں ایران کے بعد کویت اور پھر سعودی عرب کو وہ اپنا نشانہ بنانا ہی چاہتا تھا کہ خود اس کی باری آگئی، اور وہ یہ نوشتۂ دیوار نہ پڑھ سکا کہ ؏ صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک ایران سے اس کی جنگ بے نتیجہ رہی، کویت پر اس کا قبضہ کھلی ہوئی جارحیت تھی اور امریکہ سے مبارزت اس کی بڑی غیر دانشمندانہ حرکت تھی جس کا وہی نتیجہ ہوا جو خودکشی کا ہوتا ہے، یہ محض خوش فہمی تھی کہ کویت کی طرح وہ امریکہ کو بھی زیر کر لے گا، اسباب و علل کی دنیا میں نہ اس طرح کے معجزات ظاہر ہوا کرتے ہیں، اور نہ حقائق لوگوں کے جذبات کے ماتحت ہوا کرتے ہیں، لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَن يَعْمَلْ سُوٓءًا يُجْزَ بِهِ، عراق اپنی تباہی کا خود ذمہ دار ہے، لیکن ظلمتِ ایام کی اس سازش میں غیروں کے ساتھ اپنوں کی شرکت نے نوا کو تلخ تر اور درد دل کو سوا کر دیا ہے ؎

ہر کس از دست غیر نالہ می کند　　　سعدی از دست خویشتن کند فریاد

عربوں کیلئے بھی یہ لمحۂ فکریہ ہے، عراق کی ناکامی میں ان کی کوئی مثبت کامیابی نہیں ہے، کویت کے حصہ میں بھی کم بربادی نہیں آئی ہے، اور سعودی عرب کا قرض حاصل کرنے کے لیے مجبور ہونا اور دوسروں کا دست نگر ہونا ایسی تجارت ہے جس میں اس کا سراسر خسارہ ہے، آخر مسلم ممالک حبل اللہ کو چھوڑ کر حبل الناس کے سہارے کب تک زندہ رہیں گے؟ کیا جنھوں نے عراق کو پسپا کیا ہے وہ ان کو مضبوط اور خوشحال دیکھنا پسند کریں گے؟ اگر اس جنگ میں عراق نے صرف کھویا ہی کھویا ہے تو اس سے ملا کس کو ہے؟ کیا کویت اور سعودی عرب کو، یا ان کو جن کا مقصود تفریقِ ملل ہے؟ آج کے عربوں کے مددگار کل ان کے ساتھ بھی عراق ہی جیسا معاملہ کر سکتے ہیں ؎

فقل للشامتین بنا افیقوا سیلقی الشامتون کما لقینا

(ترجمہ) ہماری مصیبت پر خوش ہونے والے ہوشیار رہیں کہ ان پر بھی جلد ہی وہ افتاد پڑنے والی ہے جو ہم پر پڑی ہے۔

پورے ہندوستان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عالم عرب اور دنیائے اسلام کے حالات و مسائل سے سب سے زیادہ باخبر ہیں، ان کی صدارت میں ۳ر مارچ کو مسلم انٹلکچول فورم کا ایک جلسہ خلیج کی صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لیے لکھنؤ میں ہوا، انھوں نے بتایا کہ جنگ سے اسلام کی شہرت، اس کی دعوت اور اخلاقی تعلیم کو نقصان پہنچا اشاعت دین کے کام میں رکاوٹ اور ہندوستان اور دنیا میں مسلمانوں کی رسوائی ہوئی، ہندوستان کے مسلمانوں کے شعور کی کمی اور جذباتیت کے مظاہرے پر مولانا نے افسوس ظاہر کیا، مولانا محمد رابع ندوی، مولانا حبیب ریحان ندوی اور مولوی عبیداللہ کوٹی نے بھی مسئلہ کی اہمیت بتائی، فورم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر یونس نگرامی نے تجویزیں پڑھیں جن میں کویت کی آزادی بحال ہونے پر مبارکباد، امریکی فوجوں کی واپسی، امت کی شیرازہ بندی، عربوں کو فوجی طاقت میں اضافہ کرنے اور تعیش پسندی چھوڑنے وغیرہ کا ذکر تھا، مولانا عبدالنور کی نظامت نے کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

۵ر مارچ کو بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت اور الہلال کی قومی اور مختلف النوع خدمات پر مذاکرہ ہوا، راقم الحروف، جناب عشرت علی صدیقی اڈیٹر قومی آواز لکھنؤ، جناب تاج الدین اشعر اڈیٹر قومی مورچہ بنارس، بنارس کے میئر مسٹر ابو صالح انصاری اور وائس چانسلر پروفیسر آر۔ پی رستوگی نے بحث و گفتگو میں حصہ لیا، شعبۂ صحافت کے صدر راے۔ کے بنرجی کے خلوص اور ڈاکٹر حسین اجمل اعظمی، ریڈر شعبۂ صحافت کی سرگرمی اور لگن سے یہ مذاکرہ دلچسپ اور کامیاب رہا۔

مقالات

مولانائے روم اور اُن کی مثنوی معنوی

از

مولانا محمد عبد السلام خاں سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رامپور

رومی کا عہد ساتویں صدی ہجری مسلمانوں کی تاریخ کا نہایت پر آشوب عہد ہے، مسلم معاشرہ افرا تفری، بے چینی، خوف و ہراس اور مایوسی کا شکار تھا، روز کے خون خرابے، آئے دن سلطنتوں کا بننا بگڑنا، دن رات کا تماشا تھا، جس سر پر آج تاج ہے کل اسی سر پر ٹھوکروں کا راج ہے، پھر تاتاری سیلاب بلا عذاب الٰہی کی صورت مسلم آبادیوں کو روندتا، تہ و بالا کرتا الگ بڑھا چلا آرہا تھا۔ بلا پر بلا غالب، قحط، وبائیں، زلزلے، گویا چاروں طرف قیامت صغریٰ بپا تھی۔ شیعہ سنی فرقہ وارانہ جنون اور عوام ایک دوسرے کے خون کے پیاسے، ایک ہی باپ دادا کی اولاد تخت و تاج کے لیے بر سر پیکار، ایک طرف نشاط و طرب کی محفلیں دوسری طرف آہ و بکا کی ماتمی صفیں، بے دھڑک عیش و عشرت اور بے نہایت فقر و فاقہ، سماج اخلاقی طور پر دیوالیا نہ ہوتا تو کیا ہوتا، عزتیں لٹ رہی ہوں تو شرم و غیرت کا کب تک لبادہ؟ یہ تھی ساتویں صدی۔

ان حالات میں زندگی کے متعلق رویوں کا بدل جانا، نصب العینوں میں انقلاب آجانا فطری تقاضا تھا، عمل کے بجائے بے عملی کا غلبہ، حرکت سے فرار، سکون کی تلاش، مادی اقتدار کے ایوانوں سے منھ موڑ کر روحانی عافیت کے زاویوں کی طرف رخ کرنا تحول کا اقتضا تھا، پادشاہوں کے قلعے خطرہ بن گئے تھے اور درویشوں کی درگاہیں مامن، شیوخ کی خانقاہیں عام و خاص کا مرجع بن گئیں، بزرگان حلقہ سے عقیدت، صوفی سلسلوں سے نسبت، مشائخ سے حصول برکات، پیروں سے امید کرامات عام مزاج بنتا جارہا تھا تو تعجب کیا، طریق خانقاہی کو فروغ ہورہا تھا تو حیرانی کیوں؟ اس گرد و پیش میں مولائے روم ایک مشہور، معزز اور صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آغوش تصوف میں پرورش پائی اور عقیدت و احترام کے ہاتھوں پروان چڑھے۔

مولائے روم کا نام و نسب اور ولادت | مولانا کا نام محمد، لقب جلال الدین، خطاب خداوندگار اور عرف مولائے روم تھا، ہندوستان میں مولانائے روم سے عام شہرت ہے۔ والد کی طرف سے صدیقی تھے، والدہ مشہور بزرگ ابراہیم ادہم کے سلسلۂ اولاد میں تھیں اور نسلاً ترکی تھیں[1]۔ والد کا نام محمد، لقب بہاء الدین ولد اور سلطان العلماء خطاب تھا۔ بلخ کے نہایت محترم خاندان کے فرد، موقر عالم دین اور باکرامت شیخ طریقت تھے، عوام میں غیر معمولی اثر و نفوذ اور ملوک و امراء میں خصوصی رعب و ہیبت تھی۔

مولانا ۶؍ ربیع الاول ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء کو بلخ میں پیدا ہوئے، سید برہان الدین محقق ترمذی، سلطان العلماء کے خلیفہ خاص کو ان کی تربیت و تعلیم سپرد ہوئی اور بلخ کی سکونت ترک کرنے تک وہی مولانا کے اتالیق خاص رہے اور پوری توجہ سے انکی تربیت و تعلیم میں کوشش کی۔

---

[1] الاعلام، از زرکلی، جلد ہفتم، تحت جلال الدین محمد بن محمد ص ۲۵۸۔

مولانا اور ان کے خاندان کی بلخ سے ہجرت سلطان العلماء کے غیر معمولی قبول عام اور اثر و نفوذ سے خوف زدہ ہو کر علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے قلعے اور خزانے کی کنجیاں یہ کہلوا کر بھجوائیں کہ سلطنت تو در حقیقت آپ کی ہے، میرے پاس تو صرف کنجیاں ہیں۔ انھیں بھی آپ ہی رکھیے، سلطان العلماء مطلب سمجھ گئے اور کہلوا دیا کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں اور ۶۱۷ھ سے کچھ پہلے خاندان سمیت بلخ سے ہجرت کر گئے۔ نیشاپور، بغداد، حجاز، دمشق، ملاطیہ، آق شہر اور لارندہ میں رہتے بستے ۶۲۶ھ میں قونیہ میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی۔

مولانا کی تعلیم و تربیت مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت تو محقق ترمذی کی نگرانی اور اتالیقی میں ہوئی تھی لیکن وہ بلخ سے مولانا کے خاندان کی ہجرت سے پہلے ہی جا چکے تھے، چنانچہ مولانا کی تعلیم و تربیت اب براہ راست والد سے ہی متعلق ہو گئی۔ مولانا قریب قریب ۱۵ سال والد کے ساتھ رہے، اسی سفر و اقامت کے درمیان اپنے والد سے مروجہ علوم کی تحصیل کرتے رہے۔ قیام بغداد کے زمانے میں کچھ دنوں مدرسۂ مستنصریہ میں بھی پڑھا[1] لیکن بغداد میں زیادہ دنوں قیام نہیں رہا اور والد کے بغداد چھوڑنے پر انھیں بھی مستنصریہ چھوڑنا پڑا اور حج کے ارادے سے یہ کارواں حجاز روانہ ہو گیا، غرض یہ کہ باطنی معارف کے ساتھ ساتھ ظاہری تعلیم بھی مولانا نے والد کی خدمت میں رہ کر حاصل کی۔

مولانا کا پہلا عقد مولانا کا خاندان لارندہ میں قیام پذیر تھا کہ ۶۲۱، ۶۲۲ھ میں جبکہ مولانا کی عمر اٹھارہ[2] سال تھی، سمرقند کے ایک باعزت، شریف اور دولت مند خاندان

---

[1] الاعلام از زرکلی جلد ہفتم تحت جلال الدین محمد بن محمد ص ۲۵۹۔

خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی گوہر خاتون سے آپ کا عقد ہو گیا۔ مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے سلطان ولد محمد ۶۲۳ھ میں اور ان کے بعد دوسرے صاحبزادے علاء الدین احمد بھی ان ہی بی بی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہاں قریب قریب سات سال مولانا مقیم رہے، غالباً اسی اثنائے سفر و قیام میں ان بی بی کا انتقال ہو گیا۔

قونیہ میں توطن ۶۲۶ھ میں یہ خاندان وسط اناطولیہ کے پہاڑی خطے قونیہ پہنچا اور یہیں مستقلاً آباد ہو گیا۔ قونیہ پہنچتے پہنچتے مروجہ علوم درسیہ کی ایک حد تک تکمیل ہو چکی تھی۔ سلطان العلماء کی خواہش تھی کہ مولانا مسند درس آراستہ کریں۔

مدرسۂ خداوندگار کی بنا مولانا کے والد کی تجویز پر بدرالدین گہرتاش وزیر دار نے مولانا کے درس کے لیے انہیں کے نام پر "مدرسۂ خداوندگار" کے نام سے درس گاہ تعمیر کرادی اور مصارف کے لیے ایک وقف بھی قائم کر دیا۔ مدرسے کے ساتھ طلبہ اور خدام کے رہنے کے لیے کوئی دارالاقامہ نہ تھا، چنانچہ مولانا کے زمانے میں وہ بھی بن گیا۔

سلطان العلماء کی وفات اور مولانا کی جانشینی قونیہ کو وطن بنا لینے کے بعد سلطان العلماء زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنے پائے اور دو سال بعد ہی ۶۲۸ھ میں رحلت کر گئے۔ مولانا والد کی وفات کے بعد بادشاہ اور دوسرے مخلصین و مریدین کے اصرار پر والد کے جانشین نامزد کر دیے گئے اور مدرسۂ خداوندگار میں درس کے ساتھ ساتھ اب مریدین کی رشد و ہدایت اور باطنی تربیت بھی متعلق ہو گئی۔

محقق ترمذی کی قونیہ میں آمد اور مولانا کی بیعت ۶۲۹ھ میں محقق ترمذی مولانا کے اتالیق اور سلطان العلماء کے خلیفۂ خاص اپنے پیر کی زیارت کے لیے قونیہ آئے لیکن

سلطان العلماء کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی زیارت تو نہ ہو سکی، مولانا اس زمانے میں لارندہ تھے، محقق ترمذی نے مولانا کو خط لکھ کر قونیہ بلا لیا اور ان سے کہا کہ تم علوم ظاہری میں تو اپنے والد سے بڑھ گئے لیکن معارف باطنی جو تمھارے والد کا حال تھا ان کی تکمیل کے بغیر والد کے صحیح جانشین نہیں بن سکتے، مولانا ان کے اشارے کو سمجھ گئے اور ان کے مرید ہو کر انکی زیر تربیت معارف باطنی کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور نو سال محقق ترمذی کی مدت حیات تک ان سے اکتساب فیض کیا اور قال کے ساتھ والد کے حال کو بھی پہنچایا۔

طلب علم اور مولانا کا سفر شام اپنی باطنی تکمیل کے ساتھ ہی ساتھ مولانا کو علوم ظاہری کی مزید تکمیل پر بھی توجہ ہوئی اور ان کی تکمیل کے لیے مولانا نے ۶۳۰ھ میں شام کا سفر کیا اور حلب کے مدرسہ حلاویہ میں رہ کر وہاں کے مختلف مدارس میں متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا، مشہور محدث و مورخ کمال الدین عمر بن احمد ابن عدیم متوفی ۶۶۰ھ سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔ ۶۳۱ھ میں دمشق کے مدرسہ مقدسیہ میں آگئے اور یہاں کے اساتذہ سے استفادہ کیا یہیں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، صدرالدین حموی، اوحدالدین کرمانی، اور صدرالدین قونوی اکابر شیوخ سے صحبتیں رہیں۔ ۳۵-۶۳۶ھ میں قونیہ واپس آگئے اور درس و ارشاد کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔

مولانا کا فضل و کمال، معمولات اور وضع قطع مولانا اپنے عہد کے مشہور حنفی عالم تھے، اصل مذہب خلافیات اور فقہی جزئیات پر کامل عبور تھا، علم کلام میں ان کی مہارت پر ان کی مثنوی شاہد ہے، دوسرے مروجہ علوم میں انکی وسعت نظر مسلمہ تھی، علم حقایق میں تو وہ مجتہد مطلق تھے۔

مریدین کی تربیت و ارشاد کے ساتھ ساتھ آپ کا شغل خاص درس و تعلیم تھا،

خواجہ شرف الدین سمرقندی کی صاحبزادی گوہر خاتون سے آپ کا عقد ہوگیا۔ مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے سلطان ولد محمد سنہ ۶۲۳ھ میں اور ان کے بعد دوسرے صاحبزادے علاء الدین احمد بھی ان ہی بی بی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہاں قریب قریب سات سال مولانا مقیم رہے، غالباً اسی اثنائے سفر و قیام میں ان بی بی کا انتقال ہوگیا۔

قونیہ میں توطن

سنہ ۶۲۶ھ میں یہ خاندان وسط اناطولیہ کے پہاڑی خطے قونیہ پہنچا اور یہیں مستقلاً آباد ہوگیا۔ قونیہ پہنچتے پہنچتے مروجہ علوم درسیہ کی ایک حد تک تکمیل ہوچکی تھی۔ سلطان العلما کی خواہش تھی کہ مولانا مسند درس آراستہ کریں۔

مدرسۂ خداوندگار کی بنا

مولانا کے والد کی تجویز پر بدر الدین گہرتاش وزیر دار نے مولانا کے درس کے لیے انہیں کے نام پر مدرسۂ خداوندگار کے نام سے درس گاہ تعمیر کرادی اور مصارف کے لیے ایک وقف بھی قائم کردیا۔ مدرسے کے ساتھ طلبہ اور خدام کے رہنے کے لیے کوئی دار الاقامہ نہ تھا، چنانچہ مولانا کے زمانے میں وہ بھی بن گیا۔

سلطان العلماء کی وفات اور مولانا کی جانشینی

قونیہ کو وطن بنالینے کے بعد سلطان العلماء زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہنے پائے اور دو سال بعد ہی سنہ ۶۲۸ھ میں رحلت کرگئے۔ مولانا والد کی وفات کے بعد بادشاہ اور دوسرے مخلصین و مریدین کے اصرار پر والد کے جانشین نامزد کر دیے گئے اور مدرسۂ خداوندگار میں درس کے ساتھ ساتھ اب مریدین کی رشد و ہدایت اور باطنی تربیت بھی متعلق ہوگئی۔

محقق ترمذی کی قونیہ میں آمد اور مولانا کی بیعت

سنہ ۶۲۹ھ میں محقق ترمذی مولانا کے اتالیق اور سلطان العلما کے خلیفۂ خاص اپنے پیر کی زیارت کے لیے قونیہ آئے لیکن

سلطان العلماء کا انتقال ہو چکا تھا، ان کی زیارت تو نہ ہو سکی، مولانا اس زمانے میں لا رندہ تھے، محقق ترمذی نے مولانا کو خط لکھ کر قونیہ بلا لیا اور ان سے کہا کہ تم علوم ظاہری میں تو اپنے والد سے بڑھ گئے لیکن معارف باطنی جو تمہارے والد کا حال تھا ان کی تکمیل کے بغیر والد کے صحیح جانشین نہیں بن سکتے، مولانا ان کے اشارے کو سمجھ گئے اور ان کے مرید ہو کر انکی زیر تربیت معارف باطنی کی تکمیل میں مصروف ہو گئے اور نو سال محقق ترمذی کی مدت حیات تک ان سے اکتساب فیض کیا اور قال کے ساتھ والد کے حال کو بہم پہنچایا۔

طلب علم اور مولانا کا سفر شام اس باطنی تکمیل کے ساتھ ہی ساتھ مولانا کو علوم ظاہری کی مزید تکمیل پر بھی توجہ ہوئی اور ان کی تکمیل کے لیے مولانا نے سنہ ۶۳۰ھ میں شام کا سفر کیا اور حلب کے مدرسہ حلادیہ میں رہ کر وہاں کے مختلف مدارس میں متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا، مشہور محدث و مورخ کمال الدین عمر بن احمد ابن عدیم متوفی سنہ ۶۶۰ھ سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔ ۶۳۱ھ میں دمشق کے مدرسہ مقدسیہ میں آگئے اور یہاں کے اساتذہ سے استفادہ کیا یہیں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، صدرالدین حموی، اوحدالدین کرمانی اور صدرالدین قونوی اکابر شیوخ سے صحبتیں رہیں۔ سنہ ۳۵-۶۳۶ھ میں قونیہ واپس آگئے اور درس و ارشاد کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔

مولانا کا فضل و کمال، معمولات اور وضع قطع مولانا اپنے عہد کے مشہور حنفی عالم تھے، اصل مذہب خلافیات اور فقہی جزئیات پر کامل عبور تھا، علم کلام میں ان کی مہارت پر ان کی مثنوی شاہد ہے، دوسرے مروجہ علوم میں انکی دستگاہ مسلمہ تھی، علم حقایق میں تو وہ مجتہد مطلق تھے۔

مریدین کی تربیت و ارشاد کے ساتھ ساتھ آپ کا شغل خاص درس و تعلیم تھا،

عوام کی رشد و ہدایت کے لیے وعظ و تذکیر بھی معمولات میں داخل تھے۔ فتویٰ نویسی ان کا منصبی فریضہ تھا جس کے لیے سرکاری خزانہ سے ایک دینار روزینہ مقرر تھا اور مولانا حالت وجد میں بھی اس فریضے سے غفلت نہیں برتتے تھے۔

مولانا کی عام وضع قطع عالمانہ اور مرشدانہ تھی، سر پر عمامہ، کشادہ آستینوں کی عبا لباس تھا، زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، وعظ و ارشاد، درس و افتا اور مطالعۂ کتب یہی مولانا کی زندگی تھی، سماع سے پرہیز، شعر شاعری سے بے تعلقی، وجد و حال سے بے گانگی یہ سلوک تھا، ہر عمل سے عالمانہ وقار اور مشایخانہ رکھ رکھاؤ نمایاں تھا۔ سنہ ۶۴۲ھ کے وسط تک مولانا کا یہی انداز قائم رہا۔

شمس تبریز سے ملاقات

۲۶ جمادی الاخریٰ سنہ ۶۴۲ھ تھی مولانا مدرسے سے واپس ہو رہے تھے کہ سرائے کے چبوترے پر شمس تبریز سے اچانک ملاقات ہوگئی، کچھ متصوفانہ سوال جواب ہوئے پھر معانقہ ہوا کہ مولانا کی حالت دگرگوں ہوگئی، عالمانہ ثقاہت، مشایخانہ وقار رخصت ہوئے، رندانہ جوش و خروش طاری ہوا، اب مولانا، مولانا نہ تھے۔ اسی حال میں مولانا انہیں ساتھ لیے گھر آگئے اور دونوں مہینوں ایک حجرے میں معتکف رہے، احوال و مواجید کا دور شروع ہوگیا۔ اس خلوت کدے میں صلاح الدین زرکوب کے علاوہ جو محقق ترمذی کے مرید اور مولانا کے فیض یافتہ تھے کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔

شمس تبریز کی صحبت نے مولانا کی کایا پلٹ دی، درس و تدریس چھوٹ گئے، وعظ و تذکیر ختم ہوئے، کتابیں دفتر بے معنی ہوئیں، تلقین و ارشاد سرمستی کی نذر ہوئے، عالمانہ اور فقیہانہ لباس اتر گیا۔ سماع و قوالی، دست افشانی، رقص و حرج

نے معمولات کی حیثیت اختیار کرلی۔ شاعری کا فطری مذاق جو علم کے وزن اور مشیخت کے بوجھ میں دبا ہوا تھا ان کے اٹھتے ہی ابھر آیا اور غزلوں اور رباعیوں کی صورت میں نمایاں ہوگیا۔

شمس تبریز سے معتقدین کی دشمنی اور انکا قونیہ سے فرار اور پھر آمد

ایک اجنبی سے مولانا کا یہ شغف اور اس کی صحبت کا یہ انقلابی اثر معتقدین ٹھنڈے پیٹ کیسے برداشت کرلیتے انہیں شمس تبریز سے جلن اور پھر دشمنی ہوگئی۔ شمس تبریز نے اندر اندر سلگتی اس آگ کو محسوس کرلیا اور یکم شوال ۶۴۳ھ کو خفیہ قونیہ سے نکل گئے۔ مولانا نے ان کے اچانک غائب ہوجانے کے درپردہ اسباب بھانپ لیے اور سب سے تعلق ختم کرلیا۔ یہانتک کہ مخالفین نے اپنے کیئے کی معافی مانگی اور شمس تبریز کا بھی خط آگیا تو مولانا کو تسلی ہوئی اور مولانا نے انہیں بلا ہی نہیں لیا بلکہ اپنی پروردہ کیمیا خاتون سے عقد کرکے انہیں گھر داماد بنالیا۔

شمس تبریز کی مستقل گم شدگی

اب گھریلو شکایتیں شروع ہوگئیں اور خود مولانا کے صاحبزادے علاء الدین محمد ان کے مخالف ہوگئے۔ سابقہ مخالفت حقیقی معنی میں ختم نہیں ہوئی تھی، ظاہری طور پر دب گئی تھی، چنانچہ گھریلو شکایتوں کو بہانہ بناکر مخالفین ان کے قتل کے درپے ہوگئے، کیمیا خاتون کا اسی درمیان اچانک انتقال ہوچکا تھا، شمس تبریز اس گھریلو بندھن سے آزاد ہوگئے تھے۔ چنانچہ ۶۴۵ھ میں وہ قونیہ سے ہمیشہ کے لیے بے پتہ نکل گئے یا علاء الدین محمد کے ہاتھوں قتل ہوگئے اور مخالفین نے ان سے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

مولانا پر ان کے اس طرح بے پتہ ہوجانے کا غیر معمولی اثر ہوا حتیٰ کہ مولانا

خود بھی ان کی تلاش میں دمشق گئے لیکن بے سود، تقریباً ایک سال تلاش و انتظار کے بعد مولانا دوبارہ دمشق پہنچے اور اب کے دمشق میں ہی رہ پڑے، آخر متعلقین و معتقدین بڑی منت سماجت سے کسی نہ کسی طرح واپس لائے۔ مولانا شمس تبریز کی روپوشی کے چالیس دن بعد سے عزاداری کا لباس تو اختیار ہی کر چکے تھے، دمشق سے واپسی کے بعد صلاح الدین زرکوب کے علاوہ سب سے قطع تعلق بھی کر لیا۔

صلاح الدین زرکوب کے خلاف شورش

اب صلاح الدین کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہو گیا، لوگوں کو یہ سخت ناگوار تھا کہ مولانا سب سے تعلق چھوڑ کر ایک ان پڑھ دروں ساز کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جائیں، لوگ دل گرفتہ ہوئے اور یہ دلگرفتگی آہستہ آہستہ شورش میں بدلتی چلی گئی، حتیٰ کہ لوگ صلاح الدین کے قتل کے درپے ہو گئے، مولانا کو علم ہوا تو بہت ملال ہوا اور مولانا نے سب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور روپوشی اختیار کر لی، لوگ مولانا کا اتنا سخت ردعمل برداشت نہ کر سکے پھر یہ بھی اتفاق کہ اسی زمانے میں ان کے کھیتوں اور باغوں پر خشکی آنے لگی، انھوں نے اس کو مولانا کی ناراضگی کی قدرت کی طرف سے سزا محسوس کی اور سچے دل سے تائب ہوئے اور مولانا سے معافی مانگی۔ اس طرح یہ ہنگامہ فرو ہوا، شیخ صلاح الدین نے مولانا کے قائم مقام کی حیثیت میں رشد و ہدایت کا کام سنبھالا۔

۶۵۷ھ میں صلاح الدین زرکوب کا انتقال ہو گیا اور مولانا کی نگرانی میں تاشوں باجوں میں ان کا جنازہ اٹھا۔ مولانا کی باطنی سیر کے لیے غالباً کسی نہ کسی رفیق خاص کی ضرورت تھی، شمس تبریز کے بعد سے صلاح الدین ہی ان کے رفیق خاص رہے تھے ان کے بعد مولانا کو پھر ایک رفیق خاص کی ضرورت محسوس ہوئی۔

حسام الدین چلپی کی رفاقت خاصہ اور خلافت مولانا نے حسام الدین چلپی کا اپنی خصوصی رفاقت کے لیے انتخاب کیا اور ان کو اپنی صحبت کے لیے مخصوص کر لیا۔ کچھ زمانے بعد ۶۶۲ھ میں انہیں خلافت بھی سپرد کر دی اور خود عبادت و ریاضت اور سماع میں مشغول رہنے لگے۔ عام وعظ و تذکیر تو شمس تبریز کی روپوشی کے بعد سے چھوٹ ہی گئی تھی لیکن نجی صحبتوں میں معتقدین و مخلصین کو پند و موعظت کا سلسلہ اب بھی جاری رہا۔ قریب قریب دس سال اسی طرح سکون و اطمینان سے گذر گئے۔

علالت و وفات آخری دنوں میں مولانا پر ضعف و اضمحلال طاری رہنے لگا اور برابر شدت بڑھتی ہی چلی گئی حتیٰ کہ آخر کے تین دن کامل خاموشی میں گذر رہے۔ سوائے غیر معمولی ضعف و اضمحلال کے کوئی مرض تشخیص نہ ہو سکا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلا، شدت بڑھتی رہی، نبض سے کسی خاص مرض کا پتہ نہیں چلتا تھا، مولانا حال نہیں بتاتے تھے اور دوائیں مفید نہیں پڑتی تھیں، وقت تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا۔

سنیچر کا دن، غروب آفتاب کا وقت، جمادی الاخریٰ کی پانچ تاریخ تھی کہ قریب قریب اڑسٹھ سال کی عمر میں سلسلۂ مولویہ کے اس بانی نے ۶۷۲ھ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی یا بقول مولانا نور، نور میں مل گیا اور محبت و محبوب میں بال برابر جو فرق رہ گیا تھا، دور ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

تجہیز و تدفین دوسرے دن نقاروں، نفیریوں اور بیس جوڑی گویوں کے جلو میں بڑی دھوم دھام سے ہر مذہب و ملت کے سوگواروں کے بے پناہ ہجوم کے ساتھ صبح کو جنازہ اٹھا اور کہیں رات تک والد کے مقبرے تک پہنچا، قاضی سراج الدین نے نماز

پڑھائی اور والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔

صورت و سیرت | مولانا قوی الجثہ، دراز قد اور سپید رنگ تھے، چہرہ پر وقار اور شخصیت جاذب تھی، خلیق بامروات، نرم طبع، بذلہ سنج اور فطری شاعر تھے، تکلف و تصنع سے پرہیز، اختلاط خصوصاً اہل جاہ سے طبعاً ناپسند تھا، کسب حلال کی ان کے نزدیک غیر معمولی اہمیت تھی اور زندگی میں تنگی و دو کے قائل تھے۔

اہل و عیال | جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا کی پہلی بیوی گوہر خاتون سے جن کا انتقال رہتے ہی سلطان العلماء کی حیات میں ہی ہو چکا تھا مولانا کے سب سے بڑے صاحبزادے بہاالدین احمد سلطان ولد تھے جو حسام الدین کے بعد سجادہ نشین اور خلیفہ ہوئے، دوسرے علاؤالدین محمد تھے جن کا والد کی حیات میں ہی انتقال ہو چکا تھا۔ دوسری بیوی کرا خاتون سے انکے تیسرے صاحبزادے مظفرالدین امیر عالم تھے اور ایک صاحبزادی ملکہ خاتون عرف خند ولہ تھیں ان کا نکاح ایک امیرزادے خواجہ شہاب الدین سے ہوا۔ امیر عالم نے رئیسانہ زندگی بسر کی اور فقر و تصوف سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔

مولانا کی معنوی یادگاریں | نظم میں مولانا کا ایک ضخیم دیوان ہے جو عراقی اور حافظ جیسا نہ سہی لیکن مولانا کا حال ہے اور سرجوشی اور سرمستی کا حامل۔ رباعیات دوسرا شعری مجموعہ ہے، تیسرا منظومہ فارسی کا شہکار مثنوی معنوی جو اپنے قبول عام اور پذیرائی خاص کی بدولت مجالس میں برابر متداول، مدارس میں زیر تعلیم، مواعظ کی زینت، شارحوں اور محشیوں کا موضوع تصنیف اور مولانا کے سلوک، عقائد اور کلام کا ماخذ اور سلسلۂ مولویہ کا گویا الہامی صحیفہ ہے، اس کی قرأت نے فن کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور مستقل پیشہ ہو گئی ہے۔

نثر میں مجالس سبعہ' اور فیہ مافیہ' مولانا کے ملفوظات کے مجموعے ہیں جو مولانا کے صوفیانہ تصورات کے اہم مصادر ہیں اور اپنی سادگی' سہولت اور بے تکلف روزمرہ کے لحاظ سے ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

مثنوی معنوی

جیسا کہ گذر چکا ہے، مولانا کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں علوم ظاہری اور معارف باطنی دونوں کا چرچا تھا اور مولانا نے دونوں سے مکمل فائدہ اٹھایا، ایک طرف وہ عالم شریعت تھے اور دوسری طرف شیخ طریقت، وہ مدرسے کے استاذ بھی رہے اور خانقاہ کے پیر بھی، اپنے والد اور ان کے خلیفہ محقق ترمذی سے سلوک حاصل کیا تو شمس تبریزی کی صحبت سے جذب و مستی۔ علوم ظاہری کے لحاظ سے وہ فقیہ متکلم تھے تو معارف باطنی کے اعتبار سے سالک مجذوب۔ ان کی شاعر فطرت نے انہیں دل کو مخاطب کرنے کا سلیقہ سکھایا! مثنوی معنوی' ان تمام متوافق و متضاد اثرات کا عطر مجموعہ ہے۔ اس میں جذب و سلوک، فقہ و کلام شعر کے دلنشیں پیکر میں بے تکلف اور بے تصنع روزمرہ میں تمثیلی دلائل کے ساتھ جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کے تقدس سلسلے میں اس کے رواج، طرز خاص سے اس کی قرأت نے عوام میں قبول پایا اور اس کے سلوک و کلام اور دل پذیر دلائل نے خواص میں پذیرائی حاصل کی۔

مثنوی کی تصنیف کا باعث | مولانا کی شاعری غزلوں اور رباعیوں تک محدود تھی۔ یہ غزلیں اور رباعیاں مولانا کے قلبی واردات اور جذب و شوق کی ترجمان ہونے کے لحاظ سے ادبی قدر و قیمت رکھتی ہیں لیکن جہاں تک ہدایت و ارشاد اور تعلیم و تربیت کا تعلق ہے قابل اعتنا نہیں۔ رشد و ہدایت کے لیے مولانا کے مریدین حکیم سنائی اور

عطار کے منظومات سے استفادہ کرتے، مولانا کے مرید خاص چلپی حسام الدین نے مولانا سے رجوع کیا اور استدعا کی کہ وہ اپنے مریدین و مخلصین کی تربیت و ہدایت کے لیے کوئی کتاب مرتب کردیں مولانا نے ان کی فرمایش پر مثنوی کی طرح ڈالدی اور چھ دفتروں تک ہی پورا کرسکے پہلا دفتر ۶۵۸ھ سے ۶۶۰ھ تک پورا ہوا اور ۶۶۲ھ سے ۶۶۶ھ تک بقیہ پانچ دفتروں کی تکمیل ہوئی۔

عطار اور سنائی کی مثنویاں خود مولانا کے مسلسل مطالعے میں رہتی تھیں اس لیے مولانا کے یہاں ان کا انداز ہی نہیں آیا، بلکہ الفاظ، فقرے اور ان کے معارف وخیالات بھی آگئے۔

مثنوی کے خصوصی ماخذ حکیم سنائی کا مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ، عطار کی منطق الطیر مولانا کے ماخذ میں ہیں، ساتھ ساتھ شیخ برہان الدین محقق ترمذی کا سلوک بھی اسمیں شامل ہے اور مولانا کے والد سلطان العلما کا رسالہ 'معارف بہاولد' اور شمس تبریز کے مقالات بھی مثنوی کے مصادر میں شمار کیے گئے ہیں۔

مثنوی کا موضوع، زبان، انداز اور فارسی ادبیات میں اسکی قدر وقیمت مثنوی کا اصل موضوع تصوف ہے اور مقصد تعلیم و تربیت ہے اس میں مولانا کے اجتہادات بھی شامل ہیں اور فکری جدتیں بھی۔ لیکن منطق الطیر اور الٰہی نامہ کی طرح تصوف و تربیت ہی نہیں بلکہ ایک حد تک مکمل اشعری کلام بھی ہے جو اپنے تمثیلی استدلال کی بنا پر دماغ کے بجائے دل کو چھوتا ہے۔

زبان کے لحاظ سے مثنوی آمد اور بے تکلف قدرت کلام کا دل پذیر نمونہ ہے، مولانا چونکہ بقول خود معنی کے مقابلے میں الفاظ کی اہمیت کے قائل نہیں، اصل مغز ہے پوست قابل توجہ نہیں اس لیے عامیانہ الفاظ کے صرف سے بھی پرہیز نہیں کیا ہے جتنوع معانی

کا یہ یک وقت حضور کبھی کبھی تعقید و ابہام بھی پیدا کر دیتا ہے تاہم مولانا کے بے تصنع انداز، احساس کی شدت، نظر کی گہرائی اور گیرائی نے کہیں کہیں تو مصرعوں کے مصرعوں اور شعروں کے شعروں کو مثل اور کہاوت بنا دیا ہے۔ طبیعت کی روانی، خیالات و معلومات کا حضور، معارف و مشاہدات کی کثرت اور مولانا کا جوش و شوق سب نے مل کر مثنوی کو بابوں اور فصلوں میں اگرچہ مرتب نہ ہونے دیا تاہم انتشار اور بے ترتیبی کے باوجود ابتدائے طلب سے استغراق و صحو تک، تبتل سے فنا اور وصل تک سب احوال و مقامات اور مراحل و منازل آ گئے ہیں۔ استطراد کی کثرت، کلامی بحثیں، عقائد کی تعلیم، طوالت کلام، مضمون کے اجزا میں تفریق اور ان میں خلاف معتاد فصل وغیرہ سے اگرچہ ناگواری کا احساس ہوتا ہے اور توجہ کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے تاہم دلچسپی قائم رہتی ہے۔ مثنوی کا بڑا حصہ قصص و امثال پر مشتمل ہے اور کچھ ایسے قصے بھی ہیں جو سوقیت و ابتذال کی بنا پر مثنوی کو داغدار بنا دیتے ہیں لیکن آرین مذاق کے کچھ زیادہ خلاف نہیں۔

مثنوی کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس عہد کے معاشرے اور تہذیب پر بھی اچھی خاصی روشنی پڑ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ مجموعی طور پر مثنوی رنگ برنگ پھولوں کا ایک گلدستہ ہے۔

چونکہ مثنوی کے آخری پانچ دفتر طویل مدت میں تصنیف ہوئے اس لیے کہیں کہیں نا آہنگی، اختلاف و انتشار تعجب انگیز نہیں۔ علاوہ ازیں یہ پورا زمانہ مولانا کے احوال و مواجید اور نئے نئے معارف و مشاہدات کا ہے، واردات کے تنوع اور احوال و مقامات کے اختلاف سے خیالات و انعکاسات میں تغیر اور فرق از بس ناگزیر ہے۔ مثنوی میں شطحیات نہ سہی لیکن مواجید تو ہیں ہی کیونکہ سپہ سالار کے بقول "ان کے

اکثر کلمات طیبات بحالت سکر بیان ہوئے ہیں" اس لیے قابل گرفت نہیں اور تشریح و تاویل کی گنجائش رکھتے ہیں۔

مولانا ایک طرف اشعری متکلم دوسری طرف صاحب حال صوفی، کبھی اشعریت کا غلبہ اور کبھی حال و مقام کی سرجوشی۔ چنانچہ فکر اور واردے کا تناقض و تضاد مولانا کی اس پہلو دار شخصیت کا لازمی نتیجہ ہے۔

فارسی ادبیات میں جہاں تک مثنوی کی ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے یہ فردوسی کے شاہ نامے، حافظ کے دیوان غزلیات اور سعدی کی گلستاں کے پائے کی چیز ہے اور طہران یونیورسٹی کے ایرانی استاذ فروزان فر کے بقول "ایرانی ادبیات کی عظیم ترین اور بلند ترین کتاب ہے"۔

مولانا کی شخصیت کا اشعری رخ | کلامی عقائد میں حنفی علماء کا طبقاتی مسلک اگرچہ ماتریدی ہے لیکن اشعریت کا آوازہ اس بلند آہنگی سے اٹھا اور پھیل گیا کہ ماتریدیت کی شہرت ماند پڑ گئی اور اہل السنت والجماعت کے کلامی عقائد اشعریت ہی میں ڈھل گئے۔ علاوہ ازیں کہنے کو تو لوگوں نے اشعری اور ماتریدی اختلافات پچاس[5] تک گنا دیے ہیں لیکن یہ زیادہ تر نظریاتی ہیں کہ جن کا ثمرہ اختلاف نہیں بلکہ یہ تعبیری اور تفسیری ہیں۔ دونوں مسلکوں کے اہم اختلافوں میں انسانی قدرت کا موثر ہونا نہ ہونا قضا میں تغیر و تبدل ہو سکتا یا نہ ہو سکنا، افعال کے حسن و قبح کی شرعیت و عقلیت گنے جا سکتے ہیں۔ خود مولانا کس حلقے سے تعلق رکھتے ہیں، قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا، مثنوی پر عام اور سرسری نظر ڈالنے سے مولانا کا اشعری مسلک کی طرف رجحان معلوم ہوتا ہے۔

اشعری عقائد | اشعری اور ماتریدی مسلکوں کے اہم اختلاف میں نے بیان کردیے،

اشعری عقائد مختصراً یہ ہیں: باری تعالیٰ واجب الوجود ہے، اس کی ہستی ضروری اور ناگزیر ہے، بے جہت ہے، بے مکان ہے، بے جسم ہے، نہ جوہر ہے نہ عرض، بے زمان ہے یعنی اس کی ہستی زمانے پر موقوف نہیں، بے اتحاد ہے، کسی میں حلول اور سرایت نہیں کرسکتا، وہ محل حوادث نہیں، وہ حسی اور نفسانی صفات سے متصف نہیں، وہ واحد اور اکیلا ہے۔

باری تعالیٰ قادر ہے، عالم ہے، حیّ اور زندہ ہے، صاحب ارادہ ہے، سمیع اور شنوا ہے، بصیر اور بینا ہے، متکلم اور باسخن ہے۔ اشاعرہ کے نزدیک یہ ساتوں معانی اوصاف ہیں عین ذات نہیں اور قدیم ہیں، ذات باری نہ کبھی ان سے خالی تھی اور نہ کبھی خالی ہوگی۔

اشاعرہ باری تعالیٰ کی رویت کو دنیا اور آخرت دونوں میں ممکن مانتے ہیں لیکن دنیا میں وقوع کے منکر ہیں، جہاں تک اس کی حقیقت کے علم کا تعلق ہے، اس کے ممکن اور ناممکن ہونے میں اختلاف ہے۔

افعال عباد باری تعالیٰ کی خلق ہیں، ان میں براہ راست اور فعل کے کسی نتیجے میں پیدا ہونے والے افعال کی تخصیص نہیں۔ بندوں سے صرف کسب اور عمل کا تعلق ہے، وہ باری تعالیٰ کے فعل کو پیدا کرنے سے متصل اور مقارن پہلے ارادے کو کسی فعل سے متعلق کرتے ہیں اور معمولاً وعادۃً باری تعالیٰ ارادہ کیا ہوا فعل پیدا کر دیتا ہے۔

باری تعالیٰ نے ازل میں افعال و اشیا کو جس طرح، جس حال، جس وقت اور جب تک پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے ویسے ہی ان کا وجود ہوگا، تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

افعال کی اچھائی کہ فاعل مدح اور ستایش اور مستحق ثواب ٹھہرے اور برائی کہ مرتکب لائق سرزنش اور مستوجب عقاب شمار ہو، شرع پر موقوف ہے، عقل کا منصب نہیں

کہ وہ ثواب وعقاب کا استحقاق ثابت کرے۔

خود باری تعالیٰ کے افعال حسن وقبح اور اچھائی برائی سے متصف نہیں، نہ اس کا کوئی فعل اچھا نہ برا، وہ دونوں سے پاک اور منزہ ہے۔ اس کے افعال کی کوئی غرض نہیں نہ اسکیلیے ان کے نتائج منتظرہ۔

مثنوی میں مولانا نے قریب قریب ان سب ہی عقائد کو موقع بہ موقع بیان کیا ہے اور تعلیم دی ہے، جہاں ضروری سمجھا ہے تمثیلی دلائل سے ان کی توضیح کی ہے اور معقول کو محسوس کر دکھانے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے اور بہت کاوش سے محسوس مثالیں تلاش کی ہیں جو دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کرتی ہیں۔

مولانا کی شخصیت کا صوفیانہ رخ عام خیال یہ ہے کہ مولانا وحدت وجود کے قائل ہیں اور ابن عربی کی پیروی میں ذات باری کو اطلاق ہی اطلاق اور سراسر ابہام، ہر وصف سے معرا حتیٰ کہ وجود و وجوب کی آلودگی بلکہ معلولیت کے شوائب سے بھی منزہ مانتے ہیں؛ غیب الغیب کے حجاب اور خفار الخفا کے حجلے سے اس حسن ازلی کی کرنوں کا مرتبہ بہ مرتبہ تعینات و تشخصات کے لطیف وکثیف تہوں میں مستور ہو کر تنزل اور آمار ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ کائناتی تعین عالمی تشخص اختیار کرلیتی ہیں، ذات اطلاق وابہام کی اندھیاری سے قباسے صفات پہن کر باہر نکل آتی ہے۔ ایک وجود ہے جو اپنے تعینوں اور تشخصوں میں ہزار ہے، ورنہ واقع میں لاموجود الا ہو، وہی وہ ہے اور بس۔

اگرچہ ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ سے ایام طلب میں دمشق میں مولانا کی صحبتیں رہیں اور ابن عربی کے خصوصی شاگرد اور پروردہ صدرالدین قونوی متوفی ۶۷۳ھ کے ساتھ دوستی بھی رہی لیکن وہ وجودی وحدت کے قائل نہیں ہو سکے۔ وہ وجدان کے ذاق

میں اتنا تفاوت تھا کہ ابن عربی کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" جو اس فکر کی گویا مفصل شرح ہے، مولانا کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

مولانا درحقیقت وجود باری اور وجود ممکن کی ثنویت اور دوئی کے قائل ہیں ان کی منزل فنا فی اللہ اور بقا باللہ ہے۔

وجود کے قائم رہتے ہوئے کسی وصف کا جانا فنا اور اس کی جگہ دوسرے وصف کا آنا بقا ہے، یہ رفت اور آمد ہے، عدم اور وجود نہیں۔ میں اس خیال کی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے صرف اسی فنا و بقا کی توضیح پر اکتفا کرتا ہوں جو مولانا اور ان کے پیش رو بزرگوں سنائی و عطار کے سلوک کی آخری منزل ہے۔

فنا سے مقصود بندے سے اوصاف بشری کا زوال اور اوصاف جلالت میں کمال ہے۔ جہاں تک بندگی کا تعلق ہے بندہ بندہ رہتا ہے، تکلیفات شرعیہ سے مکلف (الاّ یہ کہ جذب وسکر میں ہوش نہ رہے) اور خدا خدا رہتا ہے چنانچہ مولانا نے اس کی ایسے لوہے سے مثال دی ہے جو آگ میں سرخ ہو کر اپنا رنگ کھو کر آگ کا رنگ روپ اور جلا ڈالنے کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ فنا اور بقا کی یہ آخری منزل جس کو فنا فی اللہ اور بقا باللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اصل میں ہندی وحدت وجود کی اسلامیائی شکل ہے اور اس کے ڈانڈے وحدۃ الوجود سے ملے ہوئے ہیں، چنانچہ یہ دونوں تصور گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور سنائی، عطار اور مولانا سب کو وجودی وحدت کا حامی سمجھ لیا جاتا ہے۔

فنا اور بقا کا یہ تصور تمام پیش بندیوں کے باوجود بشرطیکہ اس کو حقیقی اور خارجی معروضی کیفیت تسلیم کیا جائے تو عقلاً حلول و اتحاد سے اس کا امتیاز بہت دشوار ہے۔

خود مولانا کو بھی اس دشواری کا احساس ہے، چنانچہ وہ اس خدشے اور خطرے پر برابر تنبیہ کرتے رہتے ہیں اور عقل کو اس حقیقت کے محسوس کرنے اور سمجھنے میں ناکارہ اور عاجز قرار دیتے ہیں اور اس کے وراء العقل حقیقت ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔

کائنات

کائنات عدم محض سے وجود میں آئی ہے اور ذات باری کے تقاضائے ظہور کی نمود ہے۔ خیال ایزدی سے جو اپنی جگہ عرض ہے اس نے جواہر و اعراض کی صورتیں اختیار کی ہیں، کائنات عالم اجسام یا حسی، تخیلی و عقلی حقایق پر اور عالم ارواح یا ماوراء العقل حقایق پر مشتمل ہے۔

عالم اجسام عالم اجسام کی ساخت متضا عناصر خاک، آب، باد اور آتش سے ہوئی ہے۔ ان کے توازن پر یہ قائم ہے لیکن ان کا ذاتی تضاد انہیں قائم نہیں رہنے دیتا، توام بگڑا اور فساد آیا اور کسی دوسری ترکیب کا ظہور ہوا، کون و فساد کا یہی تسلسل عالم اجسام کی بقا اور باری تعالیٰ کی ارادی تکوین ہے۔ مولانا کے نزدیک عالم اجسام سارا کا سارا زندہ ہی نہیں با حس و با شعور بھی ہے، جمادات کا مطلب صرف ٹھنڈی اور افسردہ چیزیں ہے لیکن بے حیات و شعور نہیں، ہر شے زندہ اور با شعور حقیقت ہے۔

کائنات قانون ازدواج کے تحت وجود میں آئی ہے، باری تعالیٰ کی صفت قہر اور صفت لطف کا ازدواج اور قران یا میل ہوا اور عالم خیر و شر پیدا ہوا، پھر اس عالم میں بھی تمام چیزیں جفت جفت اور جوڑ جوڑ پیدا کی گئی ہیں اور ان کے باہم قران اور ازدواج سے ہی دوسری چیزیں برابر پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

مولانا کے نزدیک یہ حسی کائنات ساری کی ساری بے حقیقت خواب اور سپنا ہے۔

اس کی راحتیں اور الم سب خواب کی باتیں ہیں، نہ اس کی خوشی واقعہ نہ اسکا غم حقیقت۔

عالم ارواح عالم ارواح قدیم، غیر فانی اور عالم اجسام میں متصرف اور اس کا مدبر ومنتظم ہے، عالم اجسام کی طرح اس کے اپنے الگ آسمان وزمین ہیں، اس کی اپنی بلندیاں اور پستیاں ہیں، اس کے اپنے پہاڑ اور سمندر ہیں، اس کے اپنے حواس اور اپنے شعور ہیں لیکن یہ سب ہمارے حواس اور شعور سے ماورا اور غیر محسوس وغیر معقول۔

جان وروح عالم ارواح کی ایک اہم حقیقت، جان وروح کے متعلق مثنوی کے بیانات بہت الجھے اور مبہم ہیں ان سے کسی واضح اور متعین فکر کی طرف رہنمائی نہیں ملتی، جان، جان جزء، جان کل، جان اول، پھر جان حیوانی، جان انسانی، جان اولیا، جان فرشتگاں، جان انبیا اور جان محمدیؐ سب کی حقیقت ایک ہے یا الگ الگ پھر شخصی روحیں تکثر اشخاص کے مطابق متکثر ہیں یا واحد، مدبر کل، مثنوی سے پوری طرح واضح نہیں بہرحال اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جان مستقل جنس ہے، مادے سے مجرد، بسیط، ترکیبی تضادوں سے بری، باری تعالیٰ کے انداز کی، غیر فانی، بذات خود یا بالواسطہ علم وآگہی، عالم اجسام سے تعلق چھوڑنے کے لیے بے چین اور اپنے عالم سے کلیۃً وصل کے لیے بے قرار۔

عقل عالم ارواح کی دوسری خاص حقیقت عقل ہے اور مثنوی میں اس کی تفصیلات بھی بہت مبہم ہیں تاہم یہ اپنی جگہ جنس ہے جس کے تحت جمادی، نباتی، حیوانی، انسانی، اولیائی اور انبیائی عقلیں انواع کی حیثیت میں شامل ہیں۔

عقل کی اس نوعی تقسیم کے علاوہ دوسری تقسیم عقل جزئی یا عقل جزء اور عقل کلی یا عقل کل میں ہے۔ اس تقسیم کی اصل نوعیت اور حقیقت کشفی ہے عقل سے ماورا بہرحال

عقل کلی اور فرشتے کی اصل حقیقت یہی عقل ہے۔ یہ اپنی پیدائش اور ہستی میں دونوں عالم سے مقدم ہے، نہایت لطیف، مستقل اور قائم، حوادث سے غیر متاثر، لب و جوہر، بایقین و ایمان، قابل اعتماد، غیب بیں غیب گو ہے۔ یہ عقل وہبی ہے انسانی کسب و تحصیل کو اس میں دخل نہیں۔ پوری کائنات اس عقل کے تخیل کا حسی تشکل ہے، اس حسی تشکل نے اصل عقل کلی کو نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ عقل کل حق اور واقعیت ہے اور اس کی یہ حسی صورت باطل ہے، محسوس عالم سے تعلق ختم کر دو تو اصل عقل نمایاں ہو جاتی ہے۔ عقل جزئی سے عقل کلی کا اتصال اس کو لوح محفوظ سے براہ راست استفادے کے قابل بنا دیتا ہے لیکن یہ اتصال بے طلب اور بے تقاضا نہیں حاصل ہوتا۔ اتصال کے بعد عقل جزئی کی اپنی کاوا کی اور انتشار جاتا رہتا ہے۔ عقل کلی ایک سمندر ہے اور ہماری صورتیں اس میں تیرتے طشت' جہاں یہ بھر گئے اور تہ میں غائب ہوئے۔ عقل جزئی کو عقل کلی کا حصہ مانو تو ناقص حصہ ہے، فرد کہو تو فرد ضعیف ہے۔

ارتقاء انسان کی یہ انسانی صورت ابتدائی نہیں ارتقائی ہے، اس نے پہلے عنصر بسیط، آب و خاک و باد و آتش کی صورت اختیار کی، بساطت سے ترکیب میں آیا، جماد ہوا، نبات ہوا، حیوان ہوا پھر انسانی صورت قبول کی، انسانیت سے کہاں جائیگا یہ کون کہہ سکتا ہے، آگے کی منزلوں کی کوئی نہایت نہیں۔ یہ تو موت تک کی منزلوں کی حالت ہے۔ موت سے اس کی ارتقائی منزلوں کا اختتام نہیں ہوتا۔ صرف راہِ وجود کی منزلیں ختم ہوتی ہیں اور راہِ عدم کی منزلیں شروع ہو جاتی ہیں۔ لاانتہا اور بے انقطاع ؛

روحانی یا باطنی حواس انسان کے ظاہری حواس پنجگانہ تو کھلے ہوئے ذرائع حس ہیں

جن کے الگ الگ میدان عمل ہیں، اگرچہ کسی ایک حاستے کا ضعف دوسرے حواس کو بھی ضعیف کر دیتا ہے لیکن ایک کی نیابت دوسرا نہیں کر سکتا، پھر ان کے احساس میں محسوس کا استیعاب نہیں، محسوس کے کسی مخصوص رخ پر مرکوز رہتا ہے۔

ان ظاہری حواس کے علاوہ ان کے مقابل باطنی حواس پنجگانہ انسان کو دوسرا ایزدی عطیہ ہیں اور اس کی تکریم و شرف ہیں۔ ان کی کارکردگی کی پہلی شرط جسم سے انقطاع ہے، ان میں سے ہر حس دوسری حس کی نیابت کر سکتی ہے۔ ان کے میدان عمل الگ الگ نہیں، ساتھ ساتھ وسیع تر، شامل تر اور کامل تر ہیں اور ظاہری حسوں کا ارتقا نہیں بلکہ انقلاب ہیں۔ یہ حسیں مرگ جسم سے مرتی نہیں بلکہ برابر قائم اور فعّال رہتی ہیں، یہ اتنی نازک اور دقیقہ رس ہیں کہ انبیا علیہم السلام کے نغمہائے باطنی کو بھی محسوس کر لیتی ہیں۔

علم علم انسانی مولانا کے نزدیک تحصیل اور کسب نہیں تذکر اور پردہ کشائی ہے۔ روح سراسر علم و عرفان ہے جس پر مادے کی تاریکی کے پردے پڑے ہیں، اس سے تعلق ترک کیا اور یہ پردے اٹھے اور علم کا آفتاب طلوع ہوا اور روح اپنی حقیقی کیفیات، علم و خبرت کے ساتھ نمایاں ہوئی، ساتوں طبق اپنے بدیہیات و نظریات عملیات اور علمیات کے ساتھ روشن ہوئے۔ یہی روح کی سرشت ہے جو دھندلی اور آہستہ آہستہ بالکل تاریک پڑ گئی ہے، انبیا اسی دھندا ور تاریکی کی منجھائی کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔

اولیاء اللہ اولیاء اللہ کا قرآن وحدیث کا اطلاق کافی عام ہے لیکن صوفیہ نے کشفی طور پر اس کا دائرہ بہت تنگ کر کے اس کو ایک مخصوص صنف میں استعمال

کیا ہے اور اب یہی استعمال عام ہے، چنانچہ مولانا کے نزدیک اس صنف کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس عالم آب و گل سے پہلے جو کچھ ہوا وہ اس کی نظروں کے سامنے ہوا، کائنات کی بود و نمود اس کا طفیل ہے، اس کے افراد اپنی جگہ اکیلے اور تنہا نہیں، وہ خود جہان ہیں، ہستی ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کے قابو میں، وہ ایک ہزار ہیں اور ہزار ایک ایک ہو تو ہزار، ہزار ہوں تو ایک، انکا اپنا کوئی عمل نہیں سب خدا کا عمل ہے، وہ کسی عمل کے ذمہ دار نہیں، ان کی ارواح صحرائے بے کم و کیف کی نزیل اور وسعت لامکانی میں سکونت پذیر، یہاں تو صرف ان کے تن ہیں، ان کے تن ہمہ نور و لطافت ہیں عام ارواح اور ملائک سے لطیف تر، ان کی موجودگی اور ناموجودگی انکی دانش و آگہی میں غیر موثر، غیب ان کے لیے غیب نہیں، دل میں چھپی باتیں انکے لیے ہویدا، ذات باری ان کے لیے مکشوف، مسببات اور معلولات کو ان کے اسباب و علل سے روک دیتے ہیں، عمل اور فعل کو اس کے ناگزیر اثر سے کاٹ دیتے ہیں، چھوٹے ہوئے تیر کو واپس لے آتے ہیں، گفتہ کو ناگفتہ کر دیتے ہیں، ان کو عمل کے لیے آلات و وسائل کی ضرورت نہیں ہوتی، باری تعالیٰ کی بخششیں انکے واسطے سے ہوتی ہیں، باری تعالیٰ کی طرح ان کی بخششیں بھی بے توقع معاوضہ ہیں، وہ اگر روئیں تو ہفت افلاک چیخ پڑیں، پروردگار کی طرف سے قاصد پہ قاصد دوڑ پڑیں، ایک بار "پروردگارا" کہدیں تو ہزار ہا لبیک کی صداؤں سے زمین آسمان گونج اٹھیں، ان کی غذا تو نور ہے ان کے ظاہری طعام میں حلت و حرمت کی تمیز نہیں، ان کے گناہ دوسروں کے ثواب سے بہتر، ان کا کفر دوسروں کے ایمان سے اعلیٰ، ان سے ناوابستگی اور سرکشی خود ان کی ناتعلقی اور ناراضگی کی دلیل ہے، اگر وہ مردہ بھی ہیں تو عالم کی زندگی ہیں، کائنات

کی دھڑکن ان کے دل کی دھڑکن ہے، ان کو کسی واسطے کی ضرورت نہیں انوارالٰہی کا وہ براہ راست مہبط ہیں، بے نہایت بارگاہ بے چوں میں ان کے مسلسل و متواتر عروج کی کوئی انتہا نہیں، یہ عروج بہ قطع مسافت نہیں یہ ایک مرحلے سے نیستی اور دوسرے بالائی مرحلے میں ہستی ہے، ان سے بحر حقیقت ابل رہا ہے اور خود نیست ہیں، بحر حقیقت سے انکا یہ اتصال بے چون و چگوں ہے، منطق عقل سے ماورا، آب گینۂ کلام کی گنجائش سے باہر، اتصال کے ایک درجے میں جسم اگرچہ دکھتا ہے لیکن واقع میں وہ معدوم ہوتا ہے، اسکا سایہ نہیں پڑتا، انبیا کے مظہر ہونے کی وجہ سے یہ خود نبی ہیں، ان کی باتیں وحی الٰہی ہیں' شبہے، وہم اور غلطیوں سے محفوظ، عوام سے پردہ داری کی وجہ سے ان کی وحیوں کو وحیِ دل کہہ دیتے ہیں۔ لوگ ان کو بشریت کے روپ میں دیکھ کر بشر سمجھ بیٹھتے ہیں نہیں جانتے کہ یہ روپ تو اجنبیت دور کرنے کا حیلہ ہے۔ بشر تو بشر ان کو مخلوق کہنا بھی زیادتی ہے' وہ ہیں کہاں وہی وہ ہے۔ ان کو دیکھنا خدا کو دیکھنا ہے، ان کا طواف کعبے کا طواف ہے' یہ تو کعبے سے افضل ہیں، ان کی خدمت، اطاعت، حمد و ثنا خدا کی خدمت، اطاعت، حمد و ثنا ہے، یہ ہیں کہاں نور ایزدی انسانی جامے میں ہے۔ بندہ گیا تو کیا رہا، یہ تم سوچ لو' یہ خود اپنے آپ کو سجدہ کرتے ہیں۔

خواب اور سپنا | مولانا کے نزدیک سونے اور مرنے میں صرف اتنا فرق ہے کہ سونا، روح کا جسم سے وقتی قطع تعلق ہے جس میں روح کا جسم سے یک گونہ رشتہ قائم رہتا ہے، اور مرنا نامعلوم مدت کے لیے قطع تعلق ہے۔ خواب اور سپنے کی مصروفیتیں روح کی حقیقی مصروفیتیں ہیں، وہ واقعۃً چلتی پھرتی ہے، دیکھتی سنتی، خبریں دیتی، مشورے لیتی اور دیتی ہے۔

موت | موت یا روح کا جسم سے کامل ترک تعلق دنیوی اور اخروی زندگی کے

درمیان کا پل ہے اس پر سے گذرے بغیر کوئی اخروی زندگی میں قدم نہیں رکھ سکتا، یہ خوب سے خوب تر کی طرف انتقال ہے اور برابر جاری رہتا ہے۔

صور اور اعراض کا مخزن | مولانا کے نزدیک صورتیں، اوصاف اور اعراض اس عالم مادہ کی حقیقتیں نہیں، عالم مادہ یا اس عالم کثیف سے پرے ایک عالم لطیف ہے جس میں صور، اوصاف اور اعراض جمع ہیں، مادے سے تہی اور مجرد اور بقدر ضرورت مواد مجردہ کو پہنا دیے جاتے ہیں اور وہ اجسام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لطیف عالم غیر حسی ہے اسکو محسوس کرنے کے لیے زیادہ لطیف حواس درکار ہیں اور جن میں یہ لطیف حواس ہیں وہی اس کو محسوس کرتے ہیں اور لطف لیتے ہیں بلکہ جس صورت کو چاہتے ہیں یا ضرورت محسوس کرتے ہیں لے لیتے ہیں، فرشتے یہیں سے انسانی صورتیں لے کر انسانی تشکل اختیار کرتے ہیں۔

عالم معنیٰ | عالم صور کے علاوہ اور اپنی خصوصیات صوری سے جدا ایک عالم معنیٰ ہے، یہ ایسی وحدت ہے جہاں موسیٰؑ و فرعون الگ نہیں۔ اس میں نہ تجزی و تعدد، نہ زمان و مکان، سب ایک اور ایک سب، نہ کوئی زوج نہ کوئی فرد، نہ آشتی نہ جنگ، و حدانی بحر بے کراں۔ اس جہان معنی کو معنی ہو کر ہی محسوس کیا جا سکتا ہے، یہ بیرنگی بے رنگ ہو کر ہی منکشف ہوتی ہے، یہ اتنا نازک ہے کہ الفاظ اس کی تاب نہیں لاتے۔ یہ بے رنگی اسیر رنگ ہو کر ہی من و تو، موسیٰؑ و فرعون اور خلیل و مصطفیٰ کی جکڑبندیوں میں مقید ہوتی ہے اور اب تب، ایسے ویسے اور یہاں وہاں کا امتیاز حاصل کرتی ہے۔

عالم کی اس تقسیم سے مولانا نے وجودی وحدت اور شہودی کثرت کے محل بھی متعین نہیں کیے بلکہ انہیں حسی مثالوں سے حتی الامکان قابل فہم بنانے کی کوشش کی

اور یہ مولانا کی خصوصی مقدرت بیان ہے۔ جہاں تک چون وچگون کا سوال ہے عقل کی حدوں سے اس کا ادراک بہت آگے ہے۔

ہم جنسی اور کشش مولانا کے یہاں ہم جنسی اور جنس کی ہم جنس کی طرف کشش عالمی رشتہ ہے، مادیات ہوں یا معنی کوئی سی دو چیزیں جن میں کسی نہ کسی حیثیت سے کوئی تعلق ہو وہ آپس میں ہم جنس ہیں اور ان کی یہی ہم جنسی ان میں کشش کا باعث ہے۔ حیوانی زندگی کی یک جنسی کی مثالوں کو چھوڑ کر مثلاً پرند پرند، چرند چرند، انسان انسان کہ ان کی یک جنسی واضح ہے، میں مولانا کی تخیلی یک جنسی کی کچھ مثالیں پیش کیے دیتا ہوں تاکہ اس رشتے کی وسعت، نوعیت اور اشتراک کے حقیقی اور ادعائی ہونے کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ چنانچہ جنتی اور جنت، جود و محمدت، عیسیٰؑ و ادریس اور ملائک، نباتات میں آب و خاک، فرعون و ہامان اور دوزخ وغیرہ سب ہم جنس ہیں۔

تضاد اور اضداد مولانا کے یہاں تضاد کی خلّاقانہ اہمیت ہے۔ ہر ترکیب اضداد کی تالیف سے وجود میں آتی ہے اور اضداد کی تالیف ان کی فطری منافرت کی بنا پر انحلال و انتشار کا باعث بن کر ترکیب کو فنا کر دیتی ہے اور خالق کائنات پھر ان اضداد کو پیوست کر کے دوسری ترکیب پیدا کر دیتا ہے، اسی سلسلۂ ترکیب و انحلال اور پھر ترکیب و انحلال سے کائنات کا یہ تسلسل و تواتر قائم ہے، چنانچہ جو موجودات ترکیب سے بری ہیں وہ نہ فانی ہیں نہ متجدد، باقی ہیں اور قدیم۔

زہد و تصوف فقر و تصوف کی ابتدا اگرچہ زہد اور ترک دنیا سے ہوئی جو شروع میں مثبت اقدام تھا اور اس کی تبلیغی اور داعیانہ اہمیت تھی، عوام کی سطح پر خود کو

لاکر اور ان میں معاشی اور معاشرتی طور پر مل کر ان کی معاشی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اصلاح میں کوشش تھی اور امداد و تعاون، خود اعتمادی، دیانت دارانہ کسب و عمل کی تعلیم تھی جو ان کی معاشی اور معاشرتی سطح سے بلند ہو کر چنداں موثر نہ ہوتی، اس کے علاوہ زہد کی اپنی ذاتی قیمت نہ تھی لیکن عہد صحابہ میں ہی کچھ بزرگوں نے خود زہد کو اپنی جگہ غیر ضروری اہمیت دینی شروع کر دی اور زہد اپنی منفی حیثیت میں اسلامی قدر و قیمت کا حامل سمجھا جانے لگا۔ یہی منفی زہد تصوف کا سکہ رائجہ قرار پایا اور اس میں عیسائیت اور بدھ ازم کی رہبانیت شامل ہو گئی، کچھ بزرگ تو اتنا آگے بڑھ گئے کہ بدھ بھکشوؤں کی دیکھا دیکھی کاسۂ گدائی لے کر گھومنے بھی[1]، یہ دور مسلمانوں کے فکری اجتہاد کا تھا چنانچہ کچھ ہی دنوں میں بھیک نے نذرانوں کی شکل اختیار کر لی اور اسلام کی مساوات اور ہدایا کا لین دین یک طرفہ عطیوں کے حصول[2] میں بدل گیا اور کسب و عمل کی جگہ تعطل اور توکل اور دوسروں کی کمائی پر انحصار نے لے لی، نذرانے درویشی کا لازمہ سے بن گئے۔ مولانا نے اسلامی توکل کی توضیح کی اور کسب و عمل پر متوجہ کیا۔

کسب مال | مولانا کی صوفیانہ تعلیم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ تاہل، عیال داری، مال و دولت، املاک و امتعہ کو فقر و درویشی کے منافی نہیں جانتے اور نہ ان سے مکمل فائدہ اٹھانے کی صوفیت کے مخالف سمجھتے ہیں۔ وہ ترک و رہبانیت کو حقیقی دین داری نہیں قرار دیتے، جائز وسیلوں سے مال و دولت حاصل کر کے اپنی اور اپنے اہل و عیال کے آرام اور آسائش پر صرف کرنا دنیاداری نہیں مانتے، دینی تقاضوں سے غفلت برتنا، دوسروں کے مالی حقوق کو ہضم کر لینا، اپنے آپ کو

---

[1] رسالہ قشیریہ، باب الفقر ص۱۴۵ [2] ایضاً صفحہ ۳۔

صرف دولت حاصل کرنے کے لیے وقف کر دینا، اسکو محض اپنے تعیش پر صرف کرنا اور خدا سے تعلق منقطع کرلینا یہ دنیا داری ہے۔ چونکہ اہل وعیال کی ضرورتوں کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے اور اسکے لیے مال و دولت لابد اور مال و دولت کا صحیح حصول جائز کسب پر موقوف تو کسب کی حیثیت بھی واجب شرعی کی ہو جاتی ہے۔ حرمت وحلت کا مدار مقصد پر ہے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی دلجمعی، صلاح وتقویٰ کا تحفظ، دوسروں کی کاربرآری اور دین کی حفاظت مقصد ہے تو کسب واجب، اگر مقصد انکے خلاف ہے تو کسب ناجائز۔ سچی درویشی دل کی مسکنت اور اس کا حب مال سے خالی ہونا ہے نہ کہ دوسروں کے کسب پر تکیہ کرنا اور توکل کو بہانا بنا کر خود کو معطل کر لینا۔

مولانا اور انکی مثنوی کے متعلق متضاد تاثرات | مولانا کا ایک طرف تو فقہ حنفی اور خلافیات کے مستند علماء میں شمار ہے طبقہ صوفیہ میں وہ درجۂ اجتہاد پر فائز ہیں اور قطبیت کا مرتبہ رکھتے ہیں ان کی مثنوی کو "ہست قرآن در زبان پہلوی" کہا گیا ہے، دوسری طرف ان افکار کی بنا پر جن کی مثنوی میں تعلیم ہے انہیں فرقۂ باطنیہ کے اصحاب حلول واتحاد کے غلاۃ و متشددین میں گنا گیا ہے اور انکے اور انکی مثنوی کے ترک کو واجب قرار دیا گیا ہے[۱]، اپنے معاصر علماء کی تکفیر کا خود مولانا کو بھی اعتراف ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ مثنوی کے اکثر افکار کے ڈانڈے عقلاً حلول اور اتحاد سے ہی ملتے ہیں جو مولانا کو بھی مثنوی میں تسلیم ہے، پھر مریدین و معتقدین کو اپنے لیے سجدے کا حکم بھی اتحاد کی ہی طرف لے جاتا ہے۔

درحقیقت جیسا کہ گذر چکا ہے مولانا کے دو دور ہیں[۲] ایک شمس تبریز سے ملاقات سے پہلے کا اور ایک ملاقات کے بعد کا اور مثنوی کے افکار مولانا کے دوسرے دور کی مستی کی یادگار ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

حوالے | یہ مقالہ "افکار رومی" کی کچھ معمولی اضافوں کیساتھ تلخیص و اختصار ہے۔ زرکلی کی "اعلام" اور رسالہ قشیریہ کے جدید حوالوں کے ساتھ اسکے متن اور حوالوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

---

[۱] الاعلام (حاشیہ) ص ۲۵۹۔

اردو کی ایک قدیم مثنوی

"احوال قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

(۲)

نطھر نگر : نطھر نگر دراصل تروچناپلی (Tiruchchirapalli) کا پرانا نام ہے، یہ اس لیے اس نام سے مشہور ہے کہ یہاں نطھر ولی نام کے ایک بزرگ مدفون ہیں یہ مدراس کے ایک ضلع کا بھی نام ہے اور اس ضلع کے ایک شہر کا بھی"، دی گزیٹیر آف سدرن انڈیا" کی وضاحت کے مطابق "یہ شہر مدراس سے دو سو میل کے فاصلہ پر واقع ہے، اس کی سرحدیں شمال میں جنوبی آرکاٹ سے اور مشرق میں ضلع تنجاور سے ملی ہوئی ہیں اور اس کی مغربی سرحد سے دریائے کاویری اس ضلع میں داخل ہوتا ہے، یہاں کی نطھر صاحب (Nutter saheb) کی درگاہ اس لیے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ یہاں کرناٹک (carnatic) کے متعدد نوابوں کی قبریں بھی ہیں" یہ شہر دراصل آرکاٹ کے نوابوں کا پایہ تخت رہا ہے[۱]۔

شیخ محمد اکرام نے اپنی گرانقدر تصنیف "آب کوثر" میں نطھر ولی اور نطھر نگر کے حالات پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالی ہے انھوں نے لکھا ہے: "جو بزرگ سب سے

پہلے ہندوستان کے بالکل جنوبی علاقے میں آئے اور اندرون ملک میں ارشاد و ہدایت کا مرکز بن گئے، ان میں سے ترچناپلی کے سید سلطان نطہرولی جو ۱۲۲۵ء میں یعنی خواجہ اجمیری کی رحلت سے گیارہ سال پہلے وفات پا گئے، خاص طور پر مشہور ہیں، آپ کے جدامجد ممالک روم کے امراء و حکام میں سے تھے، لیکن آپ کے دل میں محبت الٰہی کا جوش موجزن ہوا اور آپ نے فیصلہ کیا کہ اپنی تمام عمر یاد الٰہی اور اشاعت اسلام میں صرف کروں گا۔ پہلے آپ نے ایران کے شہر ہرمز میں سید علی بادشاہ جولق خلیفہ بابا ابراہیم کی بیعت کی اور ایک مدت تک مرشد کی خدمت کے بعد اپنے رفقاء اور مریدین کے ہمراہ جن کی تعداد نوسو بتائی جاتی ہے، سعادت حج سے شرفیاب ہوئے اسی دوران میں آپ کو اشارہ ہوا کہ آپ دکن جاکر اسلام کو وہاں جاری کرو چنانچہ آپ مریدین کے ہمراہ تلنگانہ تشریف لائے اور وہاں اشاعت اسلام شروع کی، اس وقت یہاں کا حاکم دساسرادیو نامی ایک ہندو تھا، مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے تو آپ کی اس کے ساتھ کوئی چپقلش نہ ہوئی لیکن وہ ایک بڑھیا کے بیٹے کو کسی بات پر قتل کرنا چاہتا تھا بڑھیا فریاد کرتی ہوئی آپ کے پاس آئی، آپ نے اس کے بیٹے کو پناہ دی، اس پر راجا کی آپ کے ساتھ جنگ ہوئی اور تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ آپ اور آپ کے رفیق غالب آئے، اس کے بعد ترچناپلی تشریف لے گئے اور وہیں سنہ ۶۲۲ھ یعنی ۱۲۲۵ء میں وفات پائی، سرکاری گزیٹیر میں لکھا ہے کہ اضلاع مدورا اور ترچناپلی کے کئی مسلمان جنھیں راؤتھر (Raquattars) کہتے ہیں آپ کی بدولت مسلمان ہوئے، آپ کا مزار ترچناپلی کی ایک مشہور زیارت گاہ ہے اور زائرین میں ہندو مسلم دونوں قوموں کے لوگ ہوتے ہیں، بلکہ ہندو زائرین کی تعداد مسلمانوں سے

زیادہ بتائی جاتی ہے، ایک زمانے میں مسلمانوں نے آپ کے نام پر ترچنا پلی کا نام نطہر نگر رکھ دیا تھا، آپ کے مزار کے لیے ایک ہندو رانی میناکشی اور آرکاٹ کے نواب محمد علی نے جاگیریں وقف کیں، آپ کے مزار کے احاطے میں نواب محمد علی اور اس کا مخالف چندا صاحب دفن ہیں، آپ کے مزار کا گنبد چندا صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔[۵۲]

مثنوی نگار نے لکھا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ منتہم سے چل کر نطہر نگر آیا، نطہر ولی کے مریدوں اور عقیدت مندوں کو ان کے آنے کی خبر ملی تو وہ ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوئے اور انہیں لے کر نطہر ولی کی درگاہ میں پہنچے، چنانچہ ان کا کہنا ہے:

بہ فضل حق چلا جب شاہ کئی روز	ہوا نطہر نگر میں شمع افروز
معاً نطہر ولی پاک مشرب	مریدوں سے کہا آ خواب میں تب
ولی اللہ یک آیا ہے اس جا	کرو سامانِ مہمانی مہیا
گئے پھر مل کے سب آگے کئی کوس	ملے قادر ولی سے ہو قدم بوس
بڑی توقیر اور عزت سے لائے	شرف آنے سے اسکے سب نے پائے

تنجاور: ترو چراپلی کی طرح تنجاور (Thanjavur) بھی مدراس کے ایک ضلع اور اس کے ایک اہم شہر دونوں کا نام ہے، 'دی گزیٹیر آف سدرن انڈیا' کی وضاحت کے مطابق اس کے شمال میں ترو چراپلی اور جنوبی آرکاٹ واقع ہیں جنھیں نہر کوسلے رون (coleroon) تنجاور سے الگ کرتی ہے، اس کے جنوب میں شیوگنگا کی زمینداری اور تونڈیمین راجا کی ریاست ہے اور اس کے مشرق میں سمندر، تنجاور کے بیچ میں سے ایک نہر گذرتی ہے جو ویٹ آر (Vettar) کہلاتی

ہے، یہ نہر ناگور کے پاس جاکر سمندر سے مل جاتی ہے، اس ضلع کی چند چھوٹی بندرگاہوں کے نام ہیں، ناگاپٹنم (Nagapattinam) ٹرنکوبار (Tranquebar) مُتوپیٹ (Mutupet) تورومالاواسیل (Toromalavasil) اور ناگور (Nagore)۔

مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مرید ترو چراپلی میں زیادہ دن نہیں رہے، وہاں سے چل کر وہ تنجاور آئے، تنجاور کے لوگوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا، ان دنوں تنجاور کا راجا سخت بیمار تھا، وہ قادر ولی کی آمد کی خبر سنکر ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی بپتا سنائی، قادر ولی نے اس کے حق میں دعا کی، وہ اچھا ہو گیا، راجا نے انھیں انعام و اکرام سے نوازنا چاہا، قادر ولی نے "نہ مانا" صرف اس کے ملک کی تھوڑی سی زمین مانگی جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی دن گذار سکیں اور مرنے کے بعد دفن ہوں، راجا نے کھلی اجازت دے دی، آپ اس زمین کو اپنی زمین سمجھیں اور جہاں پسند خاطر ہو وہاں بسیرا کریں۔ لکھا ہے:

وہاں سے پھر وہ مقبول الٰہی ہوا جلد تنجاور کو راہی
کرم سے حق کے جب وہ شاہ کامل ہوا ہے شہر تنجاور میں داخل
لگے ملنے کو واں کے لوگ آ کُل ولی حق کا بستی میں پڑا غل
تھا ان روزوں میں راجا سخت بیمار عجب کچھ لادوا تھا اس کا آزار
سنا راجا نے جو حضرت کا احوال ہوا دل میں نہایت اپنے خوشحال
معاً پھر بیٹھ کر ڈولی میں راجا حضور شاہ آیا ہاتھ باندھا
گرا بے اختیاری سے قدم پہ کہا پھر یوں زمیں پہ سر کو رکھ کر

مجھے صحت عطا کر شاہ عالی
چلا مت اپنے در سے ہاتھ خالی

کہا تب شاہ مت ہو گھابرا تو
کیا ہیگا کسی نے تجھ پہ جادو

خدا کے حکم سے کرتا ہوں اب توڑ
نکل جاتا ہے تیرے تن کا سب کھوڑ

کہا خادم کو اپنے پھر بلا کر
ہے اس راجا کے گھر میں یک کبوتر

تو اس کے نوکروں کو ساتھ لیجا
کسی ڈھب اس کبوتر کو پکڑ لا

کبوتر کو لے آئے شاہ کے پاس
اسے لے کر کے دیکھا سر و ناس

دعا پڑھ کر جو سر کی سوئی نکالا
تو نکلا آنکھ کے راجا کا جالا

نکل گئی ناتوانی اور سستی
ملی راجا کو یک دم تندرستی

کہا حضرت کے پاؤں پڑ کے راجا
مجھے تو جان بخشا دلنوازا

میں اس احسان کا بدلہ کروں کیا
مگر دیتا ہوں جو ہے ملک میرا

کہا شہ ملک مجھ کو نئیں ہے درکار
رہے تجھ کو مبارک تیرا سرکار

عقیدت تجھ کو گر پوری ہے دل سے
تو اپنے ملک سے تھوڑی زمین دے

کہ جیتے جی کروں میں اس میں بستر
مرے بعد از مری ہو قبر اس پر

کہا راجا زمیں سب اپنی بوجھ
جہاں ہووے پسند طبع واں رہو

ترو الّور: (Trivatoor) گزیٹیر آف سدرن انڈیا کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ موجودہ تر پاتور (Tiruppattur) ہی کا پرانا نام ہے جو مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ میں واقع ہے اور اس ضلع کی ایک تحصیل ہے، یہ شہر محمد علی اور چندا صاحب اور ٹیپو سلطان اور انگریزوں کی لڑائیوں میں ان کی فوجوں کی چھاونی بھی رہ چکا ہے، یہاں ہندوؤں کے متعدد قدیم مندر ہیں جن میں

ایک مندر کے دروازے پر مضبوط اور بھاری لکڑی کا بنا ہوا ایک تیر (بروزن تیر، رتھ) کھڑا رہتا ہے جس میں وہ اپنی دیوی دیوتاؤں کو بٹھا کر سال میں ایک بار ایک بڑا سا جلوس نکالتے ہیں، اس تیر کو کھینچنے کے لیے ایک دو نہیں سینکڑوں آدمی لگتے ہیں، اس موقع پر وہاں ایک جترا (میلہ) بھی ہوتا ہے جس کو دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں، اس شہر میں ان مندروں کے ساتھ ساتھ بزرگوں کی درگاہیں بھی ہیں، جن کا ہر سال عرس ہوتا ہے،

مثنوی میں بتایا ہے کہ قادر ولی اور ان کے مرید تنجاور کے بعد عین اس جترے کے موقع پر ترواتور پہنچے تو مندر کے پجاریوں نے انھیں شرمندہ کرنے کی غرض سے انھیں اس تیر کے کھینچنے کی دعوت دیدی، مگر مسلمان اس امتحان میں پورے اترے، تفصیل مثنوی نگار کی زبانی ملاحظہ ہو:

وہاں سے شاہ ترواتور آیا — تھا اس بستی میں جترے کا سمایا
مچا تھا گاؤں میں جترے کا غوغا — اسی کا چو طرف غل ہو رہا تھا
پجاری جو سنے حضرت کا آنا — کہے اب اس گدا کو آزمانا
عیاں اس سے نہ ہوگی جب کرامت — مسلمانوں کو ہووے گی ندامت
یہی تجویز کر کے سارے یک بار — پجاری آ، کیے حضرت سے اظہار
برس کو کھینچتے ہیں تیر جو ہم — ہزاروں اس کو لگتے ہیں گے عالم
چلاویں گے اگر بے آدمی کے — تو ہم سب مانتے ہیں تم کو جی سے
پجاریوں سے سخن سن شاہ میراں — کیا اس دیو کو پتھر کے قرباں
تو جلدی کھینچ اپنا تیر اے سنگ — پجاری تیرے تا ہوں دیکھ کر دنگ

ہوا جب حکم شہ بت پہ جاری
بہت حیرت کیے سارے پجاری

بزرگی شاہ کی ہر یک نے بوجا
عقیدت سے لگے کرنے کو پوجا

وہاں سے گاؤں کے جب باہر آیا
ہر یک جا دھان کا واں کھیت پایا

پڑھا ہے فاتحہ وہ اس جگا پر
سبب اُس کا مریداں پوچھے آکر

کہا یہ دو بزرگاں کی جگہ ہے
اسی جا دفن ان کے تئیں کیا ہے

بیرم پیٹ : یہ شہر بھی ضلع شمالی آرکاٹ میں واقع ہے اور تریا پور سے پچاس ساٹھ میل کے فاصلہ پر ہے، اس کا موجودہ نام پیرم پیٹ (Pernambet) ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ تریاپور کے بعد اس قافلہ کی دوسری منزل بیرم پیٹ تھی، قادر ولی اور ان کے مریدوں نے کچھ دن وہاں بھی قیام کیا، وہاں مسجد نہیں تھی، مسجد بنوائی، لکھا ہے:

جو بیرم پیٹ کو تشریف لائے
وہاں کے لوگ سب خدمت میں آئے

لے آئے کھانا سب گھر سے پکا کر
رکھے ہیں روبرو حضرت کے لاکر

کہا اس گاؤں کے لوگاں سے سرور
نہیں مسجد ہے اس بستی کے اندر

بنائے ایک مسجد اُس جگا پر
کیے ہیں کام سب بہتر نہ بہتر

ترکلا چیری : اس نام کا کوئی شہر مدراس کے نقشے میں نہیں ملتا، البتہ پانڈیچیری (Pondicherry) کا علاقہ مدراس کے ضلع شمالی آرکاٹ سے قریب ہے، یہ دراصل پدوچیری (Puducheri) تھا جو بعد میں پانڈیچیری بن گیا ممکن ہے اسی کا قدیم نام ترکلا چیری ہو، ہندوستان کی آزادی کے وقت یہ علاقہ فرانسیسیوں کے قبضہ میں تھا، ۱۹۵۴ء میں انھوں نے ایک معاہدہ کے تحت اس کو

ہندوستان کے حوالہ کیا اور اب یہ یونین ٹیری ٹیری میں داخل ہے،

یہ قافلہ پیرم بیٹ کے بعد ترکلاچیری آیا، وہاں کے لوگ ان کی آمد کی خبر سنکر ملاقات کے لیے حاضر ہوئے اور تحفے تحائف ساتھ لائے، قادر ولی نے ان کے حق میں دعا کی:

ولی حق جو وہ مسجد بنائے — وہاں سے ترکلاچیری کو آئے
کیے ہیں لوگ وہاں کے آملاقات — لے آئے گھر سے اپنے نذر و سوغات
کیے ان سب پہ حضرت مہربانی — دیا ہر یک کو گنج شادمانی

انڈومان: جزائر انڈومان ونکوبار (Andoman and Nicobar Islands) یہ جزائر خلیج بنگال (Bay of Bengal) میں واقع ہیں اور آزادی سے پہلے اور بعد دونوں ہی زمانوں میں ہندوستان کا حصہ رہے، انڈمان دو سو چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ہے اور نکوبار انیس[19] جزیروں پر، پورٹ بلیر (Port Blair) ان کا پایۂ تخت ہے، آزادی سے پہلے یہ علاقہ کالا پانی کے نام سے مشہور تھا اور انگریز اسے اپنے سیاسی قیدیوں کو نظر بند کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے، آزادی کے بعد ان جزائر کو یونین ٹیری ٹیری (Union Territory) قرار دیا گیا[3]

جغرافیائی اعتبار سے یہ علاقہ بنگال کے مقابلہ میں مدراس سے زیادہ قریب ہے اور یہاں اور لوگوں کے ساتھ ساتھ مدراس کے باشندے بھی بکثرت آباد ہیں چنانچہ ۱۹۸۹ء کے لوک سبھا کے انتخاب کے دوران میں ڈی، ایم، کے، کے صدر ایم۔ کروناندھی نے اپیل کی تھی کہ وہ ان جزائر میں کانگریس (ایس) کے امیدوار

کندا سوامی کو ووٹ دیں، جو لوگ اس کی خلاف ورزی کریں گے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

مثنوی میں ان جزائر کا بھی ذکر ہے، مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تا در ولی تری کلاچیری کے بعد اپنے مریدوں کے ساتھ انڈمان بھی جانا چاہتے تھے مگر ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، البتہ بعد میں خواجہ خضر نے کشف کے ذریعے ان کی یہ تمنا پوری کر دی اور انھیں ان علاقوں کی سیر کرائی، لکھا ہے:

کسی نے تب کہا اے شاہ نیکو — کہ ہیگا اندمان نام ایک ٹاپو
وہاں حضرت سلیماں کا مکاں ہے — اور ایک پارس کے پانی کا کنواں ہے
سنا جب شاہ اس ٹاپو کا مذکور — رکھا دل میں اور آیا میل ناگور

اس سلسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے:

ارادہ تھا کہ حکم خضر لے کے — وہ پارس جل کا ٹاپو جا کے دیکھے
جناب خضر مثل فضل باری — ملا قادر ولی سے ایکباری
ولی اللہ اس کا کر کے اعزاز — کہا یوں اے خدا کے محرم راز
کہ میں چہتا ہوں پارس جل کے جاؤں — سلیماں کے مکاں کو دیکھ آؤں
کہا تب خضر نے یہ تصدمت کر — نہیں یہ بات ہووے گی میسر
گر اس کے دیکھنے کی ہے تمنا — بتاتا ہوں کرامت سے میں وہ جا
یہ کہہ کے کشف سے ان کو بتایا — یہاں سے بیٹھے بیٹھے شاہ دیکھا

میل ناگور: مدراس کے نقشے میں اس نام کا کوئی شہر نہ ملا۔ شاید یہ ناگور کے قریب کوئی پرانی آبادی ہو، کیونکہ تامل میں "میلا" کے معنی ہیں اوپر یا بالائی حصہ کے

اس طرح میل ناگور کا مطلب ہوا "ناگور کا بالائی حصہ"

مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قافلہ ترکلا چیری سے انڈمان نہ جا سکا تو تنجا ور لوٹ آیا اور میل ناگور میں قیام پذیر ہوا، مثنوی کی وضاحت کے مطابق میل ناگور ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں بڑی سی ایک سنہری مسجد بھی تھی، یہاں کے تاجر بہت خوش حال تھے مگر مغرور، قادر ولی نے انھیں نصیحت کی کہ وہ سب سے خلق و مروت سے پیش آئیں، لکھا ہے:

سنا جب شاہ اس ٹاپو کا مذکور ۔۔۔ رکھا دل میں اور آیا میل ناگور
کیا اس جا اقامت آ کے سرور ۔۔۔ تھی بستی بستی یک کو چک سراسر
سنہری ایک مسجد واں بڑی تھی ۔۔۔ بڑی سوداگروں کی گڑ بڑی تھی
وہ تھے سوداگراں سب مال پرست ۔۔۔ تھے اپنے ہاتھیوں کو دیکھ خرست
نہیں خاطر میں لاتے تھے کسی کو ۔۔۔ بہت مغرور تھے اور سخت بد خو
کیا حضرت نے ان کو یہ نصیحت ۔۔۔ کہ ہر یک سے کرو خلق و مروت

ناگور: (Nagore) جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے، ناگور مدراس کے ضلع تنجاور کا ایک ساحلی شہر ہے اور تنجاور کی پانچ بندرگاہوں میں ایک اہم بندرگاہ سمجھی جاتی ہے، سدرن گزیٹیر کی وضاحت کے مطابق یہاں ایک عالی شان مسجد ہے جس کے ۹۰ فٹ بلند دو مینار ہیں، یہ مسجد اپنے ان دو خوبصورت میناروں کے ساتھ ایک تاریخی یادگار معلوم ہوتی ہے، ان میناروں کی ساخت شمالی ہند کی مسجدوں کے میناروں کے مقابلے میں چینی پگوڈوں کے طاوروں سے زیادہ ملتی جلتی ہے[۵]

قادر ولی اور ان کے مریدوں کا یہ قافلہ اب میل ناگور سے ناگور میں داخل ہوا۔

تنجاور کے راجا کو جب ان کی واپسی کی خبر ملی تو اس نے ہرکارے دوڑائے کہ معلوم کرو قادر ولی کہاں قیام کرنا پسند فرماتے ہیں، قادر ولی نے ایک خاص جگہ کی نشاندہی کی، راجا نے نہ صرف یہ کہ پوری خوشی سے وہ زمین ان کے حوالہ کر دی، بلکہ ان کے لیے اسکو آراستہ و پیراستہ کر کے رشک گلستاں بنا دیا، لکھا ہے :

غرض واں سے قدم شہ نے اٹھایا — اور اس ناگور میں تشریف لایا
نہ تھی بستی کہیں واں آشکارا — تھا جنگل اور دریا کا کنارا
پسند آئی جگہ وہ شاہ دیں کو — اتر کر واں دیا عزت زمیں کو
خبر لینے کو تنجاور کا راجا — کئی پوشیدہ ہرکارے رکھا تھا
کہا حضرت کو جو جا گا پسند آئے — شتابی پاس میرے خبر لائے
کہے ہرکارے جا راجا سے یہ طور — معاً خود دوڑ تا آیا ہے فی الفور
کہا سب ملک میرا ہیگا حاضر — جو چاہو لیو وہ اے شاہ قادر
کہا شہ ملک لے کر کیا کروں سب — یہاں اب بستر کی دے جگا اب
معاً راجا نے کٹوا وہاں کی جھاڑی — لگایا جھاڑ کی سب پھول باڑی
ولی حق خوشی سے واں اتر کر — نشان اپنا چڑھایا اس جگہ پر
ہوئی وہ سرزمیں سب رشک گردوں — لگا نقارہ بجنے شہ کا دوں دوں
لگا ہونے ولی کا واں ظہورا — سفر مہ کا ہوا اس دن سے پورا

وانجور، ناگ پٹن اور دھنا سری: جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے قادر ولی کے دوبارہ تنجاور آنے اور ناگور کو اپنی آخری قیام گاہ بنا لینے کے بعد ان کا زندگی بھر کا سفر گویا ختم ہو گیا مگر بعد کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی ایک جگہ مستقل طور پر نہ رہ سکے، دور دور کا

سفر تو یقیناً ختم ہو چکا تھا مگر قریب کے علاقوں کا سفر پھر بھی جاری رہا۔ ان کے اس مقامی سفر کے سلسلے میں جن جگہوں کے نام ملتے ہیں ان میں وانجور، ناگ پٹن اور دھناسری قابل ذکر ہیں۔

ان علاقوں میں وانجور اور دھناسیری کے نام مدراس کے نقشے میں نہیں ملتے۔ یا اب ان کے نام بدل گئے ہیں یا وہ اتنے چھوٹے ہیں کہ ان نقشوں میں ان کی نشاندہی نہیں کی گئی، صرف دھناسری کے متعلق خود مثنوی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی البتہ ناگ پٹن (NagapaTTinam) کا نام ان نقشوں میں جلی حرفوں میں ملتا ہے اور جیسا کہ ہم نے تنجاور کے تعارف کے سلسلہ میں اوپر بیان کیا ہے، ناگ پٹن تنجاور کی پانچ چھوٹی بندرگاہوں میں سے ایک ہے اور ناگور کے قریب ہی واقع ہے، علاوہ ازیں وہ ضلع تنجاور کی ایک تحصیل ہے اور ناگور اسی تحصیل میں شامل ہے، ان علاقوں کے سفر کے بارے میں مثنوی میں جو تفصیل ملتی ہے وہ حسب ذیل ہے:-

یکایک شاہ کا آیا ارادہ	کہ ندی پار جاؤں پا پیادہ
گیا وانجور کو خود آپ فی الفور	کھدایا ایک گڑھا واں قبر کے طور
معاً اس غار میں جوں مال بیٹھا	خوشی سے اسکے اندر چال بیٹھا
کئی دن تک رہا وہاں بے خور و خواب	صفائے دل سے مثل چشمۂ آب
کیا ایک روز یہ خواہش کہیاں سے	دھناسیری کو جانا جسم و جاں سے
بتائے تا کرامت واں وہ سالار	اکیلا ناگ پٹن پہنچا وہ ایک بار
یہ رتبہ صاحب اقبال کا ہے	ولی و قطب اور ابدال کا ہے

جہاں چاہیں وہ یک دم میں چلے جائیں		گھڑی میں کچھ کا کچھ قدرت کو تبلائیں

سفرِ آخرت: مثنوی کی وضاحت کے مطابق دھنا سری گویا ان کی آخری قیام گا
تھی، وہاں وہ کئی دن دینِ اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، مقامی راجا اور اس کی رعایا کو مشرف
بہ اسلام کیا، مسجدیں تعمیر کرائیں اور ان مسجدوں میں ذکر و فکر اور خدا کی عبادت کا انتظام
کیا، اس طرح جب ان کا مشن پورا ہو گیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے
لگے تو اب ان کا صرف سفرِ آخرت باقی رہ گیا، چنانچہ بہت جلد وہ گھڑی بھی آپہنچی اور
ایک دن وہ صبح ہوتے ہوتے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مثنوی نگار کا بیان ہے:

جہاز یک دم وہاں سے پھر ہوا سا		دھنا سیری کے آبندر کو پہنچا
ولی اللہ بن کر جوں قلندر		گئے یک بار اس بندر کے اندر
جو اس بستی میں پہنچا شاہ آکر		تہاں سب گر پڑے ہیں تھر تھرا کر
ہوا حضرت کا واں پھر شہرہ یکبار		لگے آنے کو اندھے لنگڑے بیمار
شفا پانے لگے اس کی دعا سے		ہوئے نزدیک اپنے مدعا سے
ہوئے محکوم اسکے با دل و جان		مسلماں ہو گئے راجا و پردھان
بنائے ہیں مساجد جا بجا پر		کیئے آراستہ اسلام کا گھر
لگی ہونے صلوٰۃ و صوم ہر دم		ہوئے تکبیر کے مشغول باہم
لگا واں وعظ کہنے صبح اور شام		سکھایا سب کو دینداری کے احکام
کہا یک روز ان سب کو بلا شاہ		کہ کل ہے موت میری انا للہ
قضا را صبح کو پھر مر گیا وہ		دلوں پر داغ ماتم دھر گیا وہ

رحلت کی تاریخ: مثنوی نگار نے قادر ولی کے اس آخری سفر کی تاریخ د

بتائی ہے اور لکھا ہے کہ رحلت کے وقت ان کی عمر ۸۶ سال کی تھی، اس سلسلہ کے بعض شعر ملاحظہ ہوں:

نکل کر تن سے اسکے روح اطہر — گئی فردوس میں مسکن مقرر
رہا جا سرور لولاک کے پاس — گیا ہے اپنے جد پاک کے پاس
تھے سن نو سو پہ ستر اس پہ اٹھ اور — کہ جنت کو گیا سالار فی الغور
ہوئی تھی پوری اٹھ سٹھ عمر والا — نہیں اس بات میں کچھ شبہ اصلا
تھا آخر کا مہینہ جمعہ کی شب — دہم تاریخ تھی اس چاند کی تب

درگاہ اور عرس: مثنوی نگار کی وضاحت کے مطابق قادر ولی کی درگاہیں تین جگہ ہیں، دھنا سیری، ناگور، اور دانجور اور تینوں ہی جگہ ان کا عرس ہوتا ہے، دھنا سیری اور ناگور میں بڑے پیمانے پر اور دانجور میں ذرا چھوٹے پیمانہ پر، لکھا ہے:

دھنا سیری کے لوگاں اس جگہ پر — بنائے ہیں بڑی درگاہ بہتر
ابھی تک عرس وہاں ہوتا ہے ہر سال — وہاں بھی ہے سدا ناگور کا حال
ہے جو دانجور میں چلہ کی جاگا — وہاں بھی تھوڑا سا ہوتا ہے میلا

جانشینی: قادر ولی نے زندگی بھر شادی نہیں کی، جب کبھی کسی نے ان کے سامنے ان کی شادی کا مسئلہ رکھا تو انھوں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ

نہ دو تکلیف شادی کی مجھے اب — نہیں اس بات سے کچھ مجھکو مطلب

البتہ ان کے قیام لاہور کے زمانے میں جب ایک خدا ترس اور دیندار جوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے بے اولاد ہونے کا دکھ ظاہر کیا تو قادر ولی نے ان کی اولاد کے لیے دعا کی اور یہ شرط رکھی کہ تم اپنے پہلے لڑکے کا نام یوسف رکھنا اور اس کو میرے

حوالے کردینا، میں اس کو اپنے لڑکے کی طرح پالوں گا اور اپنا جانشین بناؤں گا اور اور ایسا ہی ہوا۔ جب ان دونوں کے پہلا لڑکا ہوا تو انھوں نے اس کا نام یوسف رکھا اور پال پوس کر ذرا بڑا کرنے کے بعد قادر ولی کے حوالہ کردیا، شاہ یوسف قادر ولی کے سفر حج کے زمانہ سے لے کر ان کی زندگی کے آخری لمحات تک انھیں کے ساتھ رہے اور انھیں کے زیر تربیت رہے اور انھوں نے اپنی زندگی ہی میں شاہ یوسف کو اپنا خلیفہ بھی بنادیا تھا مثنوی نگار کی زبان میں قادر ولی نے شاہ یوسف سے کہا تھا:۔

خلیفہ اور وارث میرا تو ہے   تو ہی پیچھے مرے اور روبرو ہے

اور قادر ولی کی وفات کے بعد خواجہ خضر نے اس پر اپنی مہر تصدیق یہ کہہ کر ثبت کردی کہ:

وہی تو ہی ہے اس قطب زماں کا   ہے اب تو جانشیں اسکے مکاں کا

شمال وجنوب کو جوڑنے والی ایک کڑی | اوپر ہم نے قادر ولی کے حالات زندگی اور اور ان کے تبلیغی سفر کے بارے میں جو کچھ اس مثنوی کی مدد سے لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ قادر ولی کا بچپن مانک پور میں گذرا، جوانی گوالیار اور لاہور میں، درمیانی حصہ حجاز کی مقدس سرزمین پر اور آخری زندگی مدراس کے گرد و نواح میں

اس طرح وہ شمالی ہند میں پلے بڑھے تو جنوبی ہند میں مرے اور دفن ہوئے، ہندوستان کے شمال وجنوب نہ صرف آب وہوا اور موسم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ وہاں کے لوگوں کا رہن سہن، ان کے طور طریقے اور انکی زبانیں بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں، اسی لیے سفر حج سے واپسی کے بعد جنوبی ہند کے

آخری سرے پر ناگور جیسی ایک انجانی بستی میں مستقل قیام کا فیصلہ کرنے سے پہلے انھیں کافی سوچنا پڑا اور آخر خواجہ خضر کی یقین دہانی پر وہ ہمیشہ کے لیے وہیں مقیم ہو گئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے۔ اس طرح وہ ایک ایسی مضبوط کڑی بن گئے جو شمال کو جنوب سے جوڑتی ہے، مثنوی نگار نے قادر ولی کے اس تردد اور خواجہ خضر کی یقین دہانی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

کہا تب خضر حکم خالق رب　　ترے حق میں ہوا ہے اس طرح اب
کہ تو دائم رہے اس سرزمیں پر　　کیا ہے قطب تجھ کو یاں کا داور
یہی تیری سدا رہنے کی جا ہے　　یہ تیرے دفن ہونے کی جگہ ہے
کہا شہ نے وطن میرا بہت دور　　کہا یورپ کہاں صحرائے ناگور
ہے یاں کے لوگوں کی چال اور زبان اور　　بنے گی ان سے صحبت مجھ کو کس طور
ترے بعد آویں گے یہ کیا مرے کام　　رہے گا کس طرح ان سے مرا نام
کہا تب خضر نے اے شاہ میراں　　ترے سب کام کا حق ہے نگہباں
ہے وہ والی ترا جیتے موئے پر　　کرے گا حق ترے سب کام بہتر
یہاں ہر سال ہوگا عرس تیرا　　ترے در پر رہے گا سب کا پھیرا
زیارت کو تری یاں آئیں گے سب　　تری درگاہ سے پاویں گے مطلب

ناگور اور تروپتی کا موازنہ: موجودہ اندھرا پردیش کے ضلع چتور (ChiTToor) میں ایک شہر ہے (TirupaTi) یہ شہر ٹامل ناڈو کے شمال مغرب میں واقع ہے اور ہندوستان کی لسانی تقسیم سے پہلے صوبۂ مدراس کا ہی ایک حصہ تھا، یہ شہر اپنے تروملے (Tirumalay) کی پوتر پہاڑیوں پر واقع وینکٹیشور مندر

کے لیے مشہور ہے ہر سال لاکھوں ہندو اس کا درشن کرتے ہیں[۶] ناگورا و ترودیتی کا موازنہ ملاحظہ ہو۔

ہے کرناٹک میں قریہ تریتی کا　　　جہاں پوجا ہے نت جن جیتی کا

کہا واں یک مسلماں سے پوجاری　　　عجب اس دیو کا ہے فیض جاری

مراد خلق یاں ہوتی ہے حاصل　　　بہت ہر یک کو ہوتا ہے محاصل

ہے ادنی یہ کرامت آتشکا را　　　کہ نئیں اس جا مسلماں کا گذارا

مسلماں گر کیا واں جانے کا دھیان　　　تو مکھیاں کاٹتے ہیں اسکو اس آن

تمھارے پیر کی ہے ایسی درگاہ　　　اگر ہے تو کرو ٹک مجھ کو آگاہ

مسلماں نے جواب اسکو دیا یوں　　　کہ بیجا بات تو بکتا ہے اب کیوں

نہیں دیکھا سنا شاید لے ناداں　　　جو ہے درگاہ میں ناگور کی شان

ہے وہ درگاہ بے شک جاگتی جوت　　　بنے موتی وہاں گر آوے بے لوت

اُسے ہندو مسلماں مانتے ہیں　　　سب اس کو اپنا قبلہ جانتے ہیں

سراسر نور ہے وہ اور یہ خاک　　　چہ نسبت خاک را با عالم پاک

وہ ہندو اس سخن سے کرکے انکار　　　لیا جھٹکے سے گردن پھیر یک بار

ہوئی اُس وقت منڈیا اسکی ٹیڑھی　　　رگوں کی پھر گئی گردن میں سیڑھی

نپٹ ہوگا ہرا وہ بے حیا تب　　　لگا ہے عاجزی سے کہنے اس ڈھب

مجھے اے صاحب ناگور بخشو　　　کرو آزار میرا دور بخشو

دعا مانگا جو توبہ کرکے بادل　　　خدا اس کو کیا آسان مشکل

حوالے

[۱] GAZETTEER OF SOUTHERN INDIA, MADRAS, 1855, P.-343.

[۲] شیخ محمد اکرام: آبِ کوثر فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۵۸-۳۵۷

[۳] READERS DIGEST, UNIVERSAL DICTIONARY 1988, P.-66.

[۴] NEWS ITEM, TIMES OF INDIA, BOMBAY, NOVR: 16. 1969.

[۵] GAZETTEER OF SOUTHERN INDIA, MADRAS, 1855, P-365.

[۶] CYCLOPEADIA OF INDIA PT: II.

یوگ واشسشٹھ کے فارسی اور اردو تراجم

از جناب رام لعل نابھوی ، نابھا، پنجاب

یوگ واشسشٹھ سنسکرت کی ایک بہت پرانی تصنیف ہے۔ یہ ضخیم گرنتھ ہے۔ اسے یوگ واشسشٹھ مہارامائن اور یوگ واشسشٹھ آتم بودھ مہارامائن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف فلسفوں کو بیان کرتی ہے۔ کچھ لوگ کرم کو پردھان مانتے ہیں اور کوئی گیان کو اور کوئی اپاسنا کو۔ اس گرنتھ میں کرم اور گیان دونوں کو پردھان مانا گیا ہے۔ اسے چھ پرکرنوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) بیراگ پرکرن (۲) مچھ پرکرن (۳) اتپت پرکرن (۴) استھت پرکرن (۵) اپشم پرکرن (۶) نروان پرکرن

بیراگ پرکرن میں راجندر جی کے پرشن ہیں ممکش پرکرن میں شک نرمان ہی کہا ہے۔ اتپت پرکرن میں آٹھ اتہاس ہیں استھت پرکرن میں چار اتہاس ہیں یہ اپشم پرکرن میں ۱۱ اتہاس ہیں۔ نروان پرکرن میں ستائیس اتہاس ہیں۔ یعنی چار وں پرکرنوں میں کل پچاس اتہاس لکھے گئے ہیں۔

اسے مہرشی والمیک نے سنسکرت میں لکھا۔ مختلف مہرشیوں کے خیالات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس گرنتھ کے تراجم مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ فارسی اور اردو میں قلمی نسخے اور چھپے ہوئے نسخے دور دراز جگھوں پر ملتے ہیں۔ لیجئے نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔ مسلمانوں نے یہاں بھی اپنی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے۔

فارسی میں یوگ واشسٹھ

نمبر شمار	نام یوگ واشسٹھ	نام مصنف / مولف / مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال تالیف / تاریخ کتابت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	مختصر یوگ باشسٹ	ابو الفضل	مخطوطہ		×	۲۱۵	۱۴×۹-۲۲×۱۵ C.M		یہ نسخہ قلمی بہ نمبر ۱۸۸ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ہے دیکھئے کیٹلاگ مخطوطات مولانا آزاد لائبریری I ۱۷۵ پارٹ دوئم حبیب گنج کلکشن صفحہ ۱۹۵
۲	جوگ باشسٹ	پنڈت کشمیری	مخطوطہ		×				یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان جلد چہارم صفحہ ۲۱۴۹ تفصیل نیچے درج ہے۔ ۳۸۹۴۔ جوگ باشسٹ تن اصلی از پنڈت کشمیری عرفان کونستیک ہندی ست (ن، ک، پس ازاین) ترجمہ از فرطی (۱۵۵۶-۱۶۰۶م) آغاز: حمد و سپاس مر مبدی راکہ عالم را از زاویہ نیستی بہ صحرای ہستی آورد ۱۱۶۳۲۔ لاہور، کتاب خانہ عموی پنجاب ۵۔ ۲۹۴ جوگ فر:

نمبر شمار	نام و موضوع کتاب یا نسخہ	نام مصنف یا مؤلف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ کتابت یا تاریخ مخطوطہ	سال تصنیف یا تالیف یا سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
									نستعلیق، کمال الدین، تاریخ یاد نشدہ، آغاز برابر نمونہ، در فہرست مترجم فرلی یاد شدہ، ۹۷۰ اک ۳۶۹س، عباسی: ۲۴)
۳	ترجمہ جوگ باشسٹ	دارا شکوہ	مخطوطہ	—	*	×	×	منثور	یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲۱۴۹ فہرست مخطوطات فارسی ایران و پاکستان مرکز تحقیقات فارسی۔ جلد چہارم تفصیل نیچے درج ہے۔ ۳۸۹۵۔ ترجمہ جوگ باشسٹ متن ہمان، ترجمہ بہ آنچنانکہ ریو (۱: ۶۱) نوشتہ از حبیب اللہ (کہ نامش در نسخہ ہای آزیر نیامدہ است) بہ دستور شاہزادہ دارا شکوہ (م ۱۰۶۹ھ/ ۸-۱۶۵۹م) بہ سال ۱۰۶۶ھ/ ۶-۱۶۵۵م۔ در دیباچہ می نویسد: کہ بیش از این کتاب بشست ترجمہ شدہ بوذ اما وی

کیفیت

درکار خود دوازده جای سانسکریت و تمثیلات را بیشتر توضیح داده است، و گفته های دانشمندان و پیشوایان هند و را نیز در آن جای داده است در نسخه گنج بخش (۱۴۹۰) این مطلب را چنین بیان می کند، که در شهور ۱۰۶۶ھ، شاهزاده داراشکوه، دستور داد این کتاب را در حضور ما ترجمه کند، و سخنان هر طائفه را طبق تحقیق ما، که در اکثر مواضع تقریر کنیم تسوید نمایند، یکی از حاضران به این خدمت پرداخت،

در شش "پرکرن": ۱- بیراگ (وحشت و نفرت از رسوم و عادات اهل عالم) ۲- موچهہ بیوہار (تدبیر قطع تعلق از مراتب) ۳- اتپت (آغاز نمود جهان) ۴- استهت (بقای نمود عالم) ۵- اپشم (فنای نمود جهان) ۶- نربان (رستگاری از تکرار تنزلات)

آغاز: سپاس و ستایش و تمام نیایش نثار حضرتی ست که ذرات اکوان فروغ یافته، آفتاب حقیقت،

(ن، ک، ریو ۱: ۶۱ "جوگ باشست" سه نسخه حبیب الله (؟) اته: ۲۹۲۰ "جوگ باشست" ترجمه ۲، ۱۹۱ و ۱۹۷۱۔ نسخه ها ۲: ۸، ۷ "جوگ باشست"۔ ذریعه ۴: ۲۹ "ترجمه کتاب جوگ" ترجمه نظام الدین برای سلطان سلیم)۔

۱۱۶۳۳۔ کراچی، انجمن ترقی اردو ا ق ف ۵۳: نستعلیق، سکھ ناتھ پاسکھانت ساکن بیانه، بروزگار اورنگ زیب (۱۰۶۸-۱۱۱۸ھ) آغاز افتاده، ۲۵۳ ص،

۱۱۶۳۴۔ اسلام آباد، گنج بخش ۱۴۹۰: نستعلیق شکسته، هر دیال عرف سنگلو ساکن پیشاور، ۲۸ ذیقعده ۲۲ جلوس محمد پادشاه (۱۱۵۲ھ ؟) آغاز برابر نمونه ۱ (ص ۱-۴۵۸)، (گنج ۴: ۵۹۴)

۱۱۶۳۵- کراچی، موزه ملی ۵-۱۰۵/۱۰۵۲۸. N.M: نستعلیق شکسته آمیز، سدهٔ ۱۲ھ
آغاز و انجام افتاده، ۲۰۷ ص،

۱۱۶۳۶- کراچی، بهانبجا ۱۷/۹۱۲-۱۹۵۷-۹۱۲. N.M: شکسته، سدهٔ ۱۲ھ،
انجام افتاده، ۲۲۰ ص (نوشاهی: ۹۱۲)

۱۱۶۳۷- کراچی، انجمن ترقی ا ق ف ۵۸: نستعلیق، دولت رای، ۲۵ ذیقعده
۱۲۰۰ھ، ۱۲۴ ص (سرفراز: ۳۷۷، ۳۷۹- نوشاهی)

۱۱۶۳۸- کراچی، موزه ملی ۲۰-۱۹۶۷. N.M: نستعلیق، حقیقت رای بن
عمل رای میرانی، ۱۹ محرم ۱۲۱۱ھ- ۴۳ ص،

۱۱۶۳۹- کراچی، بهانبجا ۱۰۷۶-۱۹۵۷. N.M: نستعلیق، (هیرا) لعل،
۱۲۲۰ھ یا ۱۲۴۰ھ، در مرادآباد، ۲۵۷ ص (نوشاهی: ۹۱۲)

۱۱۶۴۰- کراچی، انجمن ترقی ا ق ف ۵۲: نستعلیق، رای شیوک رام بن رای
سکه راج، ۱۵ شوال ۱۲۳۳ تا ۲۲ محرم ۱۲۲۳ھ، از روی نسخه نوشته ۲۸ شوال
۱۱۶۱ھ، ۲۵۰ ص،

۱۱۶۴۱- کراچی، بهانبجا ا ق ف ۵۴: بیا را ... محکم سنگه ساکن رهتک، ۱۹ ع ۲/
۱۲۳۹ھ، در اکبرآباد، آغاز افتاده، ۳۷۶ ص (سرفراز: ۳۷۸- نوشاهی)

۱۱۶۴۲- بهاولپور، غلام محمد گهوتوی، محمد عبدالحی چشتی ۱۵۰: نستعلیق
پخته، کانشی رام منوجه، ۱۵ مارچ/ ۲۸ ماه پهاگن، ۱۹۷۱ ب
(۱۳۳۵ھ)، آغاز جدا بر نمونه، ترجمه مختصر دارا شکوه، ورشش بر کرت، ۱۵۲
ص (دکتر الله دتا چودری).

نمبر شمار	نام کتاب اور ترجمہ	نام مصنف و مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ کتابت مخطوطہ	سال طباعت / تاریخ تصنیف	صفحات	سائز	مطبوعہ یا مخطوطہ	کیفیت
۴	اطوار در حل اسرار (جوگ باششٹ)	پنڈت آنند رام کشمیری	مخطوطہ						یہ قلمی نسخہ پاکستان میں ہے دیکھئے فہرست مخطوطات فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان۔ جلد چہارم۔ تفصیل نیچے دیکھئے۔ ۳۸۹۶۔ اطوار در حل اسرار: جوک باشست متن گزیدہ ای ست از "یوگ وشستھا" از کتابہای نامی تصوف گونستیک ہندی، در گفتگوی میاں رشی وشست و رامچندر این متن را چند ترجمہ است، یکی از پنڈت انندن رام کشمیری این ترجمہ بامورد پسند اکبر پادشاہ (۹۶۳۔۱۴۔۱۰۱ھ) قرار نگرفتہ، ودر ۱۰۰۶ھ/۹۷۔۱۵۹۸م دستور داد کہ یکی از درباریان آنرا بہ فارسی آسان تری

کیفیت

درآورد ۔

ترجمہ زیر از صوفی شریف خوب جہانی (ن. ک. لطایف صوفیہ، خلاصۃ الاسرار، در ہمین بخش) از دانشمندان روزگار جہانگیر (۱۰۱۴-۱۰۶۸ھ) وگویا بنام او، یکی از ترجمہ ہای "یوگاواشیستہ: یوگ وشست" است . در سیر و سلوک ہند، بسیار روان و شور انگیز، خطاب از "شست" بہ "رامچند" در دہ "طور" . و در نسخۂ گنج بخش بجای نام کسان "ای عزیز" آمدہ است ،

طور ۱ - یافت و شناسائی حق، تجرید ، ۲ - در آنکہ عالم محض خیال است ، ۳ - در بیان آزادی ، ۴ - در جمعیت دل ، ۵ - در رفع خواہش جنگلی ، ۶ - در معرفت یقین ، ۷ - در معرفت حق ، ۸ - در دریافت خویش ، ۹ - در معرفت حال خود ، ۱۰ - در کمال معرفت حق .

در نسخۂ گنج بخش و چاپ نولکشور ۱۸۸۵م نام مترجم نیامدہ است ،

آغاز چاپی : این رسالہ ای ست مسمی بہ اطوار در حل اسرار ، بہ تحریر کمالات شست و رامچند کہ از راہ طلب و عرفان بہ ظہور رسیدہ ، از پردہ بیرون کشیدہ ، فارسی یافتہ و از لباسی بکسوت دیگر . . . طور اول . در بیان تجرید ، شست می گوید سجدۂ من در تعظیم از دل صمیم برای نور آمدہ ، آغاز ۲ : حمد و ثنا لایق ذات خدائی است ، کہ نقوش علمی و رحمانی حقایق اعیانی ثبت فرمود (نسخۂ موزہ)

ن،ک، نسخہ ہا ۱ : ۴۴ ، ۱ "اطوار . . " کہ نام مترجم را نیاوردہ ام - مشار ۱ : ۴۰۷ "اطوار . . " کہ از صوفی شریف است و نشانی یک چاپ آن را دادہ - ریو ۳ : ۴۰۳ "اطوار . . " از صوفی شریف ، با سر آغاز : حمد و ثنا لایق ذات خداست کہ از

کیفیت

نفوس. ہمانجا ۱: ۱۶۱ "جوگ باشستہ". پاکستان و ہند ۴ : ۹۳ "اطوار..." که می گوید سه ترجمهٔ فارسی از آن شده یکی بروزگار جهانگیر از صوفی شریف و یکی نیز زیر نظر داراشکوه در ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵م. مرآت العلوم ۲ : ۱۳۰ "اطوار..." از صوفی شریف

انه : ۱۹۷۲ "اطوار در حل اسرار یا تحفهٔ المجلس" از صوفی شریف)

۱۱۶۴۳. کراچی، موزه ملی ۱۶۱ - ۱۹۶۳، N.M : نستعلیق، ۲۵ج ۲/۱۱۸۹ھ، ۴۴ ص.

۱۱۶۴۴. کراچی، ہمانجا N.M.414-B : نستعلیق شکسته آمیز، ۱۲ع ۱/سدهٔ ۱۲ "آ" از طور ۳ تا ۱۰ را دارد، ۱۸ ص (نوشاهی : ۹۱۲)

۱۱۶۴۵. اسلام آباد، گنج بخش، ۴۸۳ : نستعلیق ریز، سده ۱۲-۱۳ھ، (ص ۸۱-۹۵) دیباچه را ندارد، آغاز : بسمله. بدانکه ای درویش سجده من و تعظیم من از صمیم دل برای نوری آمده که دایم بر یک قرار است (گنج ۲ : ۵۵۸)

۱۱۶۴۶. لاہور، پنجاب پبلک لائبریری ج ۵، ۲۹۴ جوک. شری ۳، ۱۴۹ ادارا: سه شنبه ۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، در فهرست آمده "اطوار در حل اسرار یا جوک لبشست" ترجمه از ناشناس، در ده بخش، عنوان با قانونیس، آغاز : ابتدای هر صحیفه عنوان بنام نامی شری مهاراج صاحب که خالق کون و مکان است، ۱۶۱ ک (عباسی ۱ : ۲۵)

۱۱۶۴۷. لاہور، کتابخانهٔ عمومی پنجاب ج ۵، ۲۹۴ جوک شری : نوشته سه شنبه ۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، آغاز برابر نمونه، در فهرست بنام "اطوار در حال (حل) اسرار، یا جوک بشست" آمده، ۱۹۱ ک (عباسی ۱ : ۲۳)

۱۱۶۴۸. لاہور، دانشگاه، شیرانی ۱/۲۱۰۰/۱۲ ۵۱ : دهالورام گکر، در

کیفیت

ملتان، ۱۴ اپوہ ۱۹۰۵ ب/۱۸۴۸ ام (۱۲۶۴ھ) در فہرست بنام "جوگ باشست یا اطوار در حل اسرار" آمدہ (بشیر حسین ۳ : ۶۷۴)

۱۱۶۴۹ - لاہور، ہمانجا ۴/۲۰۹۲/۵۱۰۵ : نوشتہ بھوانی پرشاد، ۱۸۵۵ ام (۱۲۷۲ھ) در لاہور (بشیر حسین ۳ : ۶۷۴)

کیفیت	[illegible]	[illegible]	مطبوعات	تعداد صفحات	[illegible]	مطبوعہ یا مخطوطہ	نام مصنف یا مترجم	نام کتاب یا رسالہ	نمبر شمار
قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے جلد چہارم مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان فہرست خطی فارسی، تفصیل نیچے ہے ۳۸۹۷۔ مفرح القلوب: ترجمۂ جوگ بشست متن ہمان۔ ترجمۂ از ناشناس۔ (ن، ک، مفرح القلوب در ہمین بخش) آغاز: پس از نیایش جناب کریم متعال، مترجم فرخ (فرغ) البال می گوید، کہ جوگ بشسٹ مہا ریشی موسم بہ موکی پای یعنی نامی نامہ ای ست مشتمل بر ارشاد حق ایزدی و رستگاری۔	×	×	×	×	×	مخطوطہ		مفرح القلوب ترجمہ جوگ بشست	۵

کیفیت

نفوس. همانجا ۱: ۷۱ "جوک باشستهٔ". پاکستان و هند ۴: ۲۹۳ "اطوار..." که می گوید
سه ترجمهٔ فارسی از آن شده یکی بروزگار جهانگیر از صوفی شریف و یکی نیز زیر نظر
داراشکوه در ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۵م. مرآت العلوم ۲: ۱۳۰ "اطوار..." از صوفی شریف
است: ۲ : ۱۹۷ "اطوار در حل اسرار یا تحفهٔ مجلس" از صوفی شریف)

۱۱۶۴۳. کراچی، موزهٔ ملی N.M. ۱۹۷۳-۱۶۱: نستعلیق، ۲۵ ج ۲/ ۱۱۸۹ھ،
۴۴ ص.

۱۱۶۴۴. کراچی، همانجا N.M. ۲۱۴-B: نستعلیق شکسته آمیز، ۱۲ ع ۱/ سدهٔ ۱۲؛
از طور ۳ تا ۱۰ را دارد، ۱۰۸ ص (نوشاهی: ۹۱۲)

۱۱۶۴۵. اسلام آباد، گنج بخش، ۴۸۳: نستعلیق ریز، سده ۱۲-۱۳ھ، (ص ۸۱-
۹۵) دیباچه را ندارد، آغاز: بسمله. بدانکه ای درویش سجده من و تعظیم من از صمیم دل
برای نوری آمده که دایم بر یک قرار است (گنج ۲: ۵۵۸)

۱۱۶۴۶. لاهور، پنجاب پبلک لائبریری ج ۵، ۲۹۴ جوک. شری ۳، ۴۹ ادارا:
سه شنبه ۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، در فهرست آمده "اطوار در حل اسرار یا جوک لبشست"
ترجمه از ناشناس، در ده بخش، عنوان با قانویس، آغاز: ابتدای هر صحیفه عنوان بنام
نامی شری مهاراج صاحب که خالق کون و مکان است، ۱۶۱ ک (عباسی ۱: ۲۵)

۱۱۶۴۷. لاهور، کتابخانهٔ عمومی پنجاب ج ۵، ۲۹۴ جوک شری: نوشته شنبه
۲۵ رمضان ۱۲۳۱ھ، آغاز برابر نمونه، در فهرست بنام "اطوار در حال (؟) اسرار، یا جوک
بشست" آمده، ۱۹۱ ک (عباسی ۱: ۲۳)

۱۱۶۴۸. لاهور، دانشگاه، شیرانی ۱/ ۲۱۰۰/ ۵۱۱۲: دهالورام ککر، در

کیفیت

ملتان، ۱۴/ یوہ ۱۹۰۵ ب/ ۸۴۸ ۸۴۸م (۱۲۶۴ھ) در فہرست بنام "جوگ باششت یا اطوار در حل اسرار" آمدہ (بشیر حسین ۳: ۶۷۴)

۱۱۶۴۹ - لاہور، پنجاب ۴/ ۲۰۹۲/ ۵۱۰۵ : نوشتہ بھوانی پرشاد، ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ - ۱) در لاہور (بشیر حسین ۳: ۶۷۴)

کیفیت	مخطوطہ کا نمبر	سائز	صفحات	سال تالیف یا ترجمہ	تاریخ کتابت مخطوطہ	مخطوطہ یا مطبوعہ	نام مصنف یا مترجم	نام کتاب اور زبان متن	نمبر شمار
قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے جلد چہارم مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان فہرست خطی فارسی تفصیل نیچے ہے ۳۸۹۷۔ مفرح القلوب: ترجمۂ جوگ بشست متن ہمان۔ ترجمۂ از ناشناس۔ (ن،ک، مفرح القلوب در ہیمن بخش) آغاز: پس از نیایش جناب کریم متعال، مترجم فرح (فرغ) البال می گوید، کہ جوگ بشسٹ معاریشی موسوم بہ موکی پای یعنی نامی نامہ ای ست مشتمل بر ارشاد حق ایزدی و رستگاری۔	×	×	×	×	×	مخطوطہ		مفرح القلوب ترجمۂ جوگ بششٹ	۵

نمبر شمار	نام جوگ باشسٹ نسخہ	نام مصنف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوط	نام کاتب یا مقام کتابت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
									۱۱۶۵۰۔ کراچی، موزہ ملی ۲۱۴-۱۹۶۹۔N.M: نستعلیق، سدہ ۱۲ھ، ۲۵۸ص (نوشاہی: ۹۱۳)
۶	جوگ بششٹ ترجمہ	×	مخطوط						قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات ایران و پاکستان جلد چہارم تفصیل نیچے ہے۔ ۳۸۹۸۔ جوگ باشسٹ ترجمہ، متن ہمان، ترجمہ ناشناختہ، ۱۱۶۵۱۔ کراچی، موزہ ملی ۵۲۸/۸۰۔ N.M: نستعلیق، سدہ ۱۲ھ، آغاز و انجام افتادہ، ۱۳۸ص (نوشاہی: ۹۱۳)
۷	ویراگ پرکرن سری بششٹ جی	×	مخطوط						قلمی نسخہ پاکستان میں ہے۔ دیکھئے فہرست خطی فارسی مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان جلد چہارم، یہ ویراگ پرکرن جوگ واشسٹھ کا پہلا پرکرن ہے اسے الگ سے لکھا گیا ہے۔ ۳۹۷۰۔ ویراگ پرکرن سری بششٹ جی به ہندی و فارسی، با مقدمہ ای کہ خلاصہ

کیفیت

کتاب را بہ فارسی آوردہ است ،

آغاز : اتھہ ویراک ہرکرنی سیرون سمت سمرت بہاکیا لکھی ست آنندروپ چوانمان ۔

۱۱۸۹۷ ۔ بہاولپور ، سنٹرال لائبریری ۱۴۹ : نستعلیق تحریہ آمنیر، بامضای بندہ جنونداس ، کہ بہ خط نویسندہ می خورد ، تاریخ یادنشدہ ، باے تصویر زیبا در موضوع عقاید ہند باستان ، ۳۷۶ ص (دکتر اللہ دتا چودری)

نمبر شمار	نام کتاب و مضمون	نام مصنف / مولف یا مترجم	مطبوعہ یا مخطوطہ	مخطوطہ کی تاریخ کتابت	سال طباعت (مطبوعات کی)	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۸	یوگ وششٹ (ترجمہ)	[illegible]	مخطوطہ	۱۰۳۲ھ / [illegible]					دیکھیے صفحہ ۴۵۴ / ۴۵۵ CONCISE DESCRIPTI- -VE CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS ASIATIC SOCIETY BENGAL 1926. یہ الگ قلمی نسخہ ہے۔
۹	یوگ وششٹ (ترجمہ) [illegible]	[illegible]	مخطوطہ	۱۰۱۵ھ					دیکھیے صفحہ ۴۷۶ فہرست مخطوطات نیرانی جلد سوئم ادارۂ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب لاہور۔ یہ الگ قلمی نسخہ ہے جو پاکستان میں ہے ۔

نمبر شمار	نام پوگ یا اور پوگ نسخہ	نام مصنف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	تاریخ تصنیف یا سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۰	جوگ وششٹ [illegible]	[illegible]	"	۱۸۵۵ء					شرح صدر
۱۱	ترجمہ جوگ بششٹ [illegible]	[illegible]	"						دیکھیے صفحہ ۴۷۷ CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE OF PERSIAN MANUSCRIPTS OF ASIATIC SOCIETY CALCUTTA — 1985.
۱۲	"	محمد داود [illegible]		۱۰۹۰/۱۶۷۹					شرح صدر
۱۳	"	[illegible]							دیکھیے صفحہ ۶۹ فہرست نسخہ ہائے خطی فارسی. بمبئی کتاب خانہ موسسۂ کاما سب گنجینۂ مانکجی ۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان
۱۴	جوگ واششٹ			۱۹۱۶A.D		۱۶۱ ۷×۴½			یہ قلمی نسخہ آرکائیوز پنجاب پٹیالہ میں ہے مخطوطہ کا نمبر ۵۰۷ ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب یا مخطوطہ	نام مصنف یا مترجم	حالت مخطوطہ	تاریخ کتابت مخطوطہ	تاریخ تصنیف یا سال تالیف	تعداد اوراق	سائز	[illegible]	کیفیت
۱۵	جوگ باشست فارسی						۱۵ × ۱۰		یہ قلمی نسخہ آرکائیوز پنجاب پٹیالہ میں ہے مخطوطہ کا نمبر ۵۳۵ ہے۔
۱۶	جوگ باشست ترجمہ			AH 1105. 1694 AC.					دیکھیے صفحہ لسٹ عربک اینڈ پرشین مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ AN EXPOSITION OF HINDU GNOSTICISM IN THE FORM OF A DIALOGUE BETWEEN RISHI VASHISHTA AND RAM CHANDRA TRANSLATED FROM THE SANSKRIT INTO PERSIAN - COMPLETE.
۱۷	جوگ باشست ۲۰۸	[illegible]	Good						دیکھیے ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب۔ عہد جہانگیر سے عہد اورنگزیب تک" صفحہ ۲۶۷
۱۸	منتخبات جوگ باشست	[illegible]	Good						کتاب خانہ دانشگاہ تہران جلد سوم پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۳۷۹

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مؤلف / مترجم	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ کتابت مخطوطہ	سال طباعت مطبوعات	صفحات	سائز	منظوم / منثور	کیفیت
۱۹	جوگ باسشِشٹ	پنڈت جگن ناتھ بن گوپی	قلمی						کتاب خانہ دانشگاہ تہران جلد سوئم پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۴۶۸
۲۰	جوگ باشِشٹ ترجمہ		قلمی						ستارہ ہسٹاریکل میوزیم۔ دکن کالج ریسرچ انسٹیٹیوٹ پونا۔ عربی۔ فارسی۔ ہندوستانی MSS صفحہ ۳۰ اکبر بادشاہ نے ترجمہ کرایا۔ ۱۰۰۶ / ۱۵۹۷/۹۸
۲۱	جوگ باشِشٹ خلاصہ ترجمہ	دارا شکوہ	قلمی						شرح صدر دارا شکوہ نے مختصر کیا ۱۰۶۶ / ۱۶۵۶
۲۲	جوگ باشِشٹ ترجمہ		قلمی						فہرست CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE. ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ صفحہ ۴۵۴
۲۳	جوگ واشِشٹ، جوگ واشِشٹ		قلمی			۴۸۷			پنجاب یونیورسٹی لائبریری نمبر M.S. ۲۳۸/۴۵۴/۱۸۱۰۴
۲۴	جوگ واشِشٹ، جوگ واشِشٹ	ایڈیشن ماطوی							دیکھیے پاسداران زبان ادبیات فارسی در ہند کلچرل ہاؤس ایران مقیم دہلی
۲۵	جوگ باشِشٹ اطوار اسرار		مطبوعہ		نولکشور				میونسپل لائبریری پٹیالہ

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف / مؤلف مترجم	مطبوعہ / غیر مطبوعہ	تاریخ کتابت مخطوطہ	سال طباعت / سال تصنیف	صفحات	سائز	مشمولہ	کیفیت
۲۶	ترجمۂ جوگ باشسٹ	[illegible]	مطبوعہ			۳۶۵			دیکھئے نسخہ ہائے خطی کتاب خانہ ندوۃ العلما صفحہ ۷۸ کلچرل ہاؤس ایران۔ دہلی
۲۷	ترجمۂ جوگ باشسٹ	نامعلوم	مطبوعہ			۴۷۸			شرح صدر
۲۸	ترجمۂ جوگ باشسٹ	نانوتی	مطبوعہ			۳۹۳			دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی بمبئی کتاب خانہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان صفحہ ۶۹
۲۹	ترجمۂ جوگ باشسٹ	—	مطبوعہ			۲۷۸			بشرح صدر
۳۰	جوگ باشسٹ	صوفی نثار شریف	غیر مطبوعہ	۱۱۸۹ھ					فہرست مخطوطات شیرانی جلد سوم صفحہ ۲۷۳
۳۱	جوگ باشسٹ	مولوی ... / بہت عظیم	مطبوعہ		۱۳۲۶ھ	۱۹۷			دیکھئے فہرست کتاب خانہ آصفیہ
۳۲	جوگ باشسٹ	دارالشکوہ	مطبوعہ						دیکھئے فہرست فارسی مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۲۷ صفحہ ۷۵۲
۳۳	ترجمۂ جوگ باشسٹ		مطبوعہ						،، ،، ،، صفحہ ۷۷۲
۳۴	جوگ باشسٹ		مطبوعہ						،، ،، ،، ،، ،،

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف یا مترجم	مطبوعہ یا قلمی	تاریخ کتابت	سلسلہ	صفحات	سنہ طبع	مقام طبع	کیفیت
۳۵	اطوار پرکاش ترجمہ یوگ وششٹ		قلمی						نسخہ ہائے خطی فارسی کچول باکس ایان جلد چہارم
۳۶	ترجمہ یوگ وششٹ		قلمی						یہ نسخہ الگ ہے ۔
۳۷	ترجمہ یوگ وششٹ	دارا شکوہ	قلمی						دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی ۔ ۔ ۹۰-۲۱۴ صفحہ
۳۸	منتخب ترجمہ یوگ وششٹ	بنارسی داس	قلمی						" " " ۱۵۱-۲ صفحہ
۳۹	ترجمہ یوگ وششٹ		قلمی						" " " ۱۵۲-۲ صفحہ
۴۰	ترجمہ یوگ وششٹ		قلمی	۱۸۵۰		۱۵۷			فہرست نسخہ ہائے قلمی اورینٹل لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ صفحہ ۱۵
۴۱	خلاصہ یوگ وششٹ		مطبوعہ						فارسی ترجمہ اشتہار غازی بک سیلرز بمبئی ۔ قیمت ۔/۲۴۰
۴۲	ترجمہ خلاصہ یوگ وششٹ	×	قلمی						تھوڑا فرق ہے MSS نمبر ۱۷۰۰ ابتدائی صفحہ
۴۳	منتخبات یوگ وششٹ	[illegible]				۰			دہلی یونیورسٹی لائبریری میں ہے ۔
۴۴	ترجمہ یوگ وششٹ					۱۱۱			دیکھئے مرآۃ العلوم جلد دوم خطی فارسی خدا بخش لائبریری پٹنہ

اردو میں یوگ واشسٹھ

نمبر شمار	یوگ واشسٹھ کا نام	نام مصنف یا مترجم	مخطوطہ یا مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	نام پریس سال طباعت	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱	جوگ باسشٹ ترجمہ	سوامی بابا رام کالی سنگھ	مطبوعہ دو جلدوں میں	×	نولکشور پریس لکھنؤ تیسری بار	پہلی جلد ۵۱۴ دوسری جلد ۵۶۵	۲۰ × ۹	منثور	کتب خانہ نابھوی میں ہے۔ اس کا ہندی ترجمہ نولکشور پریس کا دو جلدوں میں بھی کتب خانہ نابھوی میں ہے۔
۲	اکھرواتی جوگ باسشٹ	کنہیا لال الکھ دھاری		۱۸۶۵ء		۲۱۳			یہ قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔ دیکھئے ہندوستان کے کتب خانوں میں اردو مخطوطات مرتبہ خدا بخش لائبریری
۳	چھوٹا جوگ باسشٹ	گوردھن لال							بشرح صدر
۴	منازل السالکین	ابوالحسن			نولکشور پریس ۱۹۰۲	۳۲۲			یہ نول کشور پریس سے چوتھی بار شائع ہوئی۔ دیکھئے صفحہ ۴۴۴ نیشنل بیبلوگرافی آف انڈین لٹریچر ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی ۱۹۵۳-۱۹۰۱
۵	جوگ باسشٹ		مخطوطہ						یہ سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں نمبر ۳۵۸ درج ہے۔
۶	جوگ باسشٹ		مخطوطہ						" " " ۳۵۹ درج ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف مترجم	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم منثور	کیفیت
۷	یوگ واشسٹھ	پنڈت پیارے لال	مطبوعہ		نول کشور ۱۹۰۴-۱۹۰۵	۵۱۴ اور ۵۶۳	جہازی	منثور	نابھوی کتب خانہ میں ہے۔
۸	یوگ واشسٹھ	ایڈیٹر مارتنڈ	مطبوعہ			۲۸۸	کتابی	منثور	" " "
۹	یوگ واشسٹھ	ہردیو سہائے	مطبوعہ						پٹیالی یونیورسٹی پٹیالہ۔ موہن سنگھ کلکشن میں ہے۔
۱۰	یوگ بشسٹ	منوہر لال	مطبوعہ						بشرح صدر
۱۱	نرائن الکھ ترجمہ یوگ واشسٹ		مطبوعہ						بشرح صدر
۱۲	جوگ بشسٹ		مطبوعہ		۱۸۶۹ء گلزار ہند	۲۲۲			میونسپل لائبریری پٹیالہ میں ہے
۱۳	منہاج السالکین	ابوالحسن	مطبوعہ		لکھنؤ ۱۸۸۶ء				فہرست کتب خانہ پبلک لائبریری پنجاب لاہور اردو ۱۹۳۶ء صفحہ ۳ اور (فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد)
۱۴	سری جوگ بشسٹھ	چیتر بھج	مطبوعہ		گوجرانوالہ				بشرح صدر صفحہ ۱۸۱

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف مولف مترجم	مطبوعہ غیر مطبوعہ	تاریخ مخطوطہ	سال طباعت نام پریس	صفحات	سائز	منظوم یا منثور	کیفیت
۱۵	یوگ واشششٹ مختصر خلاصہ	لوگ یار	مطبوعہ		لاہور ۱۹۲۰ء				بشرح صدر صفحہ ۱۸۷
۱۶	منہاج السالکین ترجمہ جوگ بششٹ	سوامی دیال	مطبوعہ		نولکشور				پبلک لائبریری لاہور فہرست صفحہ ۱۸۰۱۔
۱۷	الکہ امواج ترجمہ یوگ واشششٹ								اشتہار مہابھارت سری رام کرت صفحہ ۹۰۳ اور مقالات گارساں دتاسی جلد دوئم صفحہ ۲۷۳۔
۱۸	الکہ امواج ترجمہ یوگ واشششٹ	مجہول الاسم	قلمی		۱۸۷۰ء	۲۱۳			دیکھئے فہرست مخطوطات اردو جلد اول خدابخش لائبریری پٹنہ

وفیات

مولانا حافظ محمد تقی امینی

از ضیاء الدین اصلاحی

ڈاک کا نظام اس قدر ابتر ہے کہ مہینوں سے دار المصنفین میں اردو کا کوئی اخبار نہیں آرہا ہے اس لیے ضروری اور اہم خبروں کا بھی علم نہیں ہوتا، پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جن کے گرامی نامہ سے دار المصنفین کے ایک مخلص کرم فرما مولانا حافظ محمد تقی امینی کی حسرتناک وفات کی اطلاع تاخیر سے ملی۔

مولانائے مرحوم مسلمانوں کے قدیم و جدید دونوں طبقوں میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی، وہ ایک عالم دین اور اسلامیات کے فاضل و محقق اور مصنف کی حیثیت سے پورے ملک میں مشہور تھے، دینی علوم میں بلند پائیگی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاص، عمل، للّٰہیت، بے نفسی اور زہد و اتقا میں بھی ممتاز تھے، ان کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

۱۹۵۰ء میں میں عربی کا مبتدی تھا اور اسی زمانے سے معارف کی ورق گردانی کرتا تھا، اس کے جن مضمون نگاروں کے نام لوحِ دل پر ثبت ہو گئے تھے ان میں مولانا

کا نام بھی تھا کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد برابر ان کے مضامین معارف میں شایع ہوتے رہتے تھے، سنہ تو یاد نہیں لیکن ان سے پہلی ملاقات دارالمصنفین میں اس وقت ہوئی جب وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات سنی کے ناظم ہو چکے تھے اور گرمیوں میں مطالعہ و کتب بینی کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائے تھے۔

وہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کے مہمان تھے جن کے ساتھ ہی میرا کھانا پینا بھی ہوتا تھا، شاہ صاحب نے مولانا کا پلنگ میرے کمرے میں لگوا دیا تھا اس طرح تقریباً ایک ماہ تک ہر وقت میرا ان کا ساتھ رہا اور مجھے ان سے فیض یاب ہونے اور ان کے مخلصانہ مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملا۔ مولانا بڑے خوش طبع اور باغ و بہار شخص تھے۔ اپنی دلچسپ باتوں اور لطائف و ظرائف سے معمور گفتگو سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے ان کی صحبت میں بہت جی لگتا اور یہ چند روز بڑے پُر کیف اور نہایت خوش گوار گذرے،

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے آں شب قدر کہ تازہ براتم دادند

اس ملاقات کے بعد مولانا سے خلوص و محبت کا جو رشتہ قائم ہوا وہ اب ان کی وفات کے بعد ہی ختم ہوا، میں جب علی گڈھ جاتا تو ان سے ضرور ملاقات کرتا، وہ بہت خوش ہوتے اور میں بھی ان سے ملنے کو ملاقاتِ مسیحا و خضر سے بہتر خیال کرتا، کسی جلسہ اور سمینار میں ملتے تو برابر اپنے ساتھ رکھتے اور فرماتے ع غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو۔

وہ خطوط کم لکھتے تھے مگر جب کبھی ان کو جواب طلب خط لکھا تو اس کا جواب فوراً دیا، ان کی کوئی کتاب چھپتی تو ضرور بھجواتے اور خط لکھ کر تبصرے کا تقاضا کرتے، فرماتے کہ اب دو ہی ایک رسالوں میں کتاب پڑھ کر تبصرہ ہوتا ہے معارف کے بعد مجھے کسی کے

رسا ذہن اور دقیقہ بیں نظر جہاں اور جن گوشوں تک پہنچی ہے وہاں تک رائے عام سے مرعوب اور شتر مرغ کے اندیشوں میں گرفتار لوگ نہیں پہنچ سکے، مولانا کو زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو اپنا انداز فکر و نظر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت دی ہے اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش و حواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا ہے آج چاہے ان کی رائے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے لیکن جلد ہی اس کا وزن محسوس کیا جائے گا، انھوں نے بہت پہلے شورائی اجتہاد کو اس دور کے لیے مناسب بتایا تھا اب اس کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے غور و فکر، اجتہاد و اختراع اور تفریع و استنباط اس امت کا خاص وصف و امتیاز تھا، مسلمانوں کے اسی تاریخی کردار اور کارنامہ کو مولانا نے اپنی تصنیفات میں تفصیل سے قلمبند کیا ہے،

جس طرح مولانا امینی کو اسلامی فقہ و قانون کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کی ضرورت کا شدید احساس تھا اسی طرح ان کو احادیث کی از سر نو تدوین و تبویب کی ضرورت کا بھی احساس تھا، وہ اس پر غور و فکر تو برابر کرتے رہے مگر فقہ اسلامی کی طرح اس کے متعلق اپنے خیالات کو یا تو پیش کرنے کا انھیں موقع نہیں ملا یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگ ان کے ان خیالات کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

جس طرح فقہ کی نئی تدوین و تشکیل کا مقصد قدیم فقہا کی خدمات اور کارناموں پر پانی پھیرنا نہیں ہے، اسی طرح حدیث کی نئی ترتیب و تدوین اور اس کے لیے نئے اصول روایت و درایت وضع کرنے کا مقصد بھی احادیث نبوی کا انکار اور قدیم

محدثین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ قدمانے جس انداز پر کتب حدیث مرتب کی ہے اب اس سے سرمو انحراف کو وہ لوگ حدیث کی مخالفت سمجھتے ہیں جو ہر قسم کی تقلید کو ناروا خیال کرتے ہیں۔

مولانا تقی امینی نے "حدیث کا درایتی معیار" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ صحیح و غلط حدیثوں میں امتیاز کے لیے محدثین نے روایت کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کیے تھے لیکن اصولِ روایت کے مقابلہ میں اصولِ درایت پر کم توجہ کی گئی خصوصاً اردو میں تو اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے، مصنف نے درایت کا مفہوم اور قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کرکے اس بارے میں محدثین کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، فن روایت میں سند حدیث یعنی راویوں کے حالات کی چھان بین کی جاتی ہے، مولانا کے نزدیک یہ خارجی نقد حدیث ہے اور فن درایت میں روایت کے مضمون و متن پر نقد و جرح کرکے اس کی قوت و ضعف کا فیصلہ کیا جاتا ہے، مولانا اسے داخلی نقد حدیث کہتے ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ کے وقت اولاً تو تطبیق کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو داخلی (درایت) کو خارجی (روایت) پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کتاب میں مولانا نے حدیث کی معرفت و درایت کے قدیم اصول و ضوابط کو منضبط کرکے ان کی تشریح اس لیے کی ہے تاکہ درایت کے نئے قواعد و قوانین مرتب کرنے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے شروع میں ذات نبویؐ پر مختلف حیثیتوں سے جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کا مقصد نبوت و رسالت کی اہمیت اور نبی و رسولؐ کی عظمت کو واضح کرنا ہے، مولانا کے نزدیک شعور نبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے

تبصرے کا انتظار نہیں رہتا۔ میری کوئی تحریر پسند آجاتی تو خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے،
معارف کی ادارت کا بارِ گراں میرے دوشِ ناتواں پر آیا تو دو ایک شمارے ملاحظہ
فرمانے کے بعد جو ہمت افزا خط لکھا اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ حال ہی میں میرا
ایک تبصرہ ان کی نظر سے گذرا تو بہت پسند کیا اور فوراً مبارک باد کا خط لکھا جس میں
یہ اصرار بھی تھا کہ ان کا خط معارف میں شایع کر دیا جائے۔ جب ملاقات ہوئی تو پھر
داد دی اور خط شایع نہ کرنے کے میرے فیصلے سے اتفاق فرمایا۔

مولانا کی ولادت صبیحہ (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۹۲۶ء میں ہوئی، یہیں ابتدائی
تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ الٰہیات کان پور میں داخلہ لیا لیکن تعلیم کی تکمیل مولانا
مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہاں پوری کے سایۂ عاطفت میں مدرسہ امینیہ دہلی میں ہوئی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف
مدارس سے وابستہ رہے، دارالعلوم معینیہ اجمیر کے صدر مدرس بھی رہے، اسی زمانہ میں
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلما کی دعوت پر موجودہ دور کے اہم، پیچیدہ
اور نازک مسائل کا متفقہ حل تلاش کر کے مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کے لیے مجلس
تحقیقاتِ شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، اس مجلس کی ذمہ داری مولانا محمد تقی امینی کو تفویض کی
گئی، یہ کام ان کے ذوق اور دلچسپی کا تھا جس کو انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا،

ندوۃ العلما لکھنؤ میں چند برس قیام کرنے کے بعد وہ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ آئے
اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں لکچرار و ناظم سنی دینیات مقرر ہوئے اور ترقی
کر کے صدر شعبہ سنی دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی ہوئے اور ۱۹۸۹ء میں ریٹائر
ہوئے۔ علی گڑھ کو انھوں نے اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا۔ وفات کے بعد اسی کی خاک کا

پیوند ہوئے اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا کا اصلی کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں، ان میں تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا، علی گڑھ کی علم پرور فضا میں ان کا یہ جوہر زیادہ کھلا مختلف موضوعات پر انھوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام یہ ہیں،

(۱) کائنات میں انسان کا مقام (۲) عروج و زوال کا الٰہی نظام (۳) لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر (۴) اسلام کا زرعی نظام (۵) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر (۶) مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر (۷) احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت (۸) تہذیب کی تشکیل جدید (۹) انشورنس کی شرعی حیثیت (۱۰) امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں (۱۱) مقالات امینی (۱۲) حدیث کا درایتی معیار (۱۳) خطبات عیدین (۱۴) مراسلات (۱۵) حکمت القرآن (۱۶) ہدایت القرآن (نامکمل تفسیر قرآن)

ان کتابوں کی اہمیت کی وجہ سے عربی و انگریزی میں بعض کے ترجمے بھی ہوئے جن لوگوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ مولانا کی علمی و دینی پختگی اور وسعت نظر کی شہادت دیں گے۔

اس زمانہ میں احکام و مسائل اور فقہی جزئیات پر نظر رکھنے والے اشخاص کی کمی نہیں ہے لیکن مسائل پر پھیل کر سوچنے اور غور کرنے والے مفقود ہیں مولانا کی تصنیفات میں جن مسائل کا ذکر ہے فقہ کی قدیم کتابیں ان سے خالی ہیں اور موجودہ لوگوں نے بھی ان کی جانب کم توجہ کی ہے اور جنھوں نے کی ہے ان کے اور مولانا کے انداز فکر میں نمایاں فرق ہے،، ان کا تعلق اس صاحب نظر طبقہ سے تھا جو اسلامی فقہ کے جمود و تعطل کو ختم کرکے اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا چاہتا تھا، اس سلسلہ میں ان کا

رسا ذہن اور دقیقہ بین نظر جہاں اور جن گوشوں تک پہنچی ہے وہاں تک رائے عام سے مرعوب اور شدت تقلید کے اندیشوں میں گرفتار لوگ نہیں پہنچ سکے، مولانا کو زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو اپنا انداز فکر و نظر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت دی ہے اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش و حواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا ہے آج چاہے ان کی رائے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے لیکن جلد ہی اس کا وزن محسوس کیا جائے گا، انھوں نے بہت پہلے شورائی اجتہاد کو اس دور کے لیے مناسب بتایا تھا اب اس کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے، غور و فکر، اجتہاد و اختراع اور تفریع و استنباط اس امت کا خاص وصف و امتیاز تھا، مسلمانوں کے اسی تاریخی کردار اور کارنامہ کو مولانا نے اپنی تصنیفات میں تفصیل سے قلمبند کیا ہے،

جس طرح مولانا امینی کو اسلامی فقہ و قانون کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کی ضرورت کا شدید احساس تھا اسی طرح ان کو احادیث کی از سر نو تدوین و تبویب کی ضرورت کا بھی احساس تھا، وہ اس پر غور و فکر تو برابر کرتے رہے مگر فقہ اسلامی کی طرح اس کے متعلق اپنے خیالات کو یا تو پیش کرنے کا انہیں موقع نہیں ملا یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگ ان کے ان خیالات کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔

جس طرح فقہ کی نئی تدوین و تشکیل کا مقصد قدیم فقہا کی خدمات اور کارناموں پر پانی پھیرنا نہیں ہے، اسی طرح حدیث کی نئی ترتیب و تدوین اور اس کے لیے نئے اصول روایت و درایت وضع کرنے کا مقصد بھی احادیث نبوی کا انکار اور قدیم

محدثین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ قدما نے جس انداز پر کتب حدیث مرتب کی ہے اب اس سے سر مو انحراف کو وہ لوگ حدیث کی مخالفت سمجھتے ہیں جو ہر قسم کی تقلید کو ناروا خیال کرتے ہیں۔

مولانا تقی امینی نے "حدیث کا درایتی معیار" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ صحیح و غلط حدیثوں میں امتیاز کے لیے محدثین نے روایت کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کیے تھے لیکن اصولِ روایت کے مقابلہ میں اصولِ درایت پر کم توجہ کی گئی خصوصاً اردو میں تو اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے، مصنف نے درایت کا مفہوم اور قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کر کے اس بارے میں محدثین کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، فن روایت میں سند حدیث یعنی راویوں کے حالات کی چھان بین کی جاتی ہے، مولانا کے نزدیک یہ خارجی نقد حدیث ہے اور فن درایت میں روایت کے مضمون و متن پر نقد و جرح کر کے اس کی قوت و ضعف کا فیصلہ کیا جاتا ہے، مولانا اسے داخلی نقد حدیث کہتے ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ کے وقت اولاً تو تطبیق کی کوشش کرنی چاہیے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو داخلی (درایت) کو خارجی (روایت) پر ترجیح حاصل ہو گی۔

اس کتاب میں مولانا نے حدیث کی معرفت و درایت کے قدیم اصول و ضوابط کو منضبط کر کے ان کی تشریح اس لیے کی ہے تاکہ درایت کے نئے قواعد و قوانین مرتب کرنے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے شروع میں ذات نبویؐ پر مختلف حیثیتوں سے جو بحث کی گئی ہے وہ بڑی اہم ہے اور اس کا مقصد نبوت و رسالت کی اہمیت اور نبی و رسولؐ کی عظمت کو واضح کرنا ہے، مولانا کے نزدیک شعورِ نبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے

اور اس کی وضاحت انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی کو من جانب اللہ علم و ادراک، فہم و بصیرت اور حکمت و نورانیت عطا ہوتی ہے اور امور دین سے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات وحی الٰہی سے مستنبط ہوتے ہیں، منصب نبوت، پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم و فہم اور حکمت و شعور کی یہ مبسوط اور فاضلانہ تشریح اس لیے کی گئی ہے کہ نبوت کے سرچشمہ فیض سے جاری ہونے والی حدیثوں کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت پوری طرح سامنے آجائے۔

جس طرح فقہ و اجتہاد میں مولانا کے بعض خیالات کو شذوذ و تفرد پر محمول کیا گیا اسی طرح حدیث کے درایتی معیار پر جب ان کی محققانہ کتاب کے بعض حصے معارف میں چھپے تو طرز کہن پہ اڑنے والے بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی۔ مولانا کے نزدیک ثقہ راویوں سے منقول مستند کتب حدیث کی روایتیں بھی شان نبوت کے منافی ہونے کی صورت میں قابل رد ہوں گی، لیکن تاویل و توجیہ کے گورکھ دھندے میں پڑنے والے لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی جو قبول روایت کا مسلمہ اصول ہے، ان حضرات کو نسخ کے بارے میں بھی مولانا کے اس خیال پر شرح صدر نہ ہوا ہوگا کہ اس کا تعلق قدیم کتب آسمانی سے ہے نہ کہ قرآن مجید سے، وہ قرآن مجید کے احکام میں رد و بدل کا تعلق ذات سے نہیں اوصاف سے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کی نوعیت و حکمت لوگوں پر واضح نہیں ہو سکی اور انھوں نے اسے قرآن کے احکام میں رد و بدل پر محمول کر دیا۔

مولانا تہذیب کی تشکیل جدید کے داعی وحامی تھے اور اس بارے میں بھی انکے خیالات عام سطح سے بلند اور مختلف تھے، وہ جوہر انسانیت کے تربیتی پروگرام کے اس خاکہ کی وضاحت اپنی تحریروں میں کرتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے کلیات پر غور کرکے مرتب کیا تھا، انھوں نے عروج وزوال کے الٰہی نظام اور کائنات میں انسان کے مقام ومرتبہ کی تشریح بھی اسی لیے کی ہے قرآن مجید کے خزانہ علم وحکمت کے لعل وگہر کا سراغ لگانے کی کوشش حکمت القرآن میں کی گئی ہے، یہی حکمت بشریت اور تہذیب انسانی کا اصلی تمغا ہے، دراصل مولانا دین اور حکمتِ دین سے واقفیت کے لیے ممتاز تھے اور وہ دین کی اصل حقیقت وروح اور اس کی حکمت ونورانیت کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن وجدانی مسائل کی تشریح ووضاحت بہت نازک کام ہے اس لیے ان کی بعض چیزیں عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوتی تھیں جن کی قدر اہل علم ہی کرسکتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ مولانا کے بڑے قدرداں تھے،

مولانا تقی امینی نے احتساب کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی ادارۂ علم وعرفان علی گڑھ سے نکالا تھا لیکن اس کی حیثیت عام اخباروں جیسی نہیں تھی بلکہ اس میں مولانا کے اہم اور دقیق خیالات پر مشتمل مضامین شایع ہوتے تھے، اسی میں مختلف استفسارات کے عالمانہ جواب بھی شایع ہوتے تھے جن کا ایک علحدہ مجموعہ ۱۹۸۶ء میں شایع ہوا تھا جس میں اور مفید باتوں کے علاوہ جماعت اسلامی ہند کے ایک سوالنامہ کا بڑا حقیقت پسندانہ جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو قومی زندگی سے علحدہ اور الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے،

ابتدا میں مولانا کو مناظرہ سے بھی شغف تھا مگر جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہو گئے البتہ وعظ و تقریر ان کا معمول بن گیا تھا مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبے اہتمام اور پابندی سے دیتے تھے جو بہت مفید اور پُر مغز ہوتے تھے، عیدین کے خطبوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۳ء میں شایع کیا تھا، وہ پیشہ ور مقرر نہیں تھے لیکن کبھی کبھی جلسوں میں شرکت کے لیے سفر بھی کرتے تھے۔

فراخدلی، وسیع المشربی، مروت، شرافت، سادگی، اخلاص، دردمندی اور عفو و درگذر ان کی سیرت و اخلاق کا نمایاں جوہر تھا، وہ بڑے مرنج و مرنجاں شخص تھے، سب سے محبت، گرمجوشی اور بے تکلفی سے ملتے تھے اس کی وجہ سے ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا، ان کی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے سن و سال اور علم و مرتبہ میں کمتر لوگ بھی ان سے شوخ اور گستاخ ہو جاتے تھے، وہ چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے، ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہ لیتے۔ اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ہوتا تو اس کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کرتے، بات کرنے میں لاگ لپیٹ سے کام نہ لیتے، ہمیشہ صاف اور کھری باتیں کرتے تھے، ان میں بڑی جرأت اور خود اعتمادی تھی، حق بات کہنے میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے، اس کی وجہ سے بعض لوگ ناراض ہو جاتے مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے۔

انھوں نے بڑی نرم اور گداز طبیعت اور دردمند دل پایا تھا۔ وہ ہر ایک کے درد و دکھ کو اپنا درد و دکھ سمجھتے تھے، کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو بے قرار ہو جاتے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی فکر کرتے، ایک برس پہلے یونیورسٹی میں ایک داخلہ کے سلسلہ میں میں کافی پریشان رہا میرا کام تو نہیں ہوا لیکن مولانا اور سید حامد صاحب

سابق وائس چانسلر نے میری مدد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

مولانا جب دارالمصنفین میں میرے ساتھ قیام پذیر تھے تو ایک روز رات میں دس بجے ایک صاحب تشریف لائے جن سے ہم لوگ واقف نہ تھے، میں ان کے سونے کا انتظام کرنے میں لگ گیا، اتنے میں مولانا کو معلوم ہوا کہ نووارد بھوکے ہیں، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ پہلے ان کے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے، اگر یہاں ممکن نہ ہو تو چلو ہم دونوں بازار سے کھانا لائیں، میں نے عرض کیا اس وقت بازار میں کھانا نہیں ملے گا۔ اس وقت یہ صرف چائے اور بسکٹ پر اکتفا کرلیں مولانا نے برہم ہوکر فرمایا اگر ان کی جگہ میں اور تم ہوتے تو ہمارا کیا حال ہوتا، میں لاجواب ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد خیال ہوا کہ محترمی سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے یہاں جو اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے بچا کھچا کھانا ہوگا مولانا مجھے لے کر فوراً ان کے یہاں پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد کھانا آگیا اور جب ان صاحب نے کھالیا تو مولانا کی پریشانی اور بے چینی دور ہوئی۔

ان کے نیک اور پاک دل میں کسی کی دل آزاری کا کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا، چند برس پہلے میں قصبہ صبرحد ضلع جون پور کے مدرسہ فاروقیہ کے سالانہ جلسہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا امینی بھی تشریف لانے والے ہیں اور ڈاکٹر محمد صابر نائب مدیر فکر ونظر علی گڑھ کے گھر پر مولانا ہی کے ساتھ میری رہائش کا بھی انتظام کیا گیا ہے، میں نے مذاق میں کہا اب معلوم ہوا کہ علالت کا عذر محض بہانہ ہوتا ہے، آپ یہاں تک چلے آئے اور بیماری مانع نہ ہوئی، فرمایا کہ ڈاکٹر صابر کے اصرار کے سامنے میری کچھ نہ چلی، یہ بیچارے مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی دل شکنی کیسے کرتا۔

ان کی زندگی ریا ونمود اور نمایش وبناوٹ سے خالی تھی، غیبت اور دوسروں کی

عیب جوئی سے ان کو نفرت تھی ان میں کبر و نخوت اور علو و پندار کا شائبہ بھی نہ تھا کہیں اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہیں ہونے دیتے، اگر ان کو کبھی اس کا احساس ہو جاتا کہ انکی کسی بات سے دوسرے کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ بے تکلف اس سے اسی وقت معافی مانگ لیتے، اپنی غلطی سے رجوع کر لینے میں ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ایثار، صبر اور قناعت ان کا شیوہ تھا، اپنے حال میں مست رہتے اور صبر وشکر سے گذر بسر کرتے، ان کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی، اہلیہ کو دماغی فتور تھا مگر کبھی وہ حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

مولانا عرصہ سے علیل تھے، نقرس کی تکلیف کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے، لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہو گیا تھا، میں نے اور لوگوں کی طرح ان سے بھی مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ اب اسے بھول جاؤ، اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا تھا وہ لے چکا۔ بالآخر ۱۲ جنوری کو پیام اجل آگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے صاحب علم و نظر اور بلند پایہ عالم دین کا اٹھ جانا قوم و ملت کا بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کرے، مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

مطبوعات جدیدہ

۱۔ حمد و نعت ۲۔ کاروانِ حرم از جناب ابوالامتیاز ع۔ س مسلم، تقطیع متوسط، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہترین صفحات (۱) ۲۶۳ (۲) ۳۰۷، قیمت (۱) ۸۰ روپیہ (۲) ۱۰۰ روپیہ، پتہ: مقبول اکیڈمی ۱۹۹ سرکلر روڈ چوک انارکلی لاہور پاکستان۔

حمد و نعت اردو شاعری کی مقدس اصناف ہیں ہر دور کے شعرا اس سعادت سے بہرہ ور ہوتے رہے ہیں، گذشتہ چند برسوں سے پاکستان میں خاص طور سے اس پر توجہ دی جارہی ہے، چنانچہ جن شعرا کو خلعت قبول حاصل ہوئی ان میں جناب ابوالامتیاز ع س مسلم بھی ہیں، زیر نظر دونوں مجموعے ان کے قلب و نظر کی طہارت و لطافت اور فن شاعری پر قدرت کا نمونہ ہیں، پہلے مجموعہ میں حمد و مناجات کے باب میں ۱۱۳ اور حصہ نعت میں ۲۲۰ منظومات شامل ہیں، آخر میں ۶ سلام بھی ہیں، نعتیہ مضامین میں اپنی قلبی واردات و کیفیات کے بیان میں انھوں نے ادب، احتیاط، سلیقہ اور ہوش مندی کے سررشتہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اشعار میں بعض غریب و ثقیل الفاظ جیسے غنام، اطاق، یوم استفتاح، شقاق، مرزع تشکیک، مستطر و نبل باطل، نور استصباح اور ہندی الفاظ جیسے پنچھی، پرنام، داتا، دین دیال، نیل گگن، مہکار اور روپ وغیرہ کو انھوں نے بڑے سلیقہ سے استعمال کیا ہے، شروع میں بعض اہل قلم کی تعارفی تحریریں

بھی ہیں، دوسرا مجموعہ کاروان حرم الموسوم بہ مثنوی مسلم، ایک منظوم سفرنامہ حج ہے، مسلم صاحب ارض حرم کی زیارت پہلے بھی کر چکے تھے مگر ۸۳ء میں جب وہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے تو جذبہ و احساس کی آتش خموش پر قابو نہ پا سکے، نیز تاریخی واقعات کے استحضار نے اس مبارک منظوم سفرنامہ میں دو آتشہ کا لطف پیدا کر دیا۔ فہرست مندرجات میں مآل ابرہہ، تحویل قبلہ، تعمیر کعبہ، امتحان ابراہیمؑ، بدر، احد، جنت البقیع، بیعت رضوان، فتح مکہ، سفر مدینہ، داخلہ مدینہ منورہ، مسجد قبا وغیرہ عنوانات سے منظوم سفر کی روداد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، تقریباً ایک ہزار اشعار کے اس مجموعہ کا ہر شعر ثریا تاثیر ہے، مثنوی میں کہیں تو مسدس حالی اور کہیں اقبال کے افکار کی چھاپ نظر آتی ہے، آغاز میں جناب احمد ندیم قاسمی اور مولانا عبداللہ عباس ندوی کی تحریریں تحسین سخن شناس کا عمدہ نمونہ ہیں، ایک جدت یہ کی گئی ہے کہ اشعار کی تائید میں آیات و احادیث شریفہ کے حوالے مع اردو ترجمے کے دیئے گئے ہیں، اردو کے ادبی ذخیرہ میں یہ دونوں مجموعے اپنی پاکیزگی اور لطافت کے لحاظ سے ممتاز خیال کیے جائیں گے۔ (ع ص)

فارم ۴ ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	: دارالمصنفین اعظم گڈھ	پتہ	: دارالمصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	: ماہانہ	نام پبلشر	: " " "
نام پرنٹر	: عتیق احمد	اڈیٹر	: ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	: ہندوستانی	قومیت	: ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ : دارالمصنفین اعظم گڈھ

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں عتیق احمد

جلد ۱۴۷ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

وفیات

شذرات

شجاعت، بہادری اور جنگجوئی عربوں کے خمیر میں داخل تھی، زمانۂ جاہلیت کا شاعر غیرت وحمیت سے سرشار ہوکر کہتا ہے:

الا لا یجہلنّ احدٌ علینا فنجہل فوق جہل الجاہلینا

(ترجمہ) ہاں دیکھو! کوئی ہم سے جہالت نہ کرے، ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں

یا حماسی شاعر کے بقول:

قومٌ اذا الشرّ ابدیٰ ناجذیہ لہم طاروا الیہ زرافات و وحدانا

(ترجمہ) وہ ایسے بہادر لوگ ہیں کہ جب انھیں سخت جنگ پیش آتی ہے تو وہ سب بلاتوقف اجتماعی وانفرادی طور پر اس میں ٹوٹ پڑتے ہیں۔

لیکن اب وہی عرب عیش وتنعم کے خوگر اور اس حال میں ہوگئے ہیں کہ "نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار ان سے"، عراق کی فوجی قوت کا بہت شور سنا جاتا تھا، لیکن اس کے ڈھول کا پول کھل گیا وہ کس قدر جوش وخروش سے میدان جنگ میں کودا تھا، مگر اٹھنے سے پہلے ہی گرفتار ہوگیا گو توپ وتفنگ کی جنگ ختم ہوگئی ہے، لیکن اب بھی عراقی باشندوں کے سروں سے حوے توں گذر رہی ہے، یہ کیوں؟

مسلمانوں کو تہ تیغ کرنے سے زیادہ یہودیوں اور عیسائیوں کو انھیں ذلیل ورسوا فوجی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے کمزور، پسپا اور ذہنی ودماغی اذیت میں مبتلا کردینے سے دلچسپی رہی ہے، فتح ایوبی کا انتقام لینے کے لیے انھوں نے اس صدی کی ابتدا ہی میں خلافت کی دھجیاں بکھیر دیں، ترکوں اور عربوں کی سلطنتوں کے جتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرسکتے تھے کر ڈالے، وسط ایشیا کی مسلم ریاستوں کو توڑ پھوڑ کر ذہنی حیثیت سے مرتد کردیا،

عربوں اور فلسطینیوں کے سروں پر اسرائیلی سلطنت مسلط کر کے ان سے قبلہ اول چھین لیا اور ابھی یہ صدی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ عراق کو چور چور کر کے رکھ دیا گیا، اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد قربانی کا بکرا کون بنے گا؟

کویت سے عراق کا انخلا تو ایک بہانہ تھا، انگریزوں کی اصل کارروائی اب شروع ہوئی ہے، یہ سمجھنا سادہ لوحی ہے کہ اتحادی صرف عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اور دوسرے عربوں پر اپنا دست شفقت پھیر کر خاموش ہو جائیں گے، عہد رسالت سے آج تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری رہنے والی یہودی و مسیحی سازشوں کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یہ جس طرح پہلے مسلمانوں کے ہمدرد اور کرم فرما بن کر انھیں تختۂ مشق بناتے رہے ہیں، آج بھی اسی طرح کے کرتب دکھانے میں لگے ہوئے ہیں، اور خود عربوں کی روایتی فیاضی و مہمان نوازی کی بدولت ان کے یہ مہمان ان ہی کی سرزمین میں رہ کر انھیں زیر دام کر رہے ہیں، جن پر ایسی غفلت اور خود فراموشی طاری ہے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قید و بند کی بیڑیوں کو کستے اور مضبوط کرتے جا رہے ہیں ؎

پوچھتے کیا ہو دیار دل کی ویراں پروری ؛ جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہو گئی
رخنۂ دیوارِ زنداں آپ بھر دیتا ہوں میں ؛ قید میری خود مرے ہاتھوں دوامی ہو گئی

قرآن مجید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے فتنہ پردازوں کے فریب میں نہ آئیں، سورۂ بقرہ میں آدمؑ و ابلیس کا قصہ یہ واضح کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح شیطان نے آدمؑ کی مخالفت کی تھی اسی طرح نسب و جاہ کے گھمنڈ اور حسد کی بنا پر یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے ہیں، اسی سورہ میں یہودیوں کے ایک گروہ کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ وہ بظاہر تو رواداری اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف

نفرت وحقارت کی آگ بھڑک رہی ہے، اس کی اس دھوکہ بازی سے مسلمان اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ وہ ان کے معاملہ میں فراخ دل ہے، کیونکہ یہی گروہ جب اپنے یہودی لیڈروں کے پاس جاتا ہے تو ان کو اطمینان دلاتا ہے کہ ہم آپ ہی لوگوں کے ساتھ ہیں، ہمارا مقصد تو صرف مسلمانوں کو بے وقوف بنانا ہے، کیا آج بھی مسیحی اسی طرح کی چال بازی نہیں کر رہے ہیں؟ لیکن پھر بھی مسلمان انھیں اپنا ہمدرد سمجھ رہے ہیں، یالیت قومی یعلمون۔

تحزب واختلاف مسلمانوں کی خصوصیت ہوگئی ہے، وہ کسی مسئلہ میں متفق الرائے ہونا جانتے ہی نہیں، اس کی وجہ سے اصلی اور بنیادی مسئلے کو نظر انداز کرکے وہ جزئیات کے درپے ہو جاتے ہیں، اور غیر ضروری اور فضول بحثوں میں اپنی قوت وتوانائی ضائع کر دیتے ہیں، انگریزوں کی شاطرانہ سیاست نے ہمیشہ اصل حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے بجائے انہی ضمنی مسائل میں انھیں الجھائے رکھا ہے، کویت اور عراق کے معاملہ میں بھی ہر جگہ مسلمانوں کے دو گروہ ہوگئے ہیں، ہندوستان میں بھی ان دونوں کی کشمکش نے مسئلہ کی صحیح صورت حال لوگوں پر واضح نہیں ہونے دی ہے، اصل اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہودی وعیسائی سازش کا شکار صدام حسین ہی نہیں عرب حکمراں بھی ہوئے ہیں، یہ حقیقت ہے، چاہے کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، اس لیے صیاد خوش ہے کہ باہمی کشمکش نے عنادل کو اپنے آشیانوں سے بے فکر کر دیا ہے، اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ عالم اسلام میں ہونے والی مسیحی سازش کو سمجھ کر مسلمان اس کے تدارک کی فکر کریں۔

اترپردیش کی حکومت نے بابری مسجد کے مسئلہ کو جس قدر زور وشور سے اٹھایا اس نے پورے ملک میں فرقہ وارانہ منافرت بہت بڑھا دی اور یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے مزید پیچیدہ ہوگیا، یہی نہیں بلکہ دوسرے اہم قومی وملی مسائل اس کی وجہ سے بالکل نظر انداز ہوگئے، اردو کا مسئلہ اس طرح دبا دیا گیا کہ اب اس کا نام بھی کوئی نہیں لیتا، حکومت نے ہندی کا بول بالا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن ایک سیکولر اور قومی زبان کے معاملہ میں اس کی خاموشی اور غفلت بھی ناقابل معافی جرم ہے، آنے والے انتخابات میں اردو والوں کو اپنی زبان کو اولین اہمیت دینی چاہئے۔

مقالات

مولانا آزادؒ کی تفسیر قرآن مجید کے امتیازات

از

(پروفیسر ریاض الرحمن شروانی سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات کشمیر یونیورسٹی سرینگر)

قرآن مجید کی تفسیر و تعبیر کا سلسلہ اسکے نزول کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی بہترین عملی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تھی آپکے وصال کے بعد بعض صحابۂ کرام خصوصیت سے فہم قرآن مجید میں امتیازی حیثیت کے مالک تھے۔ ان میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے نام نمایاں ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا ایسے ایسے قرآن مجید کی تفاسیر کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ تفاسیر عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی لکھی جانے لگیں۔ یہاں ان سب تفاسیر کا جائزہ لینا مقصود نہیں، غرض یہ کہنا ہے کہ ان تفاسیر کا رنگ و آہنگ جدا جدا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن مجید کا فکری محور اس قدر وسیع ہے کہ اس سے ہر ذوق و وجدان کا شخص اپنے اپنے طور پر لطف اٹھاتا اور بصیرت و آگہی حاصل کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف لوگوں نے قرآن مجید کی تفسیریں مختلف نقطہائے

نظر سے لکھی ہیں کسی نے اس میں فلسفہ و منطق کی گتھیوں کا حل دیکھا ہے کسی نے اس کی مدد سے تاریخ و سالیر کے واقعات کا کھوج لگایا ہے کسی نے قواعد و لسانیات کے مسائل اس کی مدد سے حل کیے ہیں کسی نے سیاسیات و عمرانیات کے اصول اس کے ذریعے سمجھے ہیں اور کسی نے روزمرہ کی زندگی کا لائحہ عمل اس میں تلاش کیا ہے جب عرب اپنے جغرافیائی حدود سے نکل کر دنیا کے دوسرے ملکوں اور علاقوں میں پھیلے تو وہ ایک وسیع تر خطۂ ارض ہی کے مالک نہیں ہوئے بلکہ ان ملکوں کی علمی وراثت بھی ان کے حصے میں آئی اور وہ قدرتی طور پر اس سے متاثر ہوئے۔ اس تاثر کی جھلکیاں قرآن مجید کی مختلف ادوار اور مختلف علاقوں کی تفسیروں میں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہیں۔ کبھی یونانی فلسفہ و منطق کا اثر ان میں نظر آتا ہے کبھی اسرائیلی روایات کی جھلک ان میں ملتی ہے اور کبھی جدید مغربی فکر کے آثار ان میں محسوس ہوتے ہیں۔ جدید مغربی فکر کے ضمن میں یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ اب معاملہ اس لحاظ سے برعکس ہو گیا تھا کہ مسلمان حاکم نہیں رہے تھے بلکہ محکوم ہو گئے تھے اور اس لیے اپنے آقاؤں کی فکر سے مرعوبیت کا عنصر اس میں شامل ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان میں سے بعض نے بعض ایسے امور میں جو عقل انسانی سے ماوراء تھے اپنی تفسیروں میں معذرتی انداز اختیار کیا۔

قرآن مجید نے انسانی فکر پر پابندیاں نہیں عائد کی ہیں بلکہ انسانوں کو اس سے کام لینے پر اکسایا اور آمادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر دور اور ہر علاقے کے انسان کی فکر ایک جیسی نہیں ہو سکتی اور اس اعتبار سے قرآن مجید کی تفسیر و تعبیر میں اختلافات ناگزیر ہیں لیکن ساتھ ہی کثرت میں وحدت کی جلوہ گری قائم رکھنے اور انتشار فکر کی راہیں مسدود کرنے کی خاطر علمائے اسلام نے یہ اصول وضع کیا کہ خود قرآن مجید کے

طرز فکر اور اسلوب ادا کو معیار بنا کر اس کے معانی و مطالب حل کیے جائیں تا کہ تفسیر بالرائے کا امکان باقی نہ رہے۔ تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے اس بارے میں بھی خاصہ اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے :۔

"تفسیر بالرائے کا مطلب سمجھنے میں لوگوں کو لغزشیں ہوئیں تفسیر بالرائے کی ممانعت سے مقصود یہ نہ تھا کہ قرآن مجید کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے یا اس کی تفسیر کرنے میں عقل و درایت کو دخل نہ دیا جائے کیوں کہ اگر یہ مطلب ہو تو پھر قرآن مجید کا درس و مطالعہ ہی بے سود ہو جائے حالانکہ قرآن مجید کا یہ حال ہے کہ اول سے لے کر آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت دیتا ہے اور ہر جگہ مطالبہ کرتا ہے کہ "اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا (۴۷ : ۲۴) تفسیر بالرائے میں "رائے" بمعنی لغوی نہیں بلکہ "رائے" مصطلحہ شارع ہے اور اس سے مقصود ایسی تفسیر ہے جو اس لیے نہ کی جائے کہ خود قرآن مجید کیا کہتا ہے بلکہ اس لیے کی جائے کہ ہماری کوئی ٹھہرائی ہوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن مجید کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر دیا جا سکتا ہے۔"

آگے چل کر مولانا نے اس کی وضاحت کی ہے کہ مختلف مکتبہائے فکر کے مفسرین نے مختلف ادوار میں قرآن مجید کی تفسیر بالرائے کس کس طرح کی ہے اور اس سے کیا کیا کام لیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مولانا نے آیات محکمات و متشابہات کے مسئلے کو جس نے بہت سے دماغوں کو مضطرب کر رکھا ہے، اس طرح حل کیا ہے کہ وہ تفسیر قرآن مجید میں ممد و معاون ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سب امور جو

محسوسات سے تعلق نہیں رکھتے اور ذہن انسانی کی گرفت سے ماوراء ہیں متشابہات کے حکم میں داخل ہیں۔ مولانا کی رائے ہے کہ قرآن مجید کو اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح اس کے اولین مخاطبین نے سمجھا تھا، وہ کہ اس طرح جس کا سانچہ، بقول انکے تمدن کے وضعی اور صناعی عوامل نے ڈھال دیا تھا۔ انکا ارشاد ہے :

"قرآن حکیم اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب اپنے طریق استدلال، غرض کہ اپنی ہر بات میں دنیا کے وضعی اور صناعی طریقوں کا پابند نہیں اور نہ اسے ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو انبیائے کرام علیہم السلام کے طریق ہدایت کو علم و حکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ قرآن مجید جب نازل ہوا تو اسکے پہلے مخاطبوں کا گروہ بھی ایسا ہی تھا۔ تمدن کے وضعی اور صناعی سانچوں میں ابھی اس کا دماغ نہیں ڈھلا تھا اور فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت پر قانع تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن مجید اپنی شکل و معنی میں جیسا کچھ واقع ہوا تھا ٹھیک ٹھیک ویسا ہی اس کے دلوں میں بس گیا۔ اور اسے قرآن مجید کے فہم و معرفت میں کسی طرح کی بھی دشواری نہیں محسوس ہوئی ... لیکن صدر اول کا دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ روم و ایران کے تمدن کی ہوائیں چلنے لگیں اور علوم و فنون وضعیہ کا دور شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا ذوق بڑھتا گیا قرآن مجید کے فطری اسلوبوں سے طبیعتیں نا آشنا ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ قرآن مجید کی ہر بات وضعی اور صناعی طریقوں کے سانچوں میں ڈھالی جانے لگی۔ چونکہ ان سانچوں میں وہ ڈھل نہیں سکتی تھی اس لیے طرح طرح کے الجھاؤ

بڑھتے گئے۔"

اس نسبتاً طویل اقتباس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ایک طرف مولانا آزاد قرآن مجید میں تدبر و تعقل کے پوری طرح قائل ہیں لیکن دوسری طرف اس کی تعبیر و تشریح کو وضعیت و صناعیت سے پاک رکھ کر اسے اسکی بنیادی فطرت کے مطابق سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ وہ پہلے سے کوئی رائے قائم کر کے قرآن سے اس پر استدلال کرنے کی کوشش کے قطعاً مخالف ہیں۔ وہ عقل و درایت سے کام لینے پر ضرور زور دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی عقل انسانی کے حدود سے ناواقف نہیں، اس لیے وہ متشابہات میں عقلی بازی گری سے محترز رہنے کو بھی اتنا ہی ضروری قرار دیتے ہیں۔ عدل و توازن ہر میدان میں مولانا آزاد کی شخصیت کا خصوصی جوہر ہے اور اس سے تفسیر قرآن مجید بھی مبرا نہیں ہے۔

مولانا آزاد کے سامنے تفسیر قرآن مجید کا ایک وسیع لائحۂ عمل تھا لیکن زندگی کے دوسرے مطالبات، خصوصاً جہاد حریت کی گرم بازاری نے انہیں اس لائحۂ عمل کو بروئے کار لانے کی مہلت نہیں دی۔ ان کا منصوبہ تھا کہ قرآن مجید کے درس و مطالعے کو تین کتابوں میں منقسم کر دیا جائے: مقدمۂ تفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن۔ افسوس ہے کہ اس منصوبے کی پہلی دو کڑیاں معرض وجود ہی میں نہیں آئیں اور تیسری کڑی بھی ہماری نظروں کے سامنے نامکمل صورت ہی میں آسکی۔ دراصل "ترجمان القرآن" قرآن مجید کی مکمل تفسیر نہیں ہے بلکہ اسے توضیحی ترجمہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ بات خود مولانا آزاد نے کتاب کے پیش لفظ میں واضح کر دی ہے۔ البتہ سورۂ فاتحہ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس سورت کو مولانا

غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور اسے پورے قرآن مجید کا اجمال یا "قدرتی مقدمہ" بتاتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اس سورت کا صرف توضیحی ترجمہ شایع نہیں کیا ہے بلکہ اس میں مجوزہ تفسیر کا ملخص بھی شامل کر دیا ہے۔ ایسا انھوں نے اس لیے کیا ہے کہ بقول ان کے "ضروری تھا کہ کم از کم یہ مقدمہ تلاوت ترجمہ سے پہلے ذہن نشین ہو جائے"۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر مولانا کا تفسیری شاہکار ہے۔ اس میں انھوں نے قطرے میں دریا کی روانی جس طرح دیکھی اور دکھائی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اگر اسی نہج پر پورے قرآن مجید کی تفسیر مکمل ہو جاتی تو یہ کتنا بڑا کام ہوتا اسے سمجھنا دشوار نہیں۔ بہر حال قدرت کو یہ منظور نہیں تھا تاہم اب بھی جو کچھ جس صورت میں ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے امتیازات سے سیر حاصل بحث ایک مختصر مقالے میں ممکن نہیں بلکہ ایک تفصیلی کتاب کی متقاضی ہے۔ اس لیے یہاں تفسیر سورۂ فاتحہ کا نسبتاً تفصیلی جائزہ لیا جائے گا اور بعض دوسری سورتوں کی تفسیر کی طرف محض چند اشارے کیے جائیں گے۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو نمایاں کیا گیا ہے وہ ربوبیت رحمت اور عدالت ہیں۔ اس میں خدا کی حمد، صرف اسی کی عبادت اور اسی سے استعانت کا عہد ہے اور سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت طلب کی گئی ہے، ان لوگوں کا راستہ جن پر اللہ نے انعام کیا، نہ کہ ان لوگوں کا جو اس کے غضب کے مستحق ٹھہرے اور گم راہ ہوئے۔ مولانا آزاد نے ان سب امور پر اتنی شرح و بسط اور اس قدر بصیرت و دیدہ وری سے بحث کی ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کسی دوسری جگہ ملتی ہو۔ ابتدا میں یہ بتا دیا ہے کہ خدا کی صفات

کا ٹھیک ٹھیک تصور، قانون مجازات کا اعتقاد، معاد کا یقین، فلاح و سعادت کی راہ اور اس کی پہچان یہ چار ایسی باتیں ہیں جنھیں دین حق کا ماحصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ صفات باری کے ذیل میں کتنے پتے کی بات کہی ہے کہ "انسان کو خدا پرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔" دراصل شرک کی بنیاد بیشتر صفات الہٰی کا غلط تصور یا پھر اس کی کسی صفت کو مجسم کر کے معبود مان لینا ہی ہوتی ہے ورنہ مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ "خدا پرستی انسانی فطرت کا خمیر ہے۔۔۔۔ اسکی فطرت کے لیے سب سے زیادہ جانی بوجھی ہوئی بات یہی ہے کہ خالق کائنات کا اقرار کرے۔" انسانی فطرت کا یہ کتنا صحیح تجزیہ ہے جس سے روگردانی فطرت کی کجی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آگے چل کر انسان کی اس بنیادی غلطی کا ذکر کرتے ہیں کہ اس نے "خدا کے تصور۔۔۔۔ کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنا لیا تھا۔ وہ خدا سے ڈرتا تھا لیکن اس سے محبت کرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔" اور پھر یہ قابل ستائش نکتہ بیان فرماتے ہیں کہ

> "سورۂ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ (الحمد) نے اس بنیادی گمراہی کا ازالہ کر دیا اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوئی۔ حمد ثنا جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثنا جمیل اس کی کی جا سکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہوگی وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔"

"مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" میں جزا و سزا کا تصور پنہاں ہے، جس سے ذہن اللہ تعالیٰ کی قہاری و جباری کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کی توضیح جس

انداز میں کی ہے وہ اس قہر و جلال کا رشتہ عدل و انصاف سے جوڑ دیتا ہے۔ فرماتے ہیں: "جزا و سزا کو "دین" کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا و سزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج و خواص ہیں۔ یہ بات نہیں کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو۔" اسی ضمن میں مزید کہتے ہیں کہ "اگر کائنات ہستی میں صفات رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتی ہیں تو یہ اس لیے نہیں ہے کہ پروردگار عالم میں غضب و انتقام ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔" اس آخری جملے پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ نظام حیات کی درستی کا گر کتنے اختصار لیکن بالغ نظری سے بیان کر دیا ہے۔ عدل کو منافی رحمت سمجھنے سے معاشرے میں کیا بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور اسے عین رحمت تسلیم کرنے سے معاشرے کی کس طرح اصلاح ہو جاتی ہے۔

خدا کی صفات کے غلط تصور کے علاوہ ایک دوسری چیز جس نے لوگوں کو گمراہی میں مبتلا کیا پیشوایان مذاہب کی شخصیت کا معاملہ ہے۔ ان کی شخصیت کے بارے میں غلو نے پیروایان مذاہب کو توحید کے دائرے سے نکال کر شرک کی سرحد میں داخل کر دیا۔ مولانا کہتے ہیں کہ "یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت حاصل نہیں کر سکتی جب تک معلم کی شخصیت میں عظمت کی شان نہ پیدا ہو جائے لیکن شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں؟ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ اس کی ٹھیک ٹھیک حد بندی نہ کر سکے۔" گویا معاملہ وہی عدل و توازن کا ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلے میں بعض دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا ذکر کرنے کے بعد مولانا اسلام کا رویہ اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

"اس بارے میں قرآن مجید نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جابجا پیغمبر اسلام کی بشریت اور بندگی پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے۔ اسلام نے اپنی تعلیم کا بنیادی کلمہ جو قرار دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے:

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ یعنی میں اقرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں"۔ اس اقرار میں جس طرح خدا کی توحید کا اعتراف کیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجہ رسالت کا بھی اعتراف ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ صرف اس لیے کہ پیغمبر اسلامؐ کی بندگی اور درجہ رسالت کا اقرار اسلام کی اصل و اساس بن جائے۔ کوئی شخص دائرۂ اسلام میں داخل ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ خدا کی توحید کی طرح پیغمبر اسلامؐ کی بندگی کا بھی اقرار نہ کرے"۔ گویا دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے خدا کی توحید کے ساتھ ساتھ نہ صرف پیغمبر اسلامؐ کی رسالت بلکہ آپ کی عبدیت کا بھی اعتقاد لازمی شرط قرار پائی۔

مولانا آزاد نے اللہ تعالیٰ کی مذکورۂ بالا تینوں صفات یعنی ربوبیت، رحمت اور عدالت کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے جو قرآن مجید کا حقیقی منشا ہے اور جس کے مطابق اللہ تعالیٰ رب المسلمین نہیں بلکہ واقعی رب العلمین کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر صفت کے بارے میں ایسے نکات بیان فرمائے ہیں جو ان سے پہلے شاید ہی کسی کے ذہن میں آئے ہوں۔ اس کی ربوبیت ربوبیت عامہ ہے جو ظاہر و باطن دونوں پر حاوی ہے، اس کی رحمت رحمت کاملہ ہے جو

سارے عالم کا احاطہ کرتی ہے اور جس میں اپنے پرائے کی تمیز نہیں ہے وہ رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی یعنی رحمت کی صفت اس میں محض عارضی نہیں، دائمی ہے اور "اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے"۔ مولانا کہتے ہیں کہ "قرآن مجید خدا کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرنا چاہتا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام تر رحمت ہی ہے"۔ مولانا نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے مختلف رموز کو اس طرح آشکار فرمایا ہے کہ وہ چیزیں بھی جو بظاہر اس کے دائرے سے باہر محسوس ہوتی ہیں سمٹ کر اسی میں داخل ہو جاتی ہیں۔ مولانا نے اللہ تعالیٰ کی صفت عدالت کو جو جیسا کہ مذکور ہوا، جزا و سزا کے قانون سے متعلق ہے نظام کائنات کا حصہ بنا کر دکھایا ہے، مولانا کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: "کائنات ہستی کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے، ممکن نہیں یہاں کوئی شے اپنا وجود رکھتی ہو اور اثرات و نتائج کے سلسلے سے باہر ہو۔ پس جس طرح خدا نے اجسام و مواد میں خواص و نتائج رکھے ہیں اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی انفعلات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لیے قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں، معنوی موثرات سے روح متاثر ہوتی ہے اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنھیں جزا و سزا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے۔ برے عمل کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے"۔ مولانا اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو، جیسی کہ وہ قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں، انسانی ذہن کے سلسلۂ ارتقا کا نقطۂ عروج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ارتقائی نقطے ہمیشہ تین ہی رہے اور ان ہی

سے اس سلسلے کی بدایت و نہایت معلوم کی جا سکتی ہے: (۱) تجسیم سے تنزیہہ کی طرف (۲) تعدد و اشراک سے توحید کی طرف (۳) صفاتِ قہر و جلال سے صفات رحمت وجمال کی طرف۔ اس ضمن میں مولانا نے ان صفات الٰہی سے متعلق مختلف مذاہب عالم اور مختلف فلاسفہ کے طرز فکر سے سیر حاصل بحث کی ہے اور کہیں عدل وتوازن کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔

اسی طرح قرآنی اصطلاحات ہدایت، صراط مستقیم، مغضوب علیہم اور ضالین سے متعلق مولانا کی تفسیر میں ایسا مواد ملتا ہے جیسا کہیں اور نہیں ملتا ہے۔ اس کا بنیادی نقطہ پیغام الٰہی کی آفاقیت ہے جو زمانوں، تمام قوموں اور تمام حالتوں کو اپنے دائرے میں گھیر لیتی ہے۔ مولانا دین کی وحدت کے قائل ہیں۔ اس معاملے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے وحدت دین کو وحدت ادیان سے خلط ملط کر دیا ہے۔ وحدت دین کا مطلب مولانا کے الفاظ میں یہ ہے کہ "وحی الٰہی کی وہ عالمگیر ہدایت ہے جو اول دن سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق وامتیاز تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔۔۔ وہ سب کے لیے ہے اور سب کو دی گئی ہے اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے"۔ میرے خیال سے مولانا کے وحدت دین کے تصور کا ادراک کرنے کے لیے یہ عبارت بہت کافی ہے اور اس کی موجودگی میں کسی مغالطے کی گنجائش بالکل باقی نہیں رہتی ہے۔

مولانا کی تفسیر سورۂ فاتحہ پر دو اعتراض

مولانا آزاد کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر یہ دو اعتراض بہت شدت سے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اسلام کے نظام عبادت

کو اہمیت نہیں دی گئی ہے یا اسے ہنگامی ٹھہرایا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ اسکے مطابق مولانا کے نزدیک نجات کے لیے ایمان بالرسل ضروری نہیں، صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کافی ہے۔ مولانا آزاد نے ان دونوں الزاموں کی تردید فرمائی ہے لیکن ان کی تردید سے قطع نظر اگر ہم خود تفسیر سورہ فاتحہ کی اندرونی شہادت پر توجہ دیں تب بھی مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مولانا "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" کے تحت تحریر فرماتے ہیں: "عبادت کے لیے یہ نہیں کہا کہ نَعْبُدُكَ بلکہ کہا اِیَّاكَ نَعْبُدُ یعنی یہ نہیں کہا کہ "تیری عبادت کرتے ہیں" بلکہ حصر کے ساتھ کہا "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ اور پھر اس کے ساتھ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کہہ کر استعانت کا بھی ذکر کر دیا اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں بند ہو گئیں"۔ اسلام کا نظام عبادت اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ صرف ایک کے سامنے سر جھکانا اور صرف ایک سے مدد مانگنا اور کسی کے سامنے نہ جھکنا اور نہ دست سوال دراز کرنا۔ اس مسئلے سے مولانا نے تفسیر سورہ فاتحہ کے آخر میں مزید بحث کی ہے۔ اس کا لب لباب بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔

دوسرا اعتراض بھی کم نظری پر مبنی ہے کیونکہ جس طرح قرآن مجید کی ہر سورت کا ایک موضوع ہے اسی طرح سورہ فاتحہ کا بھی ایک موضوع ہے۔ یہ موضوع اللہ کی حمد، اس کی صفات کا بیان اور اس سے راہ ہدایت کی استدعا ہے۔ اس میں رسولوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ یہ ذکر قرآن مجید کی جن سورتوں میں آیا ہے انکی تفسیر میں مولانا نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے تاہم سورہ فاتحہ کی تفسیر کا مطالعہ بھی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

وہ (قرآن مجید) کہتا ہے خدا ایک ہے، اس کی سچائی ایک ہے لیکن سچائی کا پیغام بہت سی زبانوں نے پہنچایا ہے، پھر اگر تم کسی ایک پیغام کی تصدیق کرتے ہو، دوسروں کا انکار کر دیتے ہو تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک ہی حقیقت کو ایک جگہ مان لیتے ہو، دوسری جگہ ٹھکرا دیتے ہو یا ایک ہی بات کو مانتے بھی ہو، رد بھی کرتے ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ماننا ماننا نہیں بلکہ ایک زیادہ برے قسم کا انکار ہے"۔ کیا یہ عبارت نجات کے لیے ایمان بالرسل کو صاف صاف ضروری نہیں ٹھہراتی ہے اور کیا اس میں نبی آخرالزماںؐ پر ایمان لانا ضروری نہیں ٹھہرتا ہے؟ مولانا نے جہاں اس اعتراض کا جواب دیا ہے وہاں لکھا ہے کہ "اگر ایک یہودی حضرت موسیٰؑ کی سچی تعلیم پر عمل کرنا چاہے گا یا ایک مسیحی حضرت مسیحؑ کی حقیقی تعلیم پر کاربند ہوگا تو اسے ٹھیک ٹھیک یہی راہ اختیار کرنی پڑے گی جو قرآن مجید نے واضح کر دی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی"۔ کیا اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتا ہے کہ مولانا پیغمبر اسلامؐ کو سلسلۂ رسل کی آخری کڑی قرار دیتے ہیں اور ان کا وحدت دین کا تصور یہ ہے کہ سب ادیان کا خلاصہ وہی دین ہے جس کی طرف قرآن مجید دعوت دیتا ہے۔ وہ دین کی وحدت کے ساتھ شرع و منہاج کے اختلاف کو ناگزیر بتاتے ہیں اور اس کو ادیان عالم میں اختلاف کا موجب گردانتے ہیں لیکن شرع و منہاج کی ارتقائی شکل اسلامی شریعت کو تسلیم کرتے ہیں۔

بلا شبہ مولانا آزاد کا اصل اصرار توحید پر ہے اور توحید پر اصرار تمام ادیان کا مشترک پیغام رہا ہے اگرچہ بعد میں آنے والوں نے اسے مسخ کر دیا۔ اسلام توحید کے معاملے میں کسی سمجھوتے پر تیار نہیں ہے اور اس کا توحید کا تصور سرآمیزش

سے مبرا ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں: "وہ (قرآن مجید) نظام ربوبیت سے توحید الٰہی پر استدلال کرتا ہے۔ جو رب العالمین تمام کائناتِ ہستی کی پرورش کر رہا ہے۔ اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے سامنے جھکایا جائے"۔ یہ بات نہ صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر بلکہ پورے ترجمان القرآن میں مختلف مواقع پر مولانا نے بار بار مختلف انداز میں بیان کی ہے اور اس طرح بیان کی ہے کہ اگر پڑھنے والے کا دل کھوٹ سے پاک ہے تو وہ اس میں پوری طرح جاگزیں ہو کر جزو حیات بن جاتی ہے۔

مولانا آزاد جمال فطرت کے دل سے معترف و مداح ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید میں اس جمال کی عکاسی پر اپنے مخصوص انداز میں روشنی ڈالی ہے اور اس کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو تعمق فکر کے ساتھ حسن ادا کا بھی طلب گار ہے اور یہاں مولانا کے اسلوب کی رعنائی و زیبائی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ لکھتے ہیں:

"کائنات ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن و رعنائی نے ایک نقاب زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر و گردش، سورج کی روشنی اور اس کی بوقلمونی، چاند کی گردش اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب، حیوانات کے

اجسام اور ان کا تنوع، نباتات کی صورت آرائیاں اور باغ و چمن کی رعنائیاں پھولوں کی عطر بیزی اور پرندوں کی نغمہ سنجی، صبح کا چہرۂ خنداں اور شام کا جلوۂ محبوب، غرض کہ تمام تماشا گاہ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے ... روشنی، رنگ، خوشبو اور نغمہ حسن و رعنائی کے وہ عناصر ہیں جن سے مشاطۂ فطرت چہرۂ وجود کی آرائش کر رہی ہے۔"

پھر مولانا کو احساس ہوتا ہے کہ کائنات ہستی میں "قمری و بلبل کی نغمہ سنجیوں کے ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا بھی موجود ہے اور اس سے لوگ دھوکا کھا سکتے ہیں کہ یہاں صرف حسن و زیبائش ہی نہیں، بدہئیتی و بدصورتی بھی موجود ہے۔ یہاں مولانا آزاد کی نغمہ و موسیقی کے ساتھ دل چسپی اور اس میں ان کی مہارت رونما ہوتی ہے اور وہ لکھتے ہیں: "تم بھول جاتے ہو کہ ارغنون ہستی کا نغمہ کسی ایک ساز سے نہیں بنا ہے اور نہ بننا چاہیے تھا۔ جس طرح تمھارے آلات موسیقی کے پردوں میں زیر و بم کے تمام آہنگ موجود ہوتے ہیں اسی طرح ساز فطرت کے تاروں میں بھی اتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ اس میں ہلکے سے ہلکے سر بھی ہیں جن سے باریک اور سریلی صدائیں نکلتی ہیں۔ موٹے سے موٹے سر بھی ہیں جو بلند سے بلند اور بھاری سے بھاری صدائیں پیدا کرتے ہیں۔ ان تمام سروں کے ملنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہی موسیقی کی حلاوت ہے کیونکہ دنیا کی تمام چیزوں کی طرح موسیقی کی حقیقت بھی مختلف اجزا کے امتزاج و تالیف سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک ہی سر سے نغمے کی حلاوت پیدا ہو جائے۔ اگر تم بین یا ستار اٹھا کر صرف اس کے چڑھاؤ کا کوئی ایک پردہ چھیڑ دو گے یا

پیانو کی بھاری کنجیوں میں سے کوئی ایک کنجی ہی بجانے لگو گے تو یہ نغمہ نہ ہوگا، بجاں بجاں کی ایک کرخت آواز ہوگی۔ یہی حال موسیقی فطرت کے زیروبم کا بھی ہے۔ تمھیں کوے کی کائیں کائیں اور چیل کی چیخ میں کوئی دلکشی محسوس نہیں ہوتی لیکن موسیقی فطرت کی تالیف کے لیے جس طرح قمری و بلبل کا سر ضروری تھا اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سر بھی ناگزیر تھا۔ بلبل و قمری کو اس سرگم کا اتار سمجھو اور زاغ و زغن کو چڑھاؤ۔" شاید ہی قرآن مجید کی کسی دوسری تفسیر میں موسیقی کے رموز اس طرح بیان ہوئے ہوں اور ان کا رشتہ جمال فطرت سے اس طرح استوار کیا گیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مولانا آزاد کی تفسیر کی روشنی میں قرآن مجید کی جمالیات پر پورا مقالہ لکھا جا سکتا ہے لیکن یہ دوسرا موضوع ہے۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے علاوہ ترجمان القرآن کے دوسرے حصے بھی مولانا آزاد کے تعمق فکر، فہم قرآن مجید اور حسن ادا پر شاہد عادل ہیں۔ یہاں ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں، صرف تین سورتوں کی تفسیر کی طرف بعض اشارے کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یہ تینوں سورتیں توبہ، یوسف اور کہف ہیں۔ سورۂ توبہ کی تفسیر میں کئی ایسے امور زیر بحث آئے ہیں جو مہمات امور میں داخل ہیں مثلاً جہاد، جزیہ، احکام زکوٰۃ اور اسلام کا اقتصادی نظام۔

اس سورت میں جہاد کا ذکر فتح مکہ کے بعد کے دور سے تعلق رکھتا ہے، اسکے بارے میں مولانا کا کہنا ہے کہ یہ حکم صرف ان کفار مکہ کے خلاف تھا جنھوں نے بدعہدی کی اور ظلم و تشدد کا راستہ اختیار کیا، نہ کہ عام کفار کے خلاف اور پھر ارشاد: موعظت کا دروازہ اولی الذکر کے لیے بھی کھلا رکھا گیا" اور دین و اعتقاد کے معاملے

جبر واکراہ کے شبہے سے بھی بالاتر رکھا گیا۔" اگرچہ یہ آیات ایک خاص موقع سے تعلق رکھتی ہیں تاہم ان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جہاد کا اصلی مقصد بد عہدی اور ظلم و تشدد کا خاتمہ اور عبرت پذیری کا موقع فراہم کرنا ہے، نہ کہ تبلیغ اسلام یا قیام حکومت۔

جزیہ وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلم رعایا اسلامی حکومت کو ادا کرتی تھی۔ جزیے کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس سے سب سے اچھی بحث مولانا شبلی نعمانیؒ نے کی ہے جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جزیہ ان تندرست اور جوان غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا تھا جو فوجی خدمت سے استثنا چاہتے تھے۔ سورۂ توبہ میں اس سلسلے میں یہ آیت ملتی ہے: حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۔ مولانا نے اس کا ترجمہ کیا ہے: "یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ اٹھا کر جزیہ دیدیں اور ان کا گھمنڈ ٹوٹ چکا ہو۔" پھر تشریح فرمائی ہے: "نہ صرف عربی زبان میں بلکہ تقریباً ہر زبان میں یہ محاورہ موجود ہے کہ کسی چیز کو اپنے ہاتھ سے دیدینا رضامندی سے دینا ہوتا ہے..... پس مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کرلیں اور ان کا گھمنڈ اور ظلم، جس نے انسان کے امن و راحت کو خطرے میں ڈال دیا تھا، باقی نہ رہے۔" یہاں "عَنْ یَدٍ" کی تفسیر میں رضامندی اور خوشی کی شمولیت اور "صٰغِرُوْنَ" کی تفسیر میں گھمنڈ کے ساتھ ظلم کے ازالے کی طرف اشارے نے جو معنویت پیدا کردی ہے اور معاملے کو جتنا خوشگوار بنا دیا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ جزیہ غیر مسلموں پر کیوں عائد کیا گیا اس بارے میں مولانا آزاد مولانا شبلی نعمانیؒ کے ہم خیال ہیں یعنی یہ ان غیر مسلموں کے لیے تھا جو جنگی خدمات میں شریک نہ ہونا چاہیں۔ ساتھ ہی مولانا نے یہ بھی واضح کردیا ہے کہ مسلمانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ

غیر مسلموں سے بہت زیادہ تھا اور اس اعتبار سے جزیہ ان کے لیے رعایت تھی، نہ کہ زیادتی۔ یہاں یہ امر ضرور ملحوظ نظر رہنا چاہیے کہ اس طرح کی تفریق، خواہ وہ کسی فریق کے حق میں ہو یا اس کے خلاف، ایک مذہبی ریاست میں تو ممکن ہے کوئی سیکولر اسٹیٹ نہ اس کی متحمل ہو سکتی ہے اور نہ اس میں وہ مباح قرار دی جا سکتی ہے۔

مولانا زکوٰۃ کے اجتماعی نظام پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے لیے اسلامی حکومت کا وجود ضروری نہیں بلکہ ایک ایسے معاشرے میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں یہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیے۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ:

"اگر اسلامی حکومت کے فقدان سے جمعہ ترک نہیں کر دیا گیا جس کا قیام امام و سلطان کی موجودگی پر موقوف تھا تو زکوٰۃ کا نظام کیوں ترک کر دیا جائے؟ کس نے مسلمانوں کے ہاتھ اس بات سے باندھ دیئے تھے کہ اپنے اسلامی معاملات کے لیے ایک امیر منتخب کر لیں یا ایک مرکزی بیت المال پر متفق ہو جائیں؟"

غور فرمائیے کہ اگر آج اس ملک میں مسلمان زکوٰۃ کا اجتماعی نظام قائم کر لیں تو ان کے کتنے اقتصادی مسائل کس حسن و خوبی سے حل ہو جا سکتے ہیں! مولانا نے زکوٰۃ کا اصلی مقصد یہ بیان کیا ہے کہ "دولت سب میں پھیلے، سب میں بٹے، کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری نہ ہو جائے"۔ پھر اس مفہوم کی بعض آیات اور بعض احادیث نقل کر کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی روح دولت کے احتکار و اختصاص کے خلاف ہے یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکیداری میں آ جائے

یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو دولت کو خزانہ بنا بنا کر جمع کرے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دولت ہمیشہ سیر و گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ تمام افراد قوم میں پھیلے اور منقسم ہو۔"

مولانا نے قرآن مجید کے اس اقتصادی نظام سے تقسیم ترکہ اور حرمت سود کا رشتہ جوڑا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں: "قرآن مجید و سنت کی تعلیمات اور صحابۂ کرامؓ کی عملی زندگی کے مطالعے کے بعد مجھے اس حقیقت کا پورا اذعان ہو گیا ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشے میں دولت اور وسائل دولت کے احتکار و اکتناز کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے"۔ اسی لیے مولانا کے نزدیک اسلام اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس کے برعکس وہ سوشلزم کو ایک خاص حد تک اسلام کے نظام معیشت سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں البتہ ان کا خیال ہے کہ "معیشت کے لحاظ سے تمام افراد و طبقات کی حالت یکساں نہیں ہو سکتی اور یہ عدم یکسانیت اکثر حالتوں میں قدرتی ہے کیونکہ سب کی جسمانی و دماغی استعداد یکساں نہیں اور جب استعداد یکساں نہیں تو ناگزیر یہ ہے کہ جد و جہد معیشت کے ثمرات بھی یکساں نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کر لیا جائے کہ جو جس قدر حاصل کر سکتا ہے وہ اسکا ہے"۔ یہاں اسلام اور سوشلزم کی راہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، مولانا کی رائے ہے کہ اسلام اور سوشلزم کچھ دور تک ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں جب کہ اسلام اور سرمایہ داری کا ساتھ چند قدم بھی نہیں رہ سکتا۔

سورۂ یوسف میں کئی ایسے امور زیر بحث آئے ہیں جو حیات انسانی میں بہت

اہمیت کے حامل ہیں اور جن سے انسانی کردار کے مختلف گوشوں پر بڑی معنی خیز روشنی پڑتی ہے۔ انسانی سیرت کے زشت وخوب دونوں پہلو اس سورت میں نہایت وضاحت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف حسد، سازش، فریب، ظلم، ہوس، الزام تراشی، دعوت معصیت، دھمکی اور بدگوئی جیسی برائیوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے تو دوسری طرف صبر، استقامت، یقین، عصمت وپاکی، عفو ودرگذر، فہم وتدبر، دانش وحکمت، وفاکیشی، حق پسندی وراست بازی، فضیلت علم اور جود وسخا جیسے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حضرت یوسفؑ کے قصے میں پوشیدہ رموز کو عین منشائے قرآنی کے مطابق آشکار کیا ہے اور ساتھ ہی قرآن مجید کے معانی ومطالب کی وسعت، بیان وقایع میں ایجاز بلاغت، دقت بیان اور معجزانہ اسلوب کو نہایت حسن وخوبی سے واضح کیا ہے۔ نیز اس قصے کے ضمن میں تورات اور قرآن مجید کی تصریحات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں، صرف دو اقتباسات دیے جانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ پہلے اقتباس کا تعلق قصے کے اس حصے سے ہے جس میں عزیز مصر کی بیوی حضرت یوسفؑ کو معصیت پر آمادہ کرنا چاہتی ہے لیکن حضرت یوسفؑ اس سے دامن کشاں نکل جاتے ہیں۔ اس کشمکش میں ان کا کرتا پھٹ جاتا ہے۔ اس دوران عزیز مصر وہاں آپہنچتا ہے اور اس کی بیوی الٹا حضرت یوسفؑ پر الزام لگاتی ہے کہ وہ اس کے بارے میں بری نیت رکھتے تھے۔ حضرت یوسفؑ قدرتاً اس الزام سے برائت کا اعلان کرتے ہیں۔ خود اس عورت کے کنبے والوں میں سے ایک شخص مسئلے کا یہ حل بتاتا ہے کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو قصوروار یوسفؑ ہیں اور اگر پیچھے

سے پھٹا ہوا ہے تو عورت جھوٹ بول رہی ہے، قصور اسی کا ہے۔ کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا نکلتا ہے اور عزیز مصر عورت سے کہتا ہے "کچھ شک نہیں یہ تم عورتوں کی مکاریوں میں سے ایک مکاری ہے اور تم لوگوں کی مکاریاں بڑی ہی سخت مکاریاں ہیں"۔ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ عبارت ایک خاص واقعے سے تعلق رکھتی ہے اور وہ بھی ایک انسان کا قول ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا، قرآن مجید نے تو اسے محض دہرا دیا ہے۔ اس کے باوجود اس قول کو اس طرح پیش کیا جاتا رہا ہے گویا یہ قرآن مجید کی عورت ذات کی مکاری پر شہادت ہے۔ مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں: "عزیز کے اس قول میں کہ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ ۝ جو رائے ظاہر کی گئی ہے وہ ظاہر ہے کہ اپنے وقت اور اپنے شہر کی عورتوں کی نسبت ہے، نہ کہ دنیا جہاں کی تمام عورتوں کے لیے اور پھر جو کچھ بھی ہے عزیز کا قول ہے، خود قرآن مجید کا حکم نہیں ہے لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اس مقولے کا اس طرح استعمال شروع کر دیا گویا عورتوں کے جنسی اخلاق کے لیے یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے اور اس کے نزدیک عورتوں کی جنس مردوں کے مقابلے میں زیادہ مکار اور بے عصمتی کی گھاتیں نکالنے میں زیادہ ہشیار ہے ....

حالانکہ نہ تو قرآن مجید کا یہ حکم ہے، نہ عزیز کا قول ایسے محل میں ہے کہ اطلاق و عموم کے یہ سوالات پیدا ہوں۔ بحث و تفسیر کی یہ پوری عمارت بنیاد سے لے کر چوٹی تک بالکل بے اصل ہے"۔ مولانا اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آگے لکھتے ہیں: "بلاشبہ مردوں نے اپنی ظالمانہ خود غرضیوں سے عورتوں کے بارے میں ہمیشہ ایسے ہی فیصلے کیے ہیں لیکن قرآن مجید کا یہ فیصلہ نہیں ہے۔ اس نے ہر جگہ مرد اور عورت دونوں کا مساویانہ حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فضائل و خصائل کے لحاظ سے

وہ دونوں میں کسی طرح کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ حضرت یوسفؑ کو عزیز مصر کی بیوی کی منشا نہ پوری کرنے کے جرم میں قید و بند کی مصیبت بھگتنی پڑی۔ اس موقع پر مولانا آزاد نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے اس نے اس واقعے کی عظمت کتنی بڑھا دی ہے یہ نکتہ مولانا آزاد سے قبل کوئی دوسرا مفسر اس طرح پیش نہیں کر سکا تھا۔ ارشاد فرماتے ہیں:

"دُنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو روک نہیں سکتے لیکن اب حضرت یوسفؑ کے سامنے قید کی سزا ایسے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے کو روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسفؑ کو اس لیے قید خانے کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ عیش حیات نے ساری دلفریبیوں اور رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی، انھوں نے اس سے منہ موڑ لیا۔"

سورۂ کہف کی تفسیر مولانا آزاد کی تحقیقی اور علمی صلاحیتوں کا نقطۂ عروج ہے۔ اس میں انھوں نے ذوالقرنین کی شخصیت کا جس طرح تعین فرمایا ہے اور کہف کے محل و نوعیت کو جس طرح واضح کیا ہے اس میں ان کا مثیل کوئی دوسرا نہیں۔ انکے علاوہ اس سورت کی تفسیر میں کئی اور ایسے مقام بھی آتے ہیں جو مولانا آزاد کے اختصاصات قرار دیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً واقعۂ کہف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غارِ ثور میں قیام فرمانے اور پھر فتح و کامرانی حاصل کرنے کی طرف اشارہ یا یہ بحث کہ اصحاب کہف طویل مدت تک خوابیدہ رہنے کے بعد بیدار ہوئے یا ان پر موت

طاری ہو گئی تھی اور انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا۔ مولانا آزاد کی رائے ہے کہ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ میں "ایقاظ" سے مقصود ان کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا، نہ کہ بیداری اور خواب۔ چناں چہ عربی میں زندگی و موت کے لیے یہ تعبیر عام و معلوم ہے"۔ مولانا کی تحقیق ہے کہ "یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور جنھیں پیش آیا تھا وہ عیسائی تھے"۔ ذوالقرنین کی شخصیت کے تعین میں مفسرین نے بڑی قیاس آرائیاں کی ہیں اور بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ سکندر ہے۔ مولانا آزاد نے نہایت حسن و خوبی سے ثابت کیا ہے کہ قرآنی آیات کی روشنی میں ذوالقرنین فارس کا شہنشاہ سائرس ہے۔ بعد کے مفسرین میں سے بیشتر نے مولانا کی اسی تحقیق کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کی پیروی کی ہے اس سورت میں یاجوج ماجوج کا بھی ذکر آیا ہے اور ان کے بارے میں مولانا کا قول فیصل ہے کہ وہ منگول قبائل ہیں۔

سولھویں سترہویں صدی کے آگرے کے ایک عارف و خطاط شاعر میر عبداللہ حسینی مشکیں قلم

از ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی احمد آباد

" یہ دلچسپ مقالہ ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے آیوا یونیورسٹی (امریکا) کے ایک سمینار جس کا موضوع " ہندوستان کے اسلامی عہد کی عمارات کے کتبات" تھا، ۱۹۸۵ء میں پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی محکمۂ آثار قدیمہ میں کتبہ شناسی کے ڈائرکٹر تھے، انھوں نے ہندوستان کے اسلامی عہد کے صدہا کتبات کو روشناس کرانے میں جس فنی مہارت کا ثبوت دیا اس کی مثال ہندوستان میں نہیں ملے گی۔ انکے زیر نظر مقالے کا عنوان بھی " میر عبداللہ مشکیں قلم کے مقبرے کے کتبات" تھا۔ مقالہ انگریزی میں تھا جو ہنوز شایع نہیں ہوا ہے، امریکا کے اس سمینار میں راقم الحروف بھی شریک تھا اور ڈاکٹر ڈیسائی کے محققانہ مقالے سے کافی متاثر ہوا تھا۔ جی چاہا کہ اس مقالے سے اردو دنیا بھی مستفید ہو، اس بنا پر میری خواہش پر عزیزم ڈاکٹر کبیر احمد جائسی صدر شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی نے اس مقالے کو اردو میں منتقل کیا، راقم ان کا بیحد شکر گذار ہے، ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے مقالے نے میری دلچسپی اس حد تک بڑھائی کہ میں نے خود میر عبداللہ مشکیں قلم

اور ان کے دونوں بیٹوں: میر محمد صالح کشفی اور میر محمد مومن عرشی کی تصانیف کے بارے میں جتنی اطلاعات ممکن تھیں حاصل کیں اور حال ہی میں ایک مقالہ بعنوان میر محمد صالح کشفی اور ان کی کتاب: مناقب مرتضوی، مجلہ علوم اسلامیہ میں اشاعت کے لیے دیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے مقالے میں انھیں کی اجازت سے حاشیے میں کہیں کہیں کچھ اضافہ کر دیا گیا ہے اور مقالہ کے عنوان میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کر لی گئی۔

(پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ)

ہندوستان میں عام طور پر خطاطوں اور مصوروں کے بارے میں لوگوں کا علم بہت محدود ہے حالانکہ تذکروں اور تاریخی کتابوں میں ان کے حالات درج ہیں مثال کے طور پر اکبر اور جہانگیر کے عہد کے سب سے اعلیٰ اور ماہر خطاط محمد حسین کشمیری زریں قلم سے ہم بالکل ناواقف ہیں۔ لوگوں کو نہ اس کی تاریخ وفات کا علم ہے اور نہ اس کے مدفن ہی کا۔ صرف خطاطوں اور مصوروں کی دستخط کردہ تحریریں، ان کے لکھے ہوئے مخطوطے اور وصلیاں وغیرہ ہماری رہنمائی کرتی اور ان کے بارے میں مختصر مگر تاریخ وار کوائف سے ہم کو روشناس کراتی ہیں لیکن انکی شخصیت کے دوسرے کوائف سے ہم بے خبر ہیں تاہم اپنے دور کے ماہر ترین اور مشہور ترین خطاط میر عبداللہ حسینی ترمذی مشکیں قلم اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جو اپنے نام کے ساتھ جہانگیر شاہی کا لاحقہ تحریر کرنے کے عادی ہیں۔

میر عبداللہ حسینی ترمذی کا قیام زیادہ تر الہ آباد اور آگرہ میں رہا۔ جہاں وہ صرف خطاط کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ مرتبے کے صوفی کی حیثیت سے بھی معروف تھے ان کا تذکرہ ان کے مختلف معاصر تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصانیف میں کیا ہے،

ان کتابوں میں ان کے روحانی تصرف کا بھی ذکر ملتا ہے علاوہ ازیں ان کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کے بارے میں بھی ہم کو علم ہے۔ یہ تینوں اپنے زمانے کے ماہر خطاط، ادیب، شاعر اور صوفی تھے، ساتھ ہی ان کا شمار موسیقی کے ماہرین کے زمرہ میں بھی ہوتا ہے۔ میر عبداللہ حسینی ترمذی کی ایک نادر سوانح حیات "مناقب العلوم" جو غالباً ان کے بڑے بیٹے میر محمد صالح کی تحریر کردہ ہے، کامن ویلتھ لائبریری لندن میں محفوظ ہے، اس کا ایک اور نادر نسخہ ذخیرۂ مولانا آزاد، انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشن نئی دہلی میں بھی خوش قسمتی سے دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو ان کی تاریخ وفات اور مقام تدفین کا بھی علم ہے۔ بلکہ ان کے ایک معاصر مورخ نے تو مغلوں کے دارالحکومت آگرہ میں ان کے مکان کی بھی نشاندہی کر دی ہے۔ گو ان کا مکان اب باقی نہیں ہے مگر ان کا مقبرہ اب بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ یہاں ایک اور مقبرہ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جس کی تحقیق دریافت ماضی قریب میں ہوئی ہے۔ یہ مقبرہ ایک اور ماہر خطاط عبدالحق امانت خاں شیرازی کا ہے جو ضلع امرتسر کے ایک مقام سرائے امانت خاں میں واقع ہے لیکن اس پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ امانت خاں نے سکندرہ میں اکبر کے مقبرہ کے بہت ہی خوبصورت نسخ اور نستعلیق کتبے لکھے ہیں، علاوہ بریں انھوں نے تاج محل، آگرہ کی شاہی مسجد اور خود اپنی بنا کردہ سرائے، سرائے امانت خاں میں بھی اتنے ہی خوبصورت کتبے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سرائے امانت خاں چلے گئے جہاں وہ اپنی وفات تک قیام پذیر رہے۔

میر عبداللہ المتخلص بہ وصفی بن میر مظفر حسین ترمذی، اکبر اور جہانگیر کے

دربار کے چار چوٹی کے ماہرین خطاط میں سے ایک تھے۔ وہ چودہویں۔پندرہویں صدی کے مشہور و معروف ایرانی صوفی شاہ نعمت اللہ ولی کے اخلاف میں تھے۔ان کے اجداد میں سید جہانگیر ہاشمی اور شاہ طیب ہروی بھی تھے جیسا کہ میر موصوف کے چھوٹے بیٹے میر مومن نے جن کا تخلص عرشی تھا۔ایک نظم میں لکھا ہے۔ان کا مادری رشتہ عہد اکبری کے بخشی خواجہ نظام الدین احمد سے تھا جو طبقات اکبری کے مصنف بھی ہیں تقریباً ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵-۹۶ء میں جب ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی مشہور تاریخ منتخب التواریخ لکھی وہ اکبر کے دربار میں احدی کے منصب پر فائز تھے۔بقول بدایونی وہ خطاطی میں شاہ غیاث اور مولانا قمی کے شاگرد اور ہفت رقم تھے۔ان کے دو بیٹے میر محمد صالح کشفی اور میر محمد مومن عرشی محض خطاطی کی حیثیت سے مشہور نہ تھے بلکہ اس زمانے کے شاعروں دانشوروں اور صوفیوں کے زمرے میں بھی ان کا شمار ہوتا تھا۔آخر الذکر کے پوتے، میر عبداللہ بن میر ہاشم حسینی بھی ادیب و شاعر تھے، ایک اور خطاط میر محمد شریف کے ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰-۳۱ء کے تحریر کردہ خطاطی کے ایک نمونے کا ہم کو علم ہے وہ بقول مرحوم ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی مشکیں قلم کے بھانجے تھے لیکن ڈاکٹر چغتائی نے اس سلسلے میں اپنے ماخذ کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے جس کی مدد سے انکی بات کی تصدیق[1] یا تردید کی جاسکے۔

---

[1] مرآۃ العالم ج ۲ ص ۸۰۵ ہ میں میر محمد شریف کا ذکر اس طرح آیا ہے "ہمشیرہ زادۂ میر عبداللہ خط نستعلیق را خوب می نوشت و از حضرت جنت آشیانی خطاب کاتب السلطانی یافتہ میر عبداللہ او را بجای فرزند تربیت نمودہ، وقت رحلتش جانشین خود ساختہ بود او باوجود کمالات گمنامی پیشۂ خود کردہ در ملک فقر نام آوری داشت و وجہ قوت از کسب دست (بقیہ حاشیہ ص ۲۷۲)

میر عبداللہ کی خطاطی کی شہرت نے ان کی ادبی اور روحانی حیثیت کو دھندلا کر دیا ہے۔ وہ فارسی کے شاعر تھے جن کا ذکر تذکرہ نگاروں نے بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے اور ان کی پانچ مثنویوں اور ایک دیوان کا ذکر بھی کیا ہے مذکورہ مثنویوں میں سے صرف ایک کے بارے میں ہم کو علم ہے کہ وہ دستبرد زمانہ سے محفوظ ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ ان کا دیوان ضایع ہو چکا ہے لیکن ان کے دیوان کے کچھ اشعار انکے معاصر بدایونی اور ان کے بعد کے تذکرہ نگاروں کی تحریروں میں محفوظ ہیں علاوہ برایں بعض بعض بیاضوں میں بھی ان کے کلام کے جستہ جستہ نمونے مل جاتے ہیں۔ ان کی مثنوی گلشن اسرار جو ۱۰۰۵ھ میں نظم ہوئی تھی اس کا ایک مخطوطہ سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے (فہرست مخطوطات جلد اول ص ۱۲۰ نمبر ۱۸۴۷) چونکہ یہ مثنوی نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن اسرار کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی مثنویاں خمسۂ نظامی کے جواب میں نظم ہوئی ہوں گی[1]۔ مذکورہ دیوان اور مثنویوں کے علاوہ جہانگیر کی بیوی اور راجہ مان سنگھ کی بہن، شاہ بیگم کی قبر پر جو اشعار کندہ ہیں وہ نہ صرف ان کی فکر کا نتیجہ ہیں بلکہ اس کی خطاطی بھی انہی کی ہے۔ اس کتبہ کے پس منظر میں بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں اور اشعار خوبصورت نستعلیق خط میں کندہ کیے گئے ہیں شاہ بیگم کی قبر آج بھی خسرو باغ الہ آباد میں موجود ہے اور یہ خوبصورت کتبہ

(حاشیہ ص ۲۷۱) پیدا کردہ وجہ معیشت خودمی کرد۔ در سنہ یک ہزار و پنجاہ و چہار راقم احوال اعمالنامۂ عمرش بسر آورد ذہبی تاریخ عرشی نے بھی انکی وفات کے قطعہ میں لکھی ہے (نذیر احمد)

[1] مرآۃ العالم ج ۲ ص ۸۰۳، میں ہے کہ "پنج مثنوی ویک دیوان دارد"۔

آنے جانے والوں کے دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے۔ (ایپی گرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین سپلیمنٹ، ۱۹۶۱ء، پلیٹ ۲۱)

باوجودیکہ میرعبداللہ کا تعلق دربار سے تھا اور وہ پیشہ ور خطاط تھے تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے صوفیانہ انداز سے اپنی زندگی گذاری۔ وہ چشتیہ سلسلہ میں مرید تھے اور اس زمانے کے مشہور شیخ طریقت شیخ فیض اللہ سہارنپوری[۲] سے ان کو نسبت بیعت حاصل تھی۔ ان کی حیات اور کرامات پر "فاتح القلوب" نام کی ایک کتاب ملتی ہے جس کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ یہ ان کے کسی گمنام مرید کی ہے (فہرست مخطوطات فارسی مخزونہ انڈیا آفس لائبریری آکسفورڈ ۱۹۰۳ء، ص ۱۳۱۶ نمبر ۶۵۰) لیکن غالباً یہ کتاب ان کے بیٹے کی تصنیف ہے جس کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا جا چکا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے ہر طبقے کے لوگ ان سے روحانی فیوض و برکات اور راہنمائی حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے۔ صاحب "ذخیرۃ الخوانین" شیخ فرید بھکری اور ان کے والد دونوں ہی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل تھے۔ علاوہ بریں اکبر کے ایک قدیم خادم تاتار خاں سفرہ چی اور جہانگیر کے قلم تراش خواجہ ناصر دونوں ہی ان کے مریدوں میں تھے۔ شیخ فرید ان کو ایسے غوث العالم کے لقب سے یاد کرتے ہیں جن کے کشف و کرامات اور روحانی تصرف کو رقم کرنے سے قلم قاصر ہے۔ شیخ فرید اپنے پیر کی

---

[۱] نیز دیکھئے W.E.Begley: Monumental Islamic Calligraphy from India. U.S.A. 1985 P.94 No.52

[۲] خلیفہ شیخ نظام نارنولی، وفات ۱۰۲۵ء۔ مراۃ العالم ص ۴۸۳ (نذیر احمد)

سوانح میں ایک بہت دلچسپ داستان قلمبند کرتے ہیں۔ قاضی عماد جو کہ تورانی امرا کے خاندان سے تھے وہ اکبر کے عہد میں ٹیکس آفیسر اور آگرہ کے محلہ منگو بازار میں میرعبداللہ کے پڑوسی تھے۔ جب قاضی عماد کی مالی حالت بہتر ہوگئی تو انھوں نے اپنے مکان کو میرعبداللہ کے مکان سے زیادہ اونچا بنوا لیا۔ میرعبداللہ کو یہ بات پسند نہ آئی انھوں نے اپنی ناپسندیدگی کی اطلاع شیخ فرید اور ان کے والد کے ذریعے قاضی عماد کو کی اور کہلایا کہ اپنے پڑوسیوں کا خیال نہ کر کے ان سے زیادہ اونچا مکان بنوانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاف کی مستورات کو بے پردہ دیکھنا ان جیسے شخص کو زیب نہیں دیتا۔ اس بات کو سن کر قاضی نے رعونت کا مظاہرہ کیا۔ میر عبداللہ جتنی زیادہ نرمی کا مظاہرہ کرتے جاتے قاضی کے رویے میں اتنی ہی سختی آتی جاتی۔ آخر کار میرعبداللہ نے شیخ فرید کے ذریعے قاضی کو یہ پیغام بھیجا کہ "ایک سال کے بعد نہ تو میں اس مکان میں رہوں گا اور نہ تم اس مکان میں" خوبیٔ قسمت کہ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ہی میرعبداللہ اور قاضی دونوں کا انتقال ہوگیا (ذخیرۃ الخوانین دوم ص ۴۰۰-۴۰۱) میرعبداللہ کے مرقد پر جو کتبہ نصب ہے اس میں ان کو قطب زماں، مظہر انوار جاوداں اور رکان سخا کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے علاوہ بریں اس کتبہ میں یہ بھی تحریر ہے کہ وہ چشتیہ صوفیہ میں باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

میرمحمد صالح کشفی جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے میرعبداللہ کے دونوں صاحبزادے بھی ماہر خطاط اور شاعر تھے اور تصوف کی طرف میلان بھی رکھتے تھے۔ بڑے صاحبزادے میرمحمد صالح کشفی نے اپنے انتقال کے وقت تک شاہجہاں کے کتابخانہ

میں داروغہ[1] کی حیثیت سے کام کیا وہ نہ صدی ذات صد سوار کے منصب دار تھے ان کی ادبی یادگاروں میں ان کا وہ ترجیع بند شامل ہے جس کا عنوان "مجموعۂ راز" ہے۔ یہ ترجیع بند متعدد بار شایع ہو چکا ہے سنہ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر شیخ چاند حسین نے اس کا متن مع مقدمہ بزبان انگریزی جرنل آف دی بومبے برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نیو سیریز شمارہ ۱۸ صفحات ۴۸-۶۳ پر شایع کیا ہے انکی ایک اور کتاب مناقب مرتضوی بھی مختلف کتابخانوں میں محفوظ ہے اور تاریخ آگرہ کے مصنف سعید احمد مارہروی کے قول کے مطابق مناقب مرتضوی کا ایک نسخہ زیب[2] مخطوطہ میر غلام علی رضوی ٹرسٹ آگرہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے اور بقول سراج الدین علی خاں آرزو، کشفی نے مثنوی مولانا روم کا بڑی محنت سے مطالعہ کیا تھا اور اسی کی پیروی میں مناقب مرتضوی[3] مرتب کی کشفی کا ارادہ تھا کہ وہ اعجاز مصطفوی کے نام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ بھی تحریر کریں لیکن اس کتاب

---

[1] بظاہر کشفی جلوس سال ۲۳، ربیع الاول ۱۰۶۰ھ میں داروغۂ کتابخانہ ہوئے تھے (عمل صالح ۳: ۸۴) اور چوبیسویں سال جلوس ۵ شعبان ۱۰۶۰ میں انتقال کیا، اسطرح وہ چند ماہ سے زیادہ داروغۂ کتابخانہ نہ تھے (عمل صالح ۳: ۸۶) عبارت یہ ہے "چہار دہم شعبان سال ہزار و شصت مظہر فیض جلی میر سید علی ولد سید جلال مرحوم بخدمت داروگی کتابخانہ و نقاش خانہ از انتقال میر صالح خوشنویس کہ پنجم ماہ مذکور سر بر خط اجل نہادہ نقش حیاتش از صفحہ روزگار محو شدہ بود"۔ اس بنا پر ۱۰۶۱ھ جو انکی تاریخ وفات بتائی جاتی ہے درست نہ ہوگی (نذیر احمد) [2] راقم نے وہاں دو نسخے دیکھے، ایک ۱۲۴۴ کا مکتوبہ اور دوسرا ۱۲۶۲ کا، دونوں اس صفت سے خالی ہیں جس کا ذکر مارہروی صاحب نے کیا ہے (نذیر احمد) [3] مناقب مرتضوی نثر میں ہے البتہ اس میں مثنوی کے صدہا شعر مختلف مواقع پر درج ہیں (نذیر احمد)۔

کی تکمیل سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی کے پوتے میر عبداللہ واصفی نے مذکورہ کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا بقول سعید احمد مارہروی انھوں نے فن موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا جس کا ایک نسخہ کتابخانۂ محمدیہ آگرہ میں اس زمانے میں موجود تھا۔ انھوں نے فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں کشفی اور سبحان تخلص کے ساتھ شعر کہے ہیں انکے مجموعۂ کلام کے کسی کتابخانہ میں محفوظ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ اسپرنگر نے لکھا ہے کہ ان کے قصیدوں کا مجموعہ "قصاید کشفی" موتی محل لائبریری لکھنو میں محفوظ تھا لیکن اب اس کا کہیں پتہ نہیں۔ انکے اشعار تذکروں اور دو غزلیں ایک وصلی میں ضرور ملتی ہیں۔ تین تاریخی مادوں میں ان کے مزید دس اشعار[1] ملتے ہیں جو آگرہ میں انکے والد کے مزار پر خود ان کے کندہ کیے ہوئے ہیں۔ تھامس ولیم بیل نے مفتاح التواریخ میں انکا وہ منظوم مادۂ تاریخ نقل کیا ہے جو انھوں نے جہانگیر کی تخت نشینی کے موقع پر لکھا تھا۔ ان کی خطاطی کے نمونے کمیاب ہیں بقول ڈاکٹر مہدی بیانی ایک وصلی میں انھوں نے خود اپنی ایک رباعی تحریر کی ہے جو تہران کے کتابخانۂ ملی میں محفوظ ہے علاوہ بریں باڈلین لائبریری آکسفورڈ میں بھی ان کی تحریر کردہ تین وصلیاں ایک البم میں موجود ہیں۔ برٹش میوزیم کے کتابخانے میں ایک البم میں ایک تحریر محفوظ ہے جس پر محمد صالح الحسینی کے دستخط ہیں گمان غالب یہ ہے کہ یہ تحریر بھی انھی کی ہوگی۔ اسی طرح سالار جنگ میوزیم میں بھی ایک تحریر ہے جس پر میر صالح کے دستخط اور ۱۰۵۹ھ درج ہے ممکن ہے یہ بھی انھی کی تحریر ہو۔ سالار جنگ میوزیم

---

[1] ان کی مثنوی کے کافی اشعار چند غزلیں اور ایک دو قصیدے "مناقب مرتضوی" میں نقل ہیں۔ (نذیر احمد)

میں خوبصورت نستعلیق خط کی ۱۵ وصلیاں اور بھی ہیں جن میں میر عبداللہ کے روحانی تجربات بھی مندرج ہیں، اس تحریر کا خاتمہ اس فقرے پر ہوتا ہے "مرید میر عبداللہ صالح" یعنی میر عبداللہ کے مرید صالح۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کے خطاط صالح ہیں اور یہ میر عبداللہ کے صاحبزادے کے علاوہ کوئی اور شخص نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس یادداشت کا متن اس "فتوح القلوب" کا کوئی ٹکڑا ہو جس کو ڈاکٹر ایتھے نے ان کے کسی گمنام مرید کی تصنیف بتایا ہے، اگر یہ درست ہے تو ان کی سوانح کے مصنف ان کے صاحبزادے ہیں جو اپنے آپ کو ان کا مرید قرار دیتے ہیں۔ ایک وصلی کا اور بھی ذکر ملتا ہے جس میں انھوں نے خود اپنی دو غزلیں تحریر کی ہیں۔ کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں "بادشاہ نامہ" کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے کاتب کا نام ایوانوف نے میر محمد صالح الکاتب لکھا ہے ممکن ہے یہ میر محمد صالح وہی ہوں جن کا تخلص کشفی ہے (اسٹوری ص ۵۷۵)

میر محمد مومن عرشی | میر عبداللہ کے دوسرے صاحبزادے، میر محمد مومن، داراشکوہ کے لڑکے سلیمان شکوہ کے اتالیق تھے۔ صاحب مجمع النفائس، سراج الدین علی خاں آرزو کے قول کے مطابق وہ داراشکوہ کے مداح تھے اور اس کی مدح میں قصاید لکھے۔ داراشکوہ کی یہی مداحی (بقول بعض تذکرہ نگار) اس کی ناکامی کے بعد عرشی کی عملی زندگی سے دست برداری کا موجب ہوئی۔ ان کے ادبی آثار خاصے قابل توجہ ہیں۔ ان کا ایک دیوان جس کی کتابت ان کی زندگی ہی میں ۱۰۷۳ھ ۱۶۶۲-۶۳ء میں ہوئی تھی سالار جنگ میوزیم لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس دیوان میں غزلیات

قصاید، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعیات اور قطعات سب ہی اصناف سخن کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی میوزیم میں ان کے دیوان کا ایک انتخاب بھی محفوظ ہے۔ ان کا ایک ترجیع بند بھی ملتا ہے جو نہایت عمدہ نستعلیق خط میں ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ان کے کلیات کا ایک نسخہ محفوظ ہے جس میں ایک ساقی نامہ اور دو مثنویاں شاہد عرشی اور نسخہ مہر و وفا محفوظ ہیں کلیات کی کتابت ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد یعنی ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء میں ہوئی تھی۔ اے۔ اسپرنگر نے اپنی مرتب کردہ فہرست مخطوطات میں اول الذکر کا ایک دیدہ زیب نسخہ موتی محل لائبریری میں اور اسی کے ایک اور دیدہ زیب نسخے کی ایک ذاتی ذخیرے میں موجودگی کا ذکر کیا ہے۔ مثنوی مہر و وفا کا انتساب شاہ جہاں کے نام ہے، اس سے صاحب مثنوی کے اسلاف کے بارے میں جو خود شاعر تھے اطلاعات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مثنوی کا مقدمہ خود عرشی کا تحریر کیا ہوا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں انکے دیوان کا ایک مختصر سا انتخاب بھی محفوظ ہے جس میں انکی صرف غزلیات ملتی ہیں۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ان کے دیوان کا ایک نسخہ ہے۔ ان کے متعدد اشعار تذکرہ نگاروں نے اپنے اپنے تذکروں میں بھی محفوظ کر دیے ہیں۔ بقول سراج الدین علی خاں آرزو، ان کا دیوان یوں تو بہت سہل ہے مگر اسکے مقاصد بلند اور خیالات اعلیٰ درجے کے ہیں۔

عرشی کی خطاطی کے نمونے انتہائی کمیاب ہیں ایک وصلی جس کو انھوں نے ۱۰۷۳ھ/۱۶۶۲ء میں تحریر کیا تھا ببلیو تھیک نیشنالی پیرس میں بتائی جاتی ہے۔ ایک دوسری وصلی برٹش میوزیم لندن میں ہے جس پر ۱۰۹۲ھ درج ہے۔

دیوان حسن کا ایک بہت خوبصورت نسخہ جس کی کتابت محمد حسین کشمیری نے ۱۰۱۰ھ/۱۶۰۲-۱۶۰۱ء میں کی تھی ۱۰۳۲ھ/۱۶۲۳-۱۶۲۲ء میں غضنفر خاں کے کتب خانے میں میر محمد مومن خوش نویس کے ذریعے داخل کیا گیا تھا۔ یہ میر محمد مومن خوش نویس، عرشی ہی ہیں جن کا تذکرہ ہم ان سطور میں کر رہے ہیں۔ دیوان حسن کا یہ نسخہ اب خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے۔

شاہزادے کے اتالیق ہونے کی وجہ سے اگرچہ عرشی کو دنیاوی وجاہت حاصل تھی مگر دنیا کی طرف ان کا میلان طبع نہ تھا، عزلت اور فقر کی زندگی بسر کرتے۔ ممکن ہے اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کا سبب داراشکوہ سے ان کا تعلق رہا ہو۔ نوے برس کی عمر میں ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۱-۱۶۸۰ء میں انھوں نے اس جہان فانی سے کوچ کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے میر ہاشم نعمت اللہ الحسینی کے صاحبزادے اور عرشی کے پوتے میر عبداللہ نے جب وہ خراسان میں تھے ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۵-۱۷۴۴ء میں کشفی کی "اعجاز مصطفوی" کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اس کا ایک نادر مخطوطہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے۔ جب سراج الدین علی خاں آرزو نے تقریباً ۱۱۶۴ھ میں اپنی کتاب تحریر کی اس وقت تک میر عبداللہ کے اخلاف آگرہ میں موجود تھے۔

میر عبداللہ کے ایک معاصر مصور کے ہاتھ کا ان کا ایک عکس بھی ملتا ہے۔ میر عبداللہ کا شمار اکبر اور جہانگیر کے دور کے ان چار خطاطوں میں ہوتا ہے جن کے عکس ان کے کتابت کردہ مخطوطے میں بنوائے گئے تھے۔ دیوان حسن سجزی کا وہ نسخہ جو والٹرز آرٹ گیلری، بالٹی مور، امریکا میں محفوظ ہے میر عبداللہ

کا کتابت کردہ ہے اور اس کا سنہ کتابت ۱۶۰۲-۰۳ء ہے۔ اس مخطوطے میں ان کا جو عکس ملتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اپنی عمر کے چوتھے دہے کے آخری یا پانچویں دہے کے ابتدائی حصے میں تھے۔ اس سے انکی تاریخ ولادت کے بارے میں قیاس کیا جا سکتا ہے جو ۹۶۰ھ ۱۵۵۲ء کے لگ بھگ ہوگی۔[1]

میر عبداللہ کی خطاطی کے نمونے کمیاب نہیں ہیں جو بہترین خط نستعلیق میں ہیں ان کے جن نمونوں کا اب تک علم ہو سکا ہے اس کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ خط نستعلیق میں لکھا ہوا دس پینل جس کی تاریخ تحریر سنہ ۱۰۰۳ھ ۱۵۹۵-۹۶ء ہے۔ اس پینل پر ان کے پورے دستخط موجود ہیں جس کو انھوں نے اس طرح تحریر کیا ہے "عبداللہ مشکیں قلم الحسینی الترمذی"۔

۲۔ ایک قطعہ جس کا سنہ کتابت سنہ ۱۰۱۰ھ ۱۶۰۱-۰۲ء ہے۔ یہ بھی سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے

۳۔ دیوان حسن سجزی، مکتوبہ ۱۰۱۱ھ، اس کا تذکرہ گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے

۴۔ برٹش میوزیم لندن میں سنہ ۱۰۱۱ھ کی کتابت کردہ ایک وصلی۔

۵۔ آقای کریم زادہ، تہران کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی مکتوبہ سنہ ۱۰۱۱ھ،

۶۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ پند نامۂ جہانگیری،

۷۔ ڈاکٹر مہدی بیانی، تہران کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی مکتوبہ سنہ ۱۰۲۲ھ ۱۶۱۳-۱۶۱۴ء،

[1] حوشی کی مثنوی میں انکی عمر ۴۵ سال کی تھی، اس وقت انکے چھوٹے بیٹے محمد مومن ۴ سال کے تھے، محمد مومن کی پیدائش ۱۰۰۱ھ میں ہوئی تھی اس حساب سے یہ مثنوی ۱۰۰۵ھ کی ہے اور اسی کی رو سے ان کی تاریخ پیدائش (۱۰۰۵-۴۵)، سنہ ۹۶۰ھ قرار پاتی ہے (نذیر احمد)

۸۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں محفوظ ایک وصلی جس میں خود انہی کی ایک رباعی درج ہے

۹۔ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ بغیر تاریخ کی ایک وصلی جس میں انکے تین اشعار ہیں۔

۱۰۔ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ایک اور بے تاریخ وصلی اس پہ صرف عبداللہ الحسینی بطور دستخط تحریر ہے۔

۱۱ آقا جعفر سلطان القرائی کے ذخیرے میں محفوظ ایک وصلی جس میں ساتوں خط کے نمونے ہیں۔

۱۲۔ بوسٹن کے میوزیم آف فائن آرٹس میں محفوظ ذخیرۂ راس کمار سوامی کی ایک وصلی۔

خطاطی کے مذکورہ نمونوں کے علاوہ چند نمونے ایسے بھی ملتے ہیں جن پر عبداللہ مشکیں قلم یا میر عبداللہ مشکیں قلم کے دستخط ہیں کبھی کبھی الحسینی اور الترمذی کی نسبت کا اضافہ بھی ملتا ہے گمان غالب یہی ہے کہ یہ انہیں کی تحریریں ہوں گی۔

میر عبداللہ ان چار مخصوص خطاطوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریر کے نمونے پتھروں پر ثبت ہیں۔ پتھر پر ان کی بہترین خطاطی کا ایک اعلیٰ نمونہ جو ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳-۱۶۰۴ء کا تحریر کردہ ہے جہانگیر کی رفیقۂ حیات شاہ بیگم کی قبر پہ کندہ ہے۔ جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے یہ قبر الٰہ آباد کے خسرو باغ میں آج بھی موجود ہے۔

قلعۂ الٰہ آباد کے مشہور و معروف ستون کا ایک کتبہ بھی انہی کا لکھا ہوا ہے جو جہانگیر کے پہلے سال جلوس کے موقع پر تعمیر ہوا تھا۔ یہ کتبہ دیدہ زیب نستعلیق میں ہے اور اس میں جہانگیر کا نسب نامہ تیمور تک کندہ ہے۔ سنگ موسیٰ کے ایک تخت کا کتبہ جو الٰہ آباد میں تیار ہوا تھا اور اب آگرے میں ہے، یہ اس وقت کی

یادگار ہے جب جہانگیر نے اکبر کے خلاف بغاوت کرکے آزادی کا اعلان کردیا تھا اور اس کی تاج پوشی بھی عمل میں آچکی تھی، یقین ہے کہ انھی کا ہوگا۔ یہ کتبہ بعینہ ویسا ہی ہے جیسا شاہ بیگم کے مزار کا کتبہ۔ میرا ذاتی رجحان اس طرف ہے کہ حوض جہانگیری کے ۱۰۱۹ھ کا کتبہ بھی انھی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کتبہ میں بھی وہی خط نستعلیق اور اسی طرح کے بیل بوٹے ہیں جس طرح شاہ بیگم کے مزار اور تخت شاہی کے کتبوں میں ہیں۔ جہانگیر نے ۱۰۲۴ھ/۱۶۱۵-۱۶۱۶ء کے سفر اجمیر کی یادگار میں جو عمارت اجمیر کے نزدیک چمن نور کے مقام پر بنوائی تھی اس کے دیدہ زیب اور دلکش کتبے پر کاتب کا نام عبداللہ کندہ ہے لیکن اس نام کے ساتھ کوئی نسبت درج نہیں ہے اس لیے یہ کہنا دشوار ہے کہ یہ کتبہ میر عبداللہ مشکیں قلم کا تحریر کردہ ہے۔ تاہم میرا رجحان یہی ہے کیونکہ غالب گمان یہی ہے کہ اس کتبہ کو جہانگیر نے اپنے مقرب خطاط سے لکھوایا ہوگا لیکن اس بات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی نسبت کیوں نہیں لکھی حالانکہ اس پتھر پر لکھنے کے لیے خاصی جگہ موجود تھی۔

۱۰۳۵ھ/۱۶۲۵-۱۶۲۶ء میں مشکیں قلم کا انتقال ہوا۔ برٹش میوزیم لندن کے فارسی مخطوطات کے فہرست نگار ڈاکٹر ریو اور ان کی تقلید میں مہدی بیانی نے ان کا سال وفات ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۵-۱۶۱۶ء تحریر کیا ہے جو بلاشبہ غلط[1] ہے۔ ان کے لوح مزار کے کتبہ میں دو مادۂ تاریخ درج ہیں جو آگے نقل کیے جائیں گے۔ ان سے ۱۰۳۵ھ برآمد ہوتا ہے نہ کہ ۱۰۲۵ھ۔

مشکیں قلم کو چاہے منفرد خطاط نہ کہا جائے لیکن وہ ان معدودے چند

---

[1] مرآۃ العالم ج ۲ ص ۴۸۳ میں بھی تاریخ وفات ۱۰۲۵ھ ہی ہے۔ (نذیر احمد)

خطاطوں میں ضرور تھے جن کی آخری آرام گاہ کو نہ امتداد زمانہ محو کر سکا ہے اور نہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی ہی اس پر کوئی تصرف کر سکی ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ ان کی شہرت صرف ایک خطاط کی حیثیت سے نہیں تھی بلکہ وہ عوام میں ایک صوفی وعارف کی حیثیت سے زیادہ مقبول تھے۔ چنانچہ لوگ جس طرح انکی زندگی میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے کو سعادت سمجھتے تھے اسی طرح انکے انتقال کے بعد بھی انکے مرقد پر حاضری دینے کو سعادت جانتے ہوں۔ آگرہ میں انکا مزار "درگاہ ستارۂ ہند" کے نام سے موسوم ہے جسکی لوگ آج بھی زیارت کرتے ہیں۔

آگرہ کے قندھاری بازار کے نزدیک "نگلا جواہر" نام کی جو بستی ہے اسی میں ان کا مقبرہ ایک وسیع احاطہ میں واقع ہے۔ اس بستی کو شہر آگرہ کے سروے آف انڈیا کے نقشے میں جواہر نگر کے نام سے موسوم کیا گیا ہے یہ جگہ تلسی سنیما ہال کے کچھ مغرب میں سکندرہ۔ جمنا بائی پاس پر واقع ہے۔ مذکورہ احاطہ میں بہت سی قبریں ہیں جو اس بات کی علامت ہیں کہ کچھ ہی عرصہ قبل یہ جگہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھی۔ بقول شیخ فرید، میر عبداللہ اس بستی میں جو شاہجہاں کے زمانے میں منگو باغ کے نام سے موسوم تھی وزیر خاں کی حویلی کے قریب بودوباش رکھتے تھے۔ کیا ان کا مدفن انکے مسکن میں ہی ہے؟ صوفیہ اور عارفین اکثر و بیشتر ایسی جگہ پر مدفون ہیں جہاں وہ زندگی میں قیام کرتے یا نمازیں پڑھتے۔ کیا مشکیں قلم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا؟

نسبتاً کم طویل و عریض اور سادہ انداز کے مقبروں کے برعکس یہ مقبرہ اس زمانے کے طرز تعمیر کے مطابق مربع نما ہے وہ خوبصورت کتبے جن میں میر

عبداللہ کی تاریخ وفات اور تاریخ مقبرہ کندہ ہیں خوبصورت نستعلیق خط میں ہیں یہ کتبے چھت سے ملی ہوئی اندرونی دیوار کے افقی محراب پر چاروں طرف کندہ ہیں کتبے کے اشعار کچھ زیادہ اچھے نہیں مگر خط ماہرانہ انداز کا ہے کتبہ کے اشعار میر عبداللہ کے بڑے صاحبزادے میر محمد صالح کشفی کی تراوش قلم کا نتیجہ ہیں اور انہی کے ماہرانہ ہاتھوں نے پتھر پر ان کو کندہ بھی کیا ہے۔ اس کتبہ میں میر عبداللہ کو قطب زماں قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کو چشتیہ صوفیہ میں ذی مرتبہ اور بلند و بالا درجہ کا حامل قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی تحریر ہے کہ ان کو تمام علوم میں ماہرانہ دسترس تھی اور ان کے مزار سے کوئی بھی شخص نامراد واپس نہیں جاتا۔ مقبرہ کے مغربی پہلو سے متصل جو مسجد ہے وہ نسبتاً بڑی ہے۔ مسجد میں ایک بڑا مسقف ہال ہے جس کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اس مسجد کا طرز تعمیر مقبرہ ہی جیسا ہے۔

مذکورہ کتبہ میں تین قطعات ہیں۔ دو قطعات شرح حال سے متعلق ہیں اور تیسرے میں تعمیر مقبرہ کی تاریخ ہے کتبوں کا انداز ۔ ادہ ہے مگر خط انتہائی خوبصورت نستعلیق ہے۔ حروف کا رنگ روغنی ہے ا نیپے کاغذ پر اس کا عکس اچھا نہیں آسکا اسکے باوجود ان سے کشفی کی ماہرانہ ہنرمندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شمالی دیوار کے مشرقی سرے کے آخر سے یہ کتبے شروع ہوتے ہیں، کتبوں کے اشعار یوں ہیں :

نیم غمگین ازین معنی کہ میرم	ازین دار فنا سوی جنان رفت
بحمد اللہ کہ عرفان کرد حاصل	نہ پنداری زگیتی رائگان رفت
چو تاریخ وفاتش جستم از دل	ازین ماتم فغان بر آسمان رفت
دلم گفتہ بصد درد و بصد آہ	ز دنیای دنی قطب زمان رفت

تاریخ دوم

شیخ زمانہ مظہر انوار جاوداں | کز خواجگانِ چشت نگینی نشانہ بود
دریای جود و کان صفا قطب وقت میر | عبداللہ آنکہ در ہمہ فن یگانہ بود
کشفی سوال کرد ز تاریخ رحلتش | ہم خود جواب داد کہ شیخ زمانہ بود

تاریخ روضہ

کشفیا سر بہ این جناب بنہ | کہ ازین باب کس نہ شد نومید
گرد این روضہ روز و شب گردان | چرخ با انجم و مہ و خورشید
سال اتمام این مکان شریف | ہاتفی گفت روضۂ جاوید

لراقمہ محمد صالح الحسینی

مفتاح التواریخ اور اورینٹل ببلیوگرافیکل ڈکشنری کے مولف تھامس ولیم بیل نے ان کتبوں کا چربہ ہنری بلاخ مان کو عنایت کیا تھا اور انھوں نے ان کتبوں کو پہلی بار ایشیاٹک سوسائٹی کی ۱۸۷۰ء کی روئداد میں شایع کیا۔ مولوی سعید احمد مارہروی کی اردو کتاب بستانِ اخیار یا تذکرۂ مشاہیر اکبرآباد (۱۳۳۱ھ) میں بھی یہ کتبے شایع ہوئے ہیں۔ دونوں ہی حضرات سے ان کتبوں کے پڑھنے میں کچھ تسامح ہوا ہے ایک غلطی تو یہی ہے کہ بلاخ مان نے متن میں سے شاعر اور خطاط کا نام خارج کر دیا ہے۔ مولوی سعید احمد مارہروی نے محمد صالح حسینی کو محمد صالح چشتی پڑھا ہے اسکے علاوہ لراقمہ کا 'ل' چھوڑ گئے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اوپر درج اشعار بھی اسی شاعر کے ہیں۔

یہ بات عام طور سے کہی جاتی ہے کہ میر عبداللہ کو مشکیں قلم کا خطاب جہانگیر سے ملا تھا یہ اس زمانے کی بات ہے جب وہ صرف شاہزادہ سلیم تھا اور اکبر سے باغی ہو کر تقریباً ۱۶۰۲ء میں اس نے اپنا دربار الہ آباد میں شروع کر دیا تھا لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ۱۰۰۴ھ/۱۵۹۵-۹۶ء کی میر عبداللہ کی ایک تحریر ہمارے سامنے ہے جس میں انھوں نے اپنا پورا دستخط اسی خطاب کے ساتھ کیا ہے یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو جہانگیر نے اکبر سے بغاوت کی تھی۔ اور نہ اپنا آزادانہ دربار الہ آباد میں منعقد کرنا شروع کیا تھا۔

اردو کی ایک قدیم مثنوی

"احوالِ قادر ولی" عرف شاہ میران کا تحقیقی جائزہ

از ڈاکٹر حامد اللہ ندوی، بمبئی

(۳)

اس سے پہلے ہم نے قادر ولی کی زندگی کے بعض پوشیدہ اور اہم گوشوں کو نمایاں کرنے کی غرض سے صرف مذکورہ مثنوی کے مواد سے بحث کی ہے اس کی ادبی، لسانی یا کسی اور خصوصیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی مگر جیسا کہ غالب نے کہا ہے :

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کسی مثنوی سے بحث کرتے وقت جب تک ہم اس کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر نہیں کرتے بات پوری نہیں ہوتی، اسی لیے ہم یہاں اس مثنوی کی بعض فنی، ادبی، لسانی اور سماجی خصوصیات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالے دیتے ہیں تاکہ مثنوی کے یہ پہلو بھی واضح ہو جائیں اور بات بھی ادھوری نہ رہے۔

فنی پہلو : مثنوی کی متعدد بحریں ہیں، لیکن ایک شاعر جب اپنی مثنوی کے لیے کوئی خاص بحر چن لیتا ہے تو آخر وقت تک اسی پر قائم رہتا ہے، بہت کم کوئی تبدیلی کرتا ہے، اس مثنوی میں شاعر نے تھوڑی سی جدت برتی ہے

اور اپنی مثنوی کے لیے ایک کی بجائے دو بحریں چنی ہیں ایک سرخیوں کے لیے اور دوسری اصل مضمون کے لیے زیادہ تر سرخیاں منظوم ہیں اور وہ دو اشعار پر مشتمل ہیں، وزن ہے فعولن فعولن فعولن فعل۔

دعائیہ مضمون کی سرخی: ذرا ساقیا سن میری التجا ۔۔۔ مجھے میرے مطلب کی دارو پلا
دعا مانگتا ہوں میں ہو مستقیم ۔۔۔ کہ ہے ذات تیری رحیم و کریم

نعتیہ مضمون کی سرخی: شراباً طہورا پلا ساقیا ۔۔۔ کہ لکھتا ہوں نعت رسول خدا
وہ لاریب سلطان لولاک ہے ۔۔۔ چراغ زمیں شمع افلاک ہے

ذکر معراج کی سرخی: ارے ساقی وقتِ کرم آج ہے ۔۔۔ کہ دل مائلِ ذکرِ معراج ہے
میری فکر عالی طفیل رسول ۔۔۔ ہے مشغول سیر عروج و نزول

اس طرح یہ سلسلہ مثنوی کے اختتام تک جاری رہتا ہے اور ایک دوسرے سے مربوط بھی، وہ اس طرح کہ اگر ان ساری سرخیوں کو ترتیب وار یکجا کر دیا جائے تو اصل مثنوی کا پورا مضمون مختصراً اس میں آجاتا ہے، یہ سارے اشعار سرخ روشنائی میں لکھے ہیں:

اس کے برعکس اصل مضمون کے اشعار کا وزن ہے، مفاعیلن مفاعیلن فعولن؛ چند شعر ملاحظہ ہوں:

ہے لائق حمد کے وہ قادر حق ۔۔۔ فلک کو جو کیا بر پا معلق
عجب کچھ اسکی قدرت ہے کہ یکسر ۔۔۔ زمیں پانی پہ پانی ہے زمیں پر
نکالا سنگ کے سینے سے جوہر ۔۔۔ شکم سے ابر کے برسایا گوہر
کیا روشن بدن میں جان کا شمع ۔۔۔ نین میں نور بینائی کیا جمع

سماعت کے لیے ہے گوش بخشا سخن فہمی کی خاطر ہوش بخشا
وہی رزّاق عالم ہر کہیں ہے اسی کا نام رب العالمین ہے

مثنویوں میں حالات و واقعات بیان کرتے وقت، موقع محل کی مناسبت سے قطعات یا غزلوں کا استعمال ایک عام بات ہے، اس مثنوی میں قطعات تو نہیں البتہ دو غزلیں ہیں اور دونوں قادر ولی کی شان میں ہیں، ایک میں شاعر نے انھیں قادر ولی کے نام سے اور دوسری میں شاہ میراں کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قادر ولی کے علاوہ شاہ میراں کے نام سے بھی مشہور تھے تینجور گزیٹیر (Tanjore Gazetteer 1906) کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، لکھا ہے "ناگور، مدراس پریسیڈنسی (Presidency) اور اس کے باہر خاص طور پر ایک مسلمان ولی میراں صاحب کی درگاہ کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے، کہتے ہیں کہ وہ چار سو سال پہلے زندہ تھے اور ان کی درگاہ کو تینجور کے راجاؤں کی سرپرستی حاصل ہے اور یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اس کے مینار بھی انہی راجاؤں کے بنائے ہوئے ہیں، اس ولی کے متعلق کئی عجیب غریب واقعات مشہور ہیں، ان کا عرس ہر سال موسم خزاں میں ہوتا ہے، پریسیڈنسی کے مختلف حصوں سے اور پریسیڈنسی کے باہر سے ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ وہاں کھنچ کر چلے آتے ہیں جنھوں نے کوئی نہ کوئی منت مان رکھی تھی، ہندو (یہانتک کہ برہمن بھی) ان کی درگاہ پر نذر چڑھانے کے لیے آتے ہیں، یہ عرس عام طور پر بارہ دن جاری رہتا ہے اور اس کی زیادہ تر رسوم رات میں ادا کی جاتی ہیں"۔

ان دو غزلوں کے مطلع اور مقطع اس طرح ہیں :

(۱) یقیں تھا قطب عالم شاہ قادر — عجب تھی ذات حق آگاہ قادر

لکھے کیا وصف اس عالی نامی کا — ہے رشک آسمان درگاہ قادر

(۲) نواسا مصطفیٰ کا شاہ میراں — ہے پوتا مرتضیٰ کا شاہ میراں

غرض نامی سے کب ہو انکی تعریف — مقرب ہے خدا کا شاہ میراں

ادبی پہلو : اردو میں مثنویاں ایک دو نہیں ہزاروں لکھی گئی ہیں، مگر ہمارے تنقید نگاروں نے صرف دو تین ہی کو قابل اعتنا سمجھا اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے حالانکہ ہر مثنوی کا اس کا اپنا ایک حسن ہے، ایک خوبی ہے، ایک معیار ہے جو دوسری مثنویوں کے حسن و خوبی اور معیار سے الگ بالکل الگ ہوتا ہے، زیر بحث مثنوی گو اردو کے معروف مرکزوں سے دور بیٹھ کر لکھی گئی ہے مگر اس میں بھی مواد اور ہیئت کے اعتبار سے وہ ساری ادبی خوبیاں موجود ہیں جو ایک اچھی مثنوی میں ہونی چاہئیں، صاف ستھری، رواں دواں، تازگی اور توانائی سے معمور ایک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی طرح - یہاں اس کی ہر خوبی کی تعریف کرنا ممکن نہیں، شاعر کا بیان کیا ہوا صرف ایک نئی نویلی دلھن کا سراپا یہاں پیش کیا جاتا ہے، دیکھئے ادبی نقطۂ نظر سے آپ کو کیسا لگتا ہے :

ذرا مشاطہ جو منہ کھول دیکھی — عجب گوہر دھرا انمول دیکھی

رخ اس کا تھا گل باغ جوانی — بہار بوستان زندگانی

مصفا رخ پر اسکے آب اور تاب — ہو جیسا آئینہ میں عکس مہتاب

اگر درپن کو وہ ٹک منہ دکھاوے — پری شیشے کے اندر منہ چھپاوے

عجب تھا خوش نما دو چشم و ابرو
بعینہ آہوا در دو شاخ آہو

وہ ترک چشم کیونکر ہوں نہ سرکش
کمان ابرو سے ہے مژگاں سے ترکش

ذرا چمکے جو وہ صبح بناگوش
چراغ مہر کو کر دیوے خاموش

وہ لانبی چوٹی سی چوٹی کہاں تھی
سواد اعظم ہندوستاں تھی

دہن وہ آب حیواں کا صدف تھا
کہ دنداں سے سدا گوہر بہ کف تھا

کہاں اس لب سا تھا یاقوت رخشاں
خجل جس سے تھا نت لعل بدخشاں

تھی جیسی وہ صراحی دار گردن
ہو کب مینا کی ووں ہموار گردن

اگر دیکھے ذرہ وہ قد و قامت
یقول الخلق قد قامت قیامت

اگر ناز خرام اپنا بتاوے
تو ہنس اپنی ہنسی کو بھول جاوے

شکم خوش رنگ جیسے خرمن گل
تھی ناف اس میں برنگ چشم بلبل

سراسر مو سے نازک تر میاں ہے
نہیں کچھ جز نزاکت درمیاں ہے

جو دیکھیں ساق سیمیں کی لطافت
تو ہووے شمع کافوری کو حسرت

غرض مشاطہ عاروس کو سنواری
اور اپنے دل سے لے اسپند واری

لسانی پہلو: مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف صرف ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں بلکہ متعدد زبانوں کا عالم بھی ہے، وہ اپنے اشعار میں عربی، فارسی اور ہندی الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے کرتا ہے اور بعض اوقات جملے کے جملے اس روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے اشعار میں برتتے ہیں کہ نفس مضمون کی تاثیر دوبالا ہوگئی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عربی: بشر سے تا ملک گلبانگ تھا یہ
کہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہ

لگے کہنے کو ہر یک ہوکے غمگین — اغثنی یا غیاث المستغیثین
سمجھ اللہ کو بے مثل و یکا — فلا تجعل مع اللہ الٰہا
اسی دم غیب سے فی الفور اس جا — صدا آئی کہ انت القطب حقا
اگر دیکھے ذرا وہ قد و قامت — یقول الخلق قد قامت قیامت
نہیں اب آرزو دنیائے دوں کی — ہے لو انا الیہ راجعون کی
فارسی: کہا حضرت نے تب رزاق خدا ہے — نہ ہوؤ گھا برے تم سب بھلا ہے
بہر کاری کہ ہمت بستہ گردد — اگر خاری بود گلدستہ گردد
چمن رنگیں ہو رنگ ارغواں سے — ثنا کرتا تھا سوسن کئی زباں سے
چوں دیدہ آں گل باغ صفا را — گلستاں گفت منت مر خدا را
بڑا مردود دیو مشرک ہے واللہ — کیا ہے ناؤں سے بہتوں کو گمراہ
اگر ابلیس بر روی زمین است — ہمین است و ہمین است و ہمین است
ہندی: وہ ندی چوڑی اور گہری بڑی تھی — میان راہ دریا سے اڑی تھی
تھا گویا تر بدا یک اس کا نالا — وہ تھی گنگا کی ماں جمنا کی خالا
کیے بیر اگیاں جوشہ کا درشن — گئے ہیں بھول اپنا رام لچھمن
وہیں ڈنڈوت کرکے سر جھکائے — ادب سے آگے اس سرور کے آئے
عنایت سے مجھے بخشو مراراج — دیا فرماؤ مجھ پر تم اسے مہراج
پران اپنا کروں میں تم پہ قربان — دھنی کا میرے اب کر دیجے جی دان

سیاسی پہلو: نادر ولی نے ہندوستانی تاریخ کے جس دور میں جنم لیا وہ بڑا ہی پر آشوب دور تھا، مغلوں کی طاقت روبہ زوال تھی، ہر طرف مرا سٹے سر

اٹھا رہے تھے، سکھوں نے الگ اپنا علم بغاوت بلند کر رکھا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی ممالک کے لوگ تجارت کے نام پر ہندوستان میں اپنی سازشوں کا جال پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، ہر طرف بے کسی اور بے بسی کا ایک عجیب عالم تھا، نہ تخت نشین یہ جانتے تھے کہ کب ان کا تخت ان سے چھن جائے گا نہ فرش نشینوں کو یہ معلوم تھا کہ کب ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی، سب نفسا نفسی کے عالم میں مبتلا تھے، ظاہر ہے کہ اس بحرانی دور کے اثرات سے قادر ولی بھی بچ نہ سکتے تھے، چنانچہ اس مثنوی میں جگہ جگہ ان اثرات کی جھلکیاں ملتی ہیں، چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

مراٹھا: اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ قادر ولی کو اپنی زندگی کے لمبے سفر میں جن مقامات سے گزرنا پڑا تھا ان میں دو مقام گوالیار اور تنجاور تھے اور یہ دونوں ہی ریاستیں اس عہد میں مراٹھوں کے زیر اقتدار ہیں۔ گوالیار ایک قدیم ہندو ریاست ہے جو آج مدھیہ پردیش کا حصہ بن گئی ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سلطان شمس الدین التمش نے سب سے پہلے اس کو فتح کیا، پھر کچھ دنوں یہ راجپوتوں کے زیر اثر رہی، آخر ۱۷۵۱ء میں مراٹھوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور پھر ۱۷۷۱ء کے بعد یہ علاقہ سندھیا خاندان کا ایک مستقل ہیڈ کوارٹر بن گیا۔

قادر ولی اور شاہ محمد غوث گوالیاری کی ملاقات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مثنوی نگار نے اس مثنوی میں واضح کیا ہے کہ شاہ محمد غوث گوالیاری پہلے دہلی کے قرب وجوار میں رہتے تھے، ان کا گھر وہیں ایک رجواڑہ کے اندر تھا اور وہ اپنے مریدوں کے ساتھ ہنسی خوشی وہاں زندگی گذارتے تھے، لیکن بدقسمتی سے راجا کی لڑکی ان کے کسی مرید پر عاشق ہوگئی اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملنے لگے،

راجا کو پتہ چلا تو اس نے نہ صرف یہ کہ ان سارے لوگوں کو اپنے رجواڑے سے باہر نکل جانے کا حکم دیدیا بلکہ جب وہ نکلنے لگے تو انکے پیچھے فوج بھی لگا دی، یہ فوج مراٹھوں کی تھی، لکھا ہے:

یکایک مرہٹے کی دھونس آئی بلا کی دھوم اور آفت مچائی
جناب خواجہ دل میں ہو مکدر چلے واں سے مریداں ساتھ لیکر
چلے جنگل کو جب سب ہو مسافر لگایا فوج ان کے پیچھے کافر
ہزاروں مرہٹے کے آکے اسوار لیے اس قافلہ کو گھیر یکبار
ستم کرنے لگے حد سے زیادہ کیے خواجہ کی بیٹیوں کا ارادہ
کہا خواجہ نے کر حق پر توکل کہا غصے سے یا مرتیغ اقتل
پڑے صحرا میں یکدم سر کٹے سب وہاں سے مرہٹے تب مرہٹے سب
وہاں سے کافروں پر فتح پاکر گوالیار کی رہا بستی میں جاکر

گوالیار کی طرح تنجاور بھی ایک قدیم ہندو ریاست ہے جو آج تامل ناڈو کا ایک حصہ بن گئی ہے، جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ شیواجی نے اپنی زندگی ہی میں مغربی اور جنوبی ہند کے متعدد علاقے فتح کرکے وہاں مراٹھا حکومت کا جھنڈا لہرا دیا تھا، اس حکومت کا ایک سرا پونا میں تھا تو دوسرا تنجاور میں، تنجاور میں شیواجی کے سوتیلے بھائی یکوجی کی حکومت تھی جو یکوجی کی موت کے بعد اسکی اولاد میں جاری رہی۔

تنجاور کے سلسلہ میں مثنوی نگار نے صرف ایک ہندو راجہ کا ذکر کیا ہے مراٹھا راجا یا مراٹھوں کا نہیں، مگر چونکہ قادر ولی کا زمانہ مراٹھوں کے عروج کا زمانہ تھا

اس لیے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تنجاور کے جس ہندو راجا نے قادر ولی کو ناگور میں بسنے اور اپنا مشن جاری رکھنے کی اجازت دی وہ یقیناً مراٹھا راجا ہی ہوگا۔ بقول مثنوی نگار:

کسا را جا زمیں سب اپنی بوجو جہاں ہووے پسند لب واں رہو

سکھ: مثنوی میں سکھوں کا ذکر زیادہ نہیں ہے، صرف ایک جگہ ہے اور وہ بھی مانکپور کے سلسلے میں قادر ولی کی کرامت کے طور پر اور اس زمانہ کی مناسبت سے جب قادر ولی ابھی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے، مگر یہ ایک حوالہ بھی یہ اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ سکھوں اور جاٹوں نے اس زمانہ میں شمالی ہند میں کس قدر لوٹ مار مچا رکھی تھی، لکھا ہے:

مہینے نو ہوئے اس حمل کے جب تبا یا خرق عادت یک عجب تب
کہ مانکپور میں آ کر سکھ اور جاٹ لگے ہیں لوٹنے کو شہر اور باٹ
بقوم ہندو سے مشہور تھے وہ بڑے ظالم بہت مغرور تھے وہ
مچائے ہر طرف ظلم اور شرارت کیے بھوتوں کا مال اسباب غارت
تب اس بی بی نے دیکھ اس شور و شر کو کئی ہے بند اپنے گھر کے در کو
اسی حیرت میں تھی غلطاں کہ اس آن ہوا ایک غازی دیں واں نمایاں
نکل گھر سے گیا باہر شتابی کہے دشمن کی تا خانہ خرابی
کیا حملہ جو یک دم شیر شرزہ پڑا ہے کافروں کے تن میں لرزہ

فرنگی: مثنوی میں قادر ولی کی کرامات کے سلسلے میں ایک جگہ فرنگیوں کا بھی ذکر ہے، لکھا ہے، ولایت سے ایک جہاز ہندوستان آ رہا تھا، جب وہ

ناگ پٹن کے قریب پہنچا تو اس کے پیندے میں سوراخ ہو گیا اور پانی بھر جانے کی وجہ سے وہ ڈوبنے لگا، جہاز کے سب لوگ گھبرائے، اس میں ایک مسلمان خلاصی بھی تھا، اس نے جہاز کے مالک سے کہا، اگر تم اپنے دل میں قادر ولی کی نیت کر لو تو تمہارا جہاز بچ سکتا ہے، اس نے ایسا ہی کیا اور جہاز صحیح سلامت کنارے سے آن لگا۔

پتہ نہیں یہاں مثنوی نگار کی 'فرنگی' سے یورپ کی کون سی قوم مراد ہے کیونکہ اس زمانہ میں یہاں تجارت کے نام پر ڈچ، پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی سرگرم عمل تھے، اور ہندوستانی ہر یورپین کو فرنگی ہی سمجھتے ہیں، یہ قرین قیاس یہ ہے کہ فرنگی سے یہاں مراد یقیناً فرانسیسی ہی ہوں گے کیونکہ ناگ پٹن جہاں اس کرامت کے ظاہر ہونے کا ذکر ہے پانڈیچیری سے قریب ہے اور یہ علاقہ آزادی سے پہلے ہندوستان کے فرانسیسی مقبوضات میں شمار ہوتا تھا، واقعہ دلچسپ ہے اس کے کچھ شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

ولایت سے جہاز آیا تھا یک بار　　ہوا پیندے سے آب اس کے نمودار
بہت وہ ناؤ والے دل میں گھبرائے　　نہایت ڈوبنے کا خوف و غم کھائے
تھا اس میں یک خلاصی جو مسلماں　　کہا اس ناؤ کے مالک سے اُس آن
کہ اب قادر ولی کی کر تو نیت　　کریں گے دور اس آفت کو حضرت
پکارا اس نے تب قادر کو رو کر　　رہا کشتی کا پانی بند ہو کر
کیا بارے کرم فضل مہیمن　　وہ کشتی آکے پہنچی ناگ پٹن
سنے ہیں جب نصاریٰ یہ کرامت　　نہایت ہو گئی ہے ان کو حیرت

فرنگی مل کے سب اور نذر دے کر
ہووے حاضر ادب سے پیش سرور

حضور شہ جو آئے ڈر کے مارے
ادب کے داب سے ٹوپی اتارے

پھر اس دن سے فرنگی ہو کے قائل
دل و جاں سے ہوئے حضرت کے مائل

کٹا کے ایک جا جھاڑی و جنگلا
بنائے یک کنواں اور ایک بنگلا

ہے اب تک وہ وہاں پائیں ورگاہ
وہی بنگلا ہے قائم اور وہی چاہ

قادر ولی کی ایک اور کرامت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناگور کے قریب ملاخی نام ایک جزیرہ تھا شاید وہاں فرنگیوں کا سکہ چلتا تھا، ایک دن وہاں کا ایک نامور صراف ترمل سیٹھ جعلی سکے بنانے کے جرم میں پکڑا گیا، بات کونسل اور کورٹ کچہری تک پہنچی، آخر اس کو موت کی سزا سنادی گئی، سیٹھ اپنی موت کی سزا کا فیصلہ سن کر کانپ گیا اور منت مانی کہ اگر میں بچ گیا تو قادر ولی کی بارگاہ میں ایک جہاز بھر کر صندل اور تحصیل نذر دے جاؤں گا، اس کی یہ منت قبول ہوئی، قادر ولی فرنگیوں کے خواب میں آئے اور انھیں دھمکی دی کہ اگر تم نے اس سیٹھ کو ذرا بھی نقصان پہنچایا تو تمھیں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی، فرنگی گھبرائے، سیٹھ کی سزا کا محضر نامہ منگوا کر دیکھا، لکھا تھا، اس کو رہا کر دو، اس سلسلہ کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

ملاخی کا جزیرہ ہے جو معمور
تھا ترمل سیٹھ واں صراف مشہور

کئی ہُن جھوٹے سکے کے بنایا
تغلب سے اسے سر جا چلایا

پڑی اس بات کی ہر یک جگہ دھوم
ہوا اس شہر کے حاکم کو معلوم

اسے پکڑا منگا کر طوق و زنجیر
کیا ہے قید میں رکھ اسکو دلگیر

تمامی کورٹ اور کمیٹی کے جر جر
لکھے ہیں قتل پر پھر اس کے محضر

تب اس صراف نے دیکھ ایسی حالت کیا قادر ولی کی دل سے نیت
کہا گر میں بچوں گا اس بلا سے تو بھیجوں گا اسے نذر اس جگا سے
جہاز یک صندل و کتھیل سے بھر روانہ میں کروں گا جلد اودھر
فرنگیوں کے بھی سپنے میں جا کر نقیر اس طور سے بولا ڈرا کر
کہ یہ سیٹھ بھی نفر ہیگا ہمارا ستم اس کا نہیں ہرگز گوارا
نہ چھیڑو اس کو تم دیکھو خبردار کیا پاؤ گے گر دیویں گے آزار
اٹھا ہر یک فرنگی نیند سے ڈر منگا کر قتل کا دیکھے ہیں محضر
لکھا تھا یہ کہ اس کو چھوڑ دینا خطا کا اس کے کچھ بدلہ نہ لینا
سحر اس حال سے ہو کر خبردار ہوئے حیراں فرنگی واں کے یکبار
خطا صراف کی کر عفو چھوڑے دغابازی کے تھاں سارے توڑے

سماجی پہلو: مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں راجاؤں مہاراجوں کا راج تھا، اور ان کی پرجا ہندو کہلاتی تھی۔ ہندو کون ہیں، ان کا دین و مذہب کیا ہے، خدا اور بھگوان کا ان کے یہاں کیا تصور ہے، یہ بات آج تک دودھ اور پانی کی طرح الگ نہ ہو سکی البتہ جب ہم یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا انکے عقائد و اعمال کے اعتبار سے مقابلہ کرتے ہیں تو اتنی بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مسلمان وحدت کے قائل ہیں اور انکے دین کا سارا دارومدار ایک خدا، ایک رسولؐ اور ان دونوں کے احکام پر ہے جب کہ ہندو کثرت میں یقین رکھتے ہیں اور سمتیں مقرر نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سماجی زندگی "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا" کی تصویر بن گئی ہے۔

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کو اپنے سفر کے دوران میں یا جگہ جگہ قیام کے موقع پر یہاں کی جس سماجی زندگی کا سامنا کرنا پڑا وہ بڑی پیچیدہ اور اکثر حالات میں ناقابل فہم تھی۔ کہیں جنگلوں اور پہاڑوں میں جوگی اپنی اپنی تپسیا میں مصروف تھے، کہیں ایسے مہا دیو براجمان تھے کہ جن کے ایک اشارہ پر ان کا دیو تالاب کا تالاب پی ڈالتا تھا، کہیں یہ رواج تھا کہ ہر سال گاؤں کی ایک نہایت ہی حسین اور جوان لڑکی سنوار سنگار کر گاؤں کے مندر پر قربان کر دی جاتی تھی، کہیں یہ حال تھا کہ جب گاؤں کی ندی میں باڑھ آتی تو راتوں میں بھوت اپنے سروں پر جنگلی پھولوں سے سجے ہوئے گھڑے لے کر ایسا ڈراونا ناچ ناچتے کہ سارا گاؤں سہم جاتا تھا، کہیں ایسے سادھوؤں کا راج تھا جو اپنے جادو منتر سے لوگوں کو خوفزدہ کرتے اور ان کا مال اڑا لیجاتے تھے، غرض اس مثنوی میں ایسے بیسیوں ناقابل یقین واقعات کا ذکر ہے جن کی تفصیل میں جانا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

دینی پہلو: غیر مسلم طبقوں میں عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور جہاد سے مراد قتل و غارت گری ہے، اس کی موافقت یا مخالفت میں دلائل پیش کرنا اس وقت ہمارا مقصد نہیں، ہاں اتنی بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کم از کم ہندوستان کی حد تک یہ بات درست نہیں کیونکہ یہاں جن مسلم حکمرانوں نے حکومت کی وہ یا تو ترک تھے یا مغل، جہاں تک ترک سلاطین کا تعلق ہے انھیں ذاتی طور پر اسلام سے جو بھی محبت یا دلچسپی رہی ہو، انھوں نے اس دلچسپی کو اپنی رعایا پر کبھی تھوپنے کی کوشش نہیں کی، یہی کچھ حال تقریباً مغلوں کا بھی تھا، ان کی دلچسپیاں بھی اسلام کے ساتھ صرف اپنے انفرادی عمل تک محدود رہیں

اسلام کو یہاں عام کرنا کبھی ان کا مقصد نہیں تھا، اورنگزیب کو اس معاملہ میں ضرور بدنام کیا جاتا ہے، مگر سچ یہ ہے کہ یہ شوشہ انگریزوں کا چھوڑا ہوا ہے جس پر ہم بھی سمجھکر ایمان لے آئے ہیں، ہندوستان میں تقریباً ساڑھے چھ سو سال مسلمانوں نے حکومت کی ہے اگر اسلام واقعی تلوار کے زور سے پھیلا ہوتا تو یہ مدت یہاں کی ساری رعایا کو مسلمان بنانے کیلئے کافی سے زیادہ تھی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسقدر طویل عرصہ تک حکومت کرکے بھی آج مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں اور مظلوم بھی۔

ہندوستان میں اسلام کو پھیلانے کا سہرا اگر واقعی کسی کے سر ہے تو وہ ہمارے اولیائے کرام ہیں، انکی زندگی کا واحد مقصد دین اسلام کی تبلیغ تھا اور اس مقصد کے حصول کیلیے انھوں نے اپنی زندگیاں تج دیں، دور دراز مقامات کا سفر کیا، بھوکے پیاسے رہے، زمین پر سوئے، کانٹوں پر چلے، ہر قسم کی مخالفت کا سامنا کیا، غرض کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ جھیلی ہو، مگر ان ساری مصیبتوں کے باوجود انکے عزم و استقلال میں ذرا فرق نہ آیا وہ مسلسل اپنے ایمان عمل اور حسن اخلاق سے یہاں کے لوگوں کے دل جیتتے رہے اور انھیں اپنا ہمسفر بناتے رہے:

ہم اکیلے ہی چلے تھے جانب منزل مگر لوگ آتے ہی رہے اور کارواں بنتا گیا۔

مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قادر ولی کی زندگی کا مقصد بھی بس دین اسلام کی اشاعت تھا اسی مقصد کو لیکر وہ شمال سے جنوب میں آئے اور زندگی بھر اپنے اس مشن کو جاری رکھا، مثنوی نگار نے قادر ولی کے ان دینی کارناموں کو اپنی اس مثنوی میں بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اور انھیں انکی کرامات قرار دیا ہے، قادر ولی کی یہ کرامات کیا تھیں اور ان کرامات کا اثر کیا ہوا یہ سب مثنوی پڑھ کر ہی معلوم کیا جا سکتا ہے البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کل کے صوبہ مدراس اور آج کے ٹامل ناڈو میں اسلام کا جو کچھ بول بالا نظر آتا ہے وہ قادر ولی جیسے بزرگوں کی دین ہے کسی مسلم حکمران کی تلوار کی نہیں۔

علی گڑھ کا سفر اور یوم مولانا آزاد

از ضیاء الدین اصلاحی

لکھنؤ اور بنارس کے سفر سے ۵-۶ مارچ کی درمیانی شب میں اعظم گڑھ واپس آیا تو ڈاک میں پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ کا یہ مکتوب ملا کہ "۱۱ مارچ کو لکھنؤ کی مولانا آزاد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں یوم مولانا آزاد منایا جا رہا ہے جس کا صرف ایک دن کا پروگرام ہوگا اور ہر مقرر یا مقالہ نگار کو صرف پندرہ منٹ اپنے خیالات پیش کرنے کے لیے دیے جائیں گے ضابطہ کے دعوت نامہ میں دو ایک دن لگ جائیں گے اس لیے قلت وقت کے پیش نظر نجی طور پر اطلاع دے رہا ہوں"۔

۶ مارچ ہی کو ضابطہ کا دعوت نامہ آگیا جس میں بھی انصاری صاحب نے الگ سے شرکت کے لیے مزید زور دیا تھا۔ ان کے اصرار کے علاوہ علی گڈھ کا سفر میرے لیے اس لیے بھی پرکشش تھا کہ عرصے سے اپنے مخدوم و مکرم نواب مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی سے ملاقات کا موقع نہ نکال سکا تھا جو پچھلے دنوں علیل تھے علاوہ ازیں علی گڑھ کے بھیانک فسادات کے بعد ان کی مزاج پرسی بھی نہیں کر سکا تھا چنانچہ قدرے لیت و لعل کے بعد علی گڑھ جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

۱۰ مارچ کو جناب ابو محمد صاحب ایڈوکیٹ جون پور نے اپنے یہاں مدعو کر رکھا تھا اسلیے فجر بعد ہی مرزا محمد شاہد بیگ (شبلی کالج) اور اپنے بچے

محمد طارق کے ہمراہ ان کے یہاں کے لیے روانہ ہوا اور ان کے پر تکلف ظہرانہ میں شرکت کے بعد اسٹیشن گیا، محمد طارق کی مستعدی سے بر وقت ریزرویشن ہوگیا اور ۱۱ر مارچ کو صبح ۶ بجے علی گڑھ پہنچ گیا، ویٹنگ روم میں کچھ وقت گزارنے اور نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد حبیب منزل پہنچا تو وہاں سناٹا تھا، برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ نواب صدر یار جنگ کے دولت کدے ہی پر علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ وغیرہ بھی فروکش ہوتے تھے بے اختیار امرؤ القیس کے معلقہ کا یہ مصرعہ یاد آگیا ع قفا نبک من ذکری حبیب و منزل، انہی خیالات میں محو تھا کہ نواب مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی اوراد و وظائف سے فارغ ہوکر کمرے سے باہر تشریف لائے اور غیر متوقع طور پر مجھے دیکھ کر بہت مسرور ہوئے۔

ناشتہ کے بعد پروفیسر ریاض الرحمان شروانی کے ساتھ ۹½ بجے جلسہ گاہ پہنچا، باہر کے لوگوں میں میرے علاوہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جناب عبداللطیف اعظمی (دہلی) اور پروفیسر رضی الدین (اتروتی یونیورسٹی) بھی تشریف لائے تھے، جلسہ کا پروگرام عجلت میں بنا تھا جس کا اثر حاضرین کی تعداد پر پڑا مگر مقالے پر حاصل اور تقریریں پُر مغز تھیں۔ افتتاحی جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد نسیم فاروقی وائس چانسلر نے کی، مقالات اور تقریروں کے دونوں جلسے بالترتیب پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کی صدارت میں ہوئے۔ پروگرام کا خاتمہ پر تکلف عصرانہ پر ہوا جو مولانا آزاد کے "صدیق مکرم"

مولانا حبیب الرحمان شروانی مرحوم کی قیامگاہ پر تھا۔ پروفیسر محمد اقبال انصاری، پروفیسر عثمان ادہمی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی کوششوں سے پروگرام دلچسپ اور کامیاب رہا۔

۱۲ مارچ کو سب سے پہلے مولانا تقی امینی کی تعزیت کے لیے ان کے مکان گیا۔ پھر ۱۲ اور ۱۳ کا دن پروفیسر مختارالدین احمد، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر نذیر احمد، حکیم سید ظل الرحمان ندوی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی سے ملاقات اور گفتگو میں گزرا، نظامی صاحب اور حکیم صاحب نے اپنے اپنے کتب خانوں کے نوادر، مخطوطات اور اہم مطبوعات دکھائے۔ پروفیسر مختارالدین کا کتب خانہ اس سے پہلے دیکھ چکا تھا، پروفیسر نذیر احمد اور حکیم سید ظل الرحمان نے اپنی بعض تصانیف ہدیہ کیں،

پروفیسر آل احمد سرور نے وعدہ کیا کہ وہ اکتوبر میں مولانا شبلیؒ پر توسیعی لکچر دینے کے لیے اعظم گڈھ تشریف لائیں گے نواب صاحب اور ان کے صاحبزادے مولوی ریاض الرحمٰن شروانی کی عنایتوں سے تو زیر بار ہوں ہی۔ ڈاکٹر یسین مظہر، ڈاکٹر ظفرالاسلام (ادارۂ علوم اسلامیہ) ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (شعبہ عربی) اور مولوی مشتاق احمد تجاروی (ادارۂ تحقیق و تصنیف) کا بھی شکرگزار ہوں کہ اکثر ساتھ ساتھ رہے اور خلوص و محبت سے پیش آئے۔

۱۴ کو مولوی حاجی عین الحق اعظمی مالک نیو لائٹ ٹیزی کانپور کی عیادت کے لیے رکا اور ۱۵ کو اعظم گڈھ واپس آگیا۔ فللہ الحمد

اخبار علمیہ

اسلامک فاونڈیشن، بنگلہ دیش کا ایک فعال ادارہ ہے، اس نے عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کے تقریباً ۱۴۰۰ کتب و رسائل کو بنگالی زبان میں منتقل کرکے شایع کیا ہے، مساجد میں لائبریریوں کے قیام کی مفید تحریک بھی فاونڈیشن کی بدولت چل پڑی ہے، چنانچہ بنگلہ دیش کی دو لاکھ مساجد میں سے تقریباً پانچ ہزار مسجدوں میں دارالمطالعہ قائم ہوچکے ہیں، اب اس ادارہ نے بنگالی زبان میں ۲۴ جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان اسلامی انسائیکلوپیڈیا شایع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس کی آٹھ جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور دو عنقریب شایع ہونے والی ہیں، اس پورے منصوبہ کا ایک خلاصہ دو جلدوں میں پہلے ہی پیش کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ وسائنس، تاریخ ممالک و بلدان اور فقہ و قضا جیسے اہم موضوعات پر علماء و محققین کی ایک جماعت ریسرچ اور تحقیق میں مشغول ہے، مقالات پر نقد و بحث کے لیے دو اعلیٰ کمیٹیاں بھی ہیں، خوشی کی بات ہے کہ بنگلہ دیش کی حکومت اس مفید کام کی تکمیل میں فاؤنڈیشن کے ساتھ تعاون کررہی ہے۔

بنگلہ دیش کی یہ خبر بھی فرحت اثر ہے کہ وہاں کا اسلامی بینک ترقی، کامیابی اور سودمندی کی راہ پر گامزن ہے، یہ بینک ۱۹۸۳ء میں قائم ہوا تھا، اب پورے ملک میں اسکی ۷۵ شاخیں وجود میں آگئی ہیں جن میں ۱۸۰۰ افراد کام کررہے ہیں، ۱۹۸۹ء کے اختتام پر اسکی ایک مفصل روداد میں بتایا گیا ہے کہ اس کی بے باق رقم

۸۰ ملین ٹکا ہے، جبکہ ریزرو فنڈ میں ۴۶ ملین ٹکا موجود ہے، ۱۹۸۸ء میں بینک کا انوسٹمنٹ ۲،۰۷۳ ملین ٹکا تھا جو ۱۹۸۹ء میں ۲۲۹۹ ملین ٹکا ہوگیا یعنی اس میں ۱۱٪ اضافہ ہوا، ۱۹۸۹ء میں بینک کی ڈپازٹ رقم ۳۴۵۵ ملین ٹکا بتائی گئی ہے جو سال گذشتہ کے مقابلہ میں ۲۲٪ فیصد زیادہ ہے، اسی سال اس نے رقم جمع کرنے والوں میں تقریباً ۵۰۷ ملین ٹکا تقسیم کیے، بی ایل ایس سیونگ ڈپازٹ کی شرح آمدنی ۹٪ بتائی گئی ہے جبکہ رقم جمع کرنے والوں کو ۳۶ مہینوں کے متعین وقت میں جو منافع ہوا اس کی شرح ۱۲ء۵٪ ہے مجموعی لحاظ سے ۱۹۸۹ء میں بینک کو ۲۸۵ ملین ٹکا کا منافع حاصل ہوا جبکہ ۱۹۸۸ء میں یہ ۲۳۲ ملین تھا، یہ بینک ۱۱۷ صنعتی منصوبوں کو مالی امداد بھی فراہم کرتا ہے اور فارن ایکسچینج بزنس میں اس کی ۴۵۸ ملین ٹکا کی رقم لگی ہوئی ہے۔ دو ٹکا ایک ہندوستانی روپیہ کے مساوی ہے

اسلامی بینک کاری کی یہ مساعی پاکیزہ اور بابرکت بھی ہیں اور سودی بینک کاری کے زہر کا تریاق بھی ہیں، ایسا ہی ایک ادارہ اسلامک ڈیولپمنٹ بینک جدہ بھی ہے جس کا ایک شعبہ اسلامک ریسرچ اینڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ۱۹۸۱ء سے قائم ہے، اسلامی اقتصادیات، معاشیات، بینک کاری اور مالیات کے متعلق شریعت مطہرہ کی تعلیمات اور ہدایتوں کے مطابق تحقیق اس کا خاص مقصد ہے، چنانچہ وقتاً فوقتاً اس کی جانب سے مذکورہ موضوعات پر رسائل و کتابیں شایع ہوتے رہتے ہیں حال ہی میں اس کی جانب سے انگریزی زبان میں ایک رسالہ شایع ہوا ہے جو مسلم ممالک میں زمین کے حق ملکیت اور حق لگان پر ہے، ڈاکٹر ایم، اے جلید (JULA D) کے اس وقیع مقالہ کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے تاہم

چند سرخیاں یہاں درج کی جاتی ہیں، مسلم ممالک کی زمیندارانہ ساخت، زمین کی ملکیت، اسکے احکامات تقسیم و تفریق زمینداری کے نتائج کی مختلف شکلیں، انکی حد بندیاں، نئی سمت زمینداری اور حق زکان اصلاحات زمینداری، جدید زمیندارانہ اقتصادیات، اسلام پر مبنی اصلاحات کی قوت و حرکیت، مشترکہ نظام، عوام تک فیض رسانی، قرآن و سنت سے دستوری رہنمائی، اسلامی قانون وراثت، اجتماعی نظام کا تعین وغیرہ۔ انکے علاوہ بعض اہم فقہی اصطلاحات کی انگریزی تشریح اور افریقہ اور مغربی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں زمینداری اور وقف وغیرہ کے متعلق نہایت اہم اور جدید ترین چارٹ بھی دیے گیے ہیں۔

عراق وکویت کی جنگ ام المعارک، تباہیوں اور بربادیوں کی نئی داستانوں کو جنم دے کر ختم ہو گئی، اب ہلاکتوں اور نقصان کے تخمینوں اور نئے امکانات کے تجزیوں کی باتیں ہو رہی ہیں، عبرت کے در بھی وا ہیں لیکن صرف اولی الابصار کے لیئے پہلے بھی ان کالموں میں لکھا گیا تھا کہ مغربی طاقتیں محض فوج واسلحہ ہی نہیں، علمی میدانوں میں بھی ساری دنیا اور خصوصاً مشرق وسطیٰ کو اپنی محنت، جانفشانی اور تحقیق کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں، حال ہی میں کناڈا کے مسلم اخبار کریسنٹ انٹرنیشنل کے دو شمارے آئے تو نئی کتابوں کے کالم میں دیکھکر تعجب ہوا کہ مغرب کسقدر مستعدی اور تسلسل کے ساتھ مشرق وسطیٰ پر اپنی علمی توجہ مبذول کیے ہے ایک کتاب BEHINDTHEMYTH یاسر عرفات اور فلسطینی تحریک پر ہے ۳۵۶ صفحات کی اس کتاب میں اینڈریو گاور ٹونی واکر نے یاسر عرفات کے بچپن سے تحریک انتفاضہ تک کے حالات کا استقصا کیا ہے، امریکہ سے زیو شیف اور ایہود یاری نے انتفاضہ پر ایک مفصل کتاب شایع کی ہے فلسطینوں پر ایک اور کتاب SANCTUARY AND SURVI VAL THE PLO IN LEBANON شایع ہوئی ہے جسے میک گل یونیورسٹی کے شعبہ مطالعات مشرق اوسط کے چیرمین رکس برنینن نے مرتب کیا ہے، خلیجی ریاستوں پر لندن سے

ایک اور اہم کتاب STATE AND SOCIETY IN THE GULF شایع ہوئی ہے یہ خلدون حسن النقیب کی اس کتاب کا جدید اڈیشن ہے جسے ۱۹۸۸ء میں پہلی بار شایع ہونے کے کویت میں ممنوع قرار دیا گیا تھا، آکسفورڈ سے مصر اور اسکی خارجہ پالیسی پر تازہ کتاب نکلی ہے اور واشنگٹن یونیورسٹی کے پروفیسر ہڈیرو رامٹ کی ایک کتاب شام اور روس تعلقات کے متعلق شایع ہوئی ہے جس میں ۱۹۸۸ء سے ان دونوں کے تعلقات کے نشیب و فراز کا مطالعہ و تجزیہ ہے، کریسنٹ کے صرف دو شماروں میں درج ان کتابوں کے بارے میں اطلاعات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میدان جنگ کے علاوہ کارزار علم میں بھی مغرب کتنا متحرک اور توانا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں جہاں کتابیں بکثرت شایع ہوتی ہیں انکے قارئین کی تعداد بھی کم حیرت انگیز نہیں خلیجی جنگ کے دوران وہاں خلیج اور عرب سے متعلق کتابوں کی اشاعت و فروخت تیز تر ہوگئی، جن کتابوں نے فروخت کے نئے معیار قائم کیے ان میں ڈیزرٹ شیلڈ (برکلے پبلیکشنز) ریپبلک آف فیر (پنتھین بکس) صدام حسین اینڈ دی کرائسس ان دی گلف (ٹائمز بکس) اور دی ریپ آف کویت (وارنٹ برج پبلشنگ کمپنی نمایاں ہیں، مؤخرالذکر کتاب کی ۱۲ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں اور اب عالم ہے کہ نیویارک کے کتب فروشوں کے پاس اسکی ایک کاپی بھی نہیں، صدام حسین اینڈ دی کرائسس کے ۴ لاکھ سے زیادہ نسخے شایع ہوئے اور سب ختم ہوگئے اور اب اسکا نیا اڈیشن بھی شایع ہوگیا ہے، ڈیزرٹ شیلڈ کے ناشر کو امریکہ کے نائب صدر کا فون ملا کہ اسکی ایک کاپی انہیں فوراً بھیجی جائے۔

خاک و خون کی ان داستانوں میں یہ دلچسپ خبر بھی ہے کہ عین جنگ کے زمانہ میں سعودی عرب نے جرمنی کو ایک معاہدہ کے مطابق ایک لاکھ پچاس ہزار تازہ پھول برآمد کیے وادی تبوک کے گلشنوں کے یہ پھول ۴ ملین کی تعداد میں بھیجے جائیں گے، یہ لالہ صحرائی اپنی تازگی، خوشبو اور دیدہ زیبی کی وجہ سے اور ممالک پر سبقت لے گئے۔

معارف کی ڈاک

ضروری تصحیح

ناظمہ منزل علی گڑھ۔
یکم مارچ ۱۹۹۱ء

محترمی جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب السلام علیکم

ایک خط پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ معارف (فروری) کا شمارہ مل گیا تھا، ایک امر کی تصحیح ضروری ہے، براہ کرم مارچ کے شمارے میں کہیں پر شایع کر دیجئے۔ یہ ضروری ہے اسی لیے اسے رجسٹری سے بھیج رہا ہوں۔

معارف (فروری) میں قاضی سجاد حسین کی وفات پر ایک نوٹ شایع ہوا ہے اس میں مرحوم کی سات تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، اس سلسلے میں ان کی ایک کتاب اخلاق محسنی (مترجم) میرے کتب خانے میں نکل آئی جسے انھوں نے دہلی میں ۳۰ مئی ۷۶ء کو مجھے اپنی دوسری تصانیف کے ساتھ مرحمت فرمایا تھا، یہ ۳۰۳ صفحوں کی کتاب ہے فارسی کی ہر سطر کے نیچے اردو ترجمہ درج ہے، سال طبع درج نہیں لیکن قمر سنبھلوی کے قطعۂ تاریخ سے ۱۳۸۴ کے اعداد مستخرج ہوتے ہیں اور اس کتاب پر جو شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ کا پیش لفظ ہے وہ ۲۵ اگست ۶۴ء کا لکھا ہوا ہے۔ سال طباعت ۶۴ء سمجھنا چاہیے۔

دوسری کتاب پندنامہ (محشی) ہے، یہ پہلی کتاب سے کچھ پہلے چھپی ہوگی،

اس لیے کہ اخلاق محسنی کے آخر میں اس کا اشتہار درج ہے۔ دونوں کتابیں قاضی صاحب مرحوم ہی کے ادارے سب رنگ کتاب گھر، گلی قاسم جان دہلی سے شایع ہوئی ہیں۔ اس طرح قاضی سجاد حسین مرحوم کی تصانیف کی تعداد ۹ تک پہنچتی ہے۔

(۲) معارف ص ۱۵۳ ۔ ابراہیم بن محمد نام کے دو مصنف حلب میں گزرے ہیں، ایک محمد بن ابراہیم تو یہی سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں، دوسرے ابراہیم بن محمد، متاخر العہد ہیں اور ملتقی الابحر اور غنیۃ المستملی کے مصنف جو بحیثیت عالم و مصنف متقدم الذکر کے مقابلے میں شہرت نہیں رکھتے۔ انھوں نے استانبول میں ۹۵۶ھ میں وفات پائی۔ فتاویٰ التاتارخانیہ کی تلخیص الفوائد المنتخبہ انہی بزرگ کی کی ہوئی ہے، برہان الدین ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمی کی نہیں۔

(۳) ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، عرصے سے مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ پر کام کر رہے ہیں، انھوں نے بڑے قیمتی معلومات ان کے بارے میں جمع کیے ہیں اور اپنے اس علمی منصوبے پر انھوں نے بہت محنت کی ہے جیسا کہ اسلام آباد میں ان سے متعدد ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہوا۔ افسوس ہے کہ کام پھیلتا گیا اور وہ اسے وقت پر سمیٹ نہ سکے۔ یہ مواد اگر شایع ہوا تو دو تین جلدوں میں آئیگا آپنے بہت اچھا کیا کہ اس کا اختصار ایک مضمون کی شکل میں شایع کر دیا۔

(۴) سراج ہندی پر سید ریاست علی ندوی مرحوم نے بہت اچھا تفصیلی مضمون رسالہ ندیم (گیا) میں اپنی ادارت کے زمانے میں دو تین قسطوں میں شایع کیا تھا یہ تقسیم ہند سے پانچ سات سال پہلے چھپا تھا، تعجب نہیں کہ انکے مجموعۂ مضامین میں بھی شایع ہوا ہو۔[1]

---

[1] "عہد اسلامی کا ہندوستان" کے نام سے جو مجموعہ ادارۃ المصنفین پٹنہ سے شایع ہوا تھا اس میں یہ مضمون شامل نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ ایسے اہم عالم و مصنف پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن تو درکنار اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) میں بھی کوئی مضمون شریک اشاعت نہیں۔ علامہ عمری صاحب نے کسی حد تک یہ کمی مضمون لکھ کر پوری کردی، ورنہ پچاس سال پہلے کا ندیم کا شمارہ اب کہاں کسی کو دستیاب ہو گا۔

(۵) مولانا کوکن صاحب مرحوم پر حافظ عمیر صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے اور پُر معلومات، یہ صرف "دینیات" پر مختصر مضمون نہیں ہے بہت مکمل مقالہ ہے اس لیے اس پر فی الحال کسی مضمون کی اشاعت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس سے یہ نہ سمجھیے کہ کوکن مرحوم یا معارف میں میری دلچسپی کم ہوگئی ہے مرحوم سے میرا گہرا تعلق تھا اور ان پر مضمون لکھ کر میں دوستی اور محبت کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں، ایسا حق کہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کرسکتا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے

والسلام خیر طلب: مختار الدین احمد۔

خلیج کی جنگ

خلیج کی جنگ ختم ہو گئی مگر اس کی آگ میں ابھی تک مسلمان جل بھن رہے ہیں، اس جنگ نے دردمند مسلمانوں کو جو غم و اضطراب دیا ہے اس کا اندازہ اصحاب علم و نظر کے مندرجہ ذیل خطوط سے ہو سکتا ہے۔

اپنے مفاد اور اسرائیلی حکومت کی مضبوطی و استحکام کے لیے برطانوی اور امریکی استعمار عرب ملکوں کو اپنی مکمل گرفت میں لے کر اور عراق کے حصے بخرے کر کے ہی دم لے گا، اگر عرب ممالک ساحر افرنگ کی اس سازش کو سمجھ لیتے تو خود ہی اپنی

اس لیے کہ اخلاق محسنی کے آخر میں اس کا اشتہار درج ہے۔ دونوں کتابیں قاضی صاحب مرحوم ہی کے ادارے سب رنگ کتاب گھر، گلی قاسم جان دہلی سے شایع ہوئی ہیں۔ اس طرح قاضی سجاد حسین مرحوم کی تصانیف کی تعداد ۹ تک پہنچتی ہے۔

(۲) معارف ص ۱۵۳۔ ابراہیم بن محمد نام کے دو مصنف حلب میں گزرے ہیں، ایک محمد بن ابراہیم تو یہی سبط ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں، دوسرے ابراہیم بن محمد، متاخر العہد ہیں اور ملتقی الابحر اور غنیۃ المستملی کے مصنف جو بحیثیت عالم و مصنف مقدم الذکر کے مقابلے میں شہرت نہیں رکھتے۔ انھوں نے استانبول میں ۹۵۶ھ میں وفات پائی۔ فتاوی التاتارخانیہ کی تلخیص الفوائد المنتخبہ انہی بزرگ کی کی ہوئی ہے، برہان الدین ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمی کی نہیں۔

(۳) ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، عرصے سے مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ پر کام کر رہے ہیں، انھوں نے بڑے قیمتی معلومات ان کے بارے میں جمع کیے ہیں اور اپنے اس علمی منصوبے پر انھوں نے بہت محنت کی ہے جیسا کہ اسلام آباد میں ان سے متعدد ملاقاتوں میں مجھے اندازہ ہوا۔ افسوس ہے کہ کام پھیلتا گیا اور وہ اسے وقت پر سمیٹ نہ سکے۔ یہ مواد اگر شایع ہوا تو دو تین جلدوں میں آئیگا آپنے بہت اچھا کیا کہ اس کا اختصار ایک مضمون کی شکل میں شایع کر دیا۔

(۴) سراج ہندی پر سید ریاست علی ندوی مرحوم نے بہت اچھا تفصیلی مضمون[1] رسالۂ ندیم (گیا) میں اپنی ادارت کے زمانے میں دو تین قسطوں میں شایع کیا تھا یہ تقسیم ہند سے پانچ سات سال پہلے چھپا تھا، تعجب نہیں کہ انکے مجموعۂ مضامین میں بھی شایع ہوا ہو۔

---

[1] عہد اسلامی کا ہندوستان کے نام سے جو مجموعہ ادارۃ المصنفین پٹنہ سے شایع ہوا تھا اس میں یہ مضمون شامل نہیں ہے۔

سوس ہے کہ ایسے اہم عالم و مصنف پر انگریزی، فرانسیسی، جرمن تو درکنار اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (لاہور) میں بھی کوئی مضمون شریک اشاعت نہیں۔ عارف مری صاحب نے کسی حد تک یہ کمی مضمون لکھ کر پوری کردی، ورنہ پچاس سال پہلے کا ندیم کا شمارہ اب کہاں کسی کو دستیاب ہوگا۔

(۵) مولانا کوکن صاحب مرحوم پر حافظ عمیر صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے اور پُر معلومات، یہ صرف "وفیات" پر مختصر مضمون نہیں ہے بہت مکمل مقالہ ہے اس لیے اس پر فی الحال کسی مضمون کی اشاعت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس سے یہ نہ سمجھیے کہ کوکن مرحوم یا معارف میں میری دلچسپی کم ہوگئی ہے مرحوم سے میرا گہرا تعلق تھا اور ان پر مضمون لکھ کر میں دوستی اور محبت کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں، ایسا حق کہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کرسکتا۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے

والسلام خیر طلب: مختار الدین احمد۔

خلیج کی جنگ

خلیج کی جنگ ختم ہوگئی مگر اس کی آگ میں ابھی تک مسلمان جل بھن رہے ہیں، اس جنگ نے درد مند مسلمانوں کو جو غم و اضطراب دیا ہے اس کا اندازہ اصحاب علم و نظر کے مندرجہ ذیل خطوط سے ہوسکتا ہے۔

اپنے مفاد اور اسرائیلی حکومت کی مضبوطی و استحکام کے لیے برطانوی اور امریکی استعمار عرب ملکوں کو اپنی مکمل گرفت میں لے کر اور عراق کے حصے بخرے کرکے ہی دم لے گا، اگر عرب ممالک ساحر افرنگ کی اس سازش کو سمجھ لیتے تو خود ہی اپنی

قید و بند کے پھندے نہ کٹتے بقول اقبال سہیل مرحوم

مجھے ہی سے حلقے کسوائے مرے دام سیری کے الٰہی کیا کہوں انکی نگاہ سامری فن کو

(۱)

رائے بریلی
۶ر شعبان ۱۴۱۱ھ

محب فاضل و مکرم زیدت مکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ! عنایت نامہ مورخہ ۱۶ر فروری وقت پر پہنچ گیا، امید ہے کہ ہمارا بھی تازہ خط ملا ہوگا، آپ نے ہماری جس تشویش و اضطراب کا اندازہ کیا ہے، وہ بالکل صحیح ہے، بلکہ واقعہ اس سے بھی زائد ہے، یاد نہیں کہ ساری عمر میں کبھی بھی ایسے اضطراب کے دن گزرے ہیں، اس کی وجہ "البعث العربی" اور قومیت عربیہ کی تحریک کے علمبرداروں کے اصولوں، ارادوں اور منصوبوں سے واقفیت ہے، جو جزیرۃ العرب کو جاہلیت اولیٰ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اور ساری مساعی اور انقلابات، بلکہ خاکم بدہن کارِ نبوت کے برکات پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں کم ہی لوگوں کو اس سے واقفیت اور اس کا براہ راست مطالعہ حاصل ہے۔ ہمارا رسالہ "اکبر خطر علی العالم العربی" آپ کو پہنچے گا، تو اس خطرہ کی سنگینی کا احساس ہوگا، ان کا اقتدار اور اشتراکیوں اور برطانویوں کے عارضی قیام اور جنگی امداد سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

(۲)

باسمہ تعالیٰ

کراچی

۲۷ فروری ۱۹۹۱ء

مولانائے محترم زید فیوضہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قصور وار ہوں کہ مدت سے خیریت طلبی کا عریضہ نہ لکھ سکا، حالانکہ خیال برابر آپ کی طرف لگا رہا۔ اس مرتبہ فروری کا معارف اسی مہینے میں موصول ہوا، حیرت ہوئی۔ اس کے شذرات میں خلیج کی جنگ پر آپ کا تجزیہ وتبصرہ خود اپنی فکر کی ترجمانی اور اس کا سوز وگداز خود اپنے دل میں محسوس کرکے شکر ادا کیا کہ ع متحد گردید رائے بوعلی با رائے من
دو مسلم ملکوں کی سیاسی بے بصیرتی اور خود غرضی نے ملت اسلامیہ کو کس قعر ذلت میں ڈھکیل دیا۔ انا للہ —— از ماست کہ بر ماست

معارف کے اسی شمارہ میں اسکے circulation کی کمی پر بڑا افسوس ہوا، میں تو سمجھتا تھا کہ بیرون ملک کی عالمی یونیورسٹیوں میں تو یہ ضرور جاتا ہوگا، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس طرف توجہ نہیں فرمائی گئی، ہند وپاکستان میں تو علمی ودینی ذوق جس عسرت سے انحطاط پذیر ہے اسکے ہوتے ایسے رسالوں کی کم خریداری حیرت خیز نہیں۔

حضرت مولانا عبدالباری ندوی کے خطوط میں سے ایک دو خط جو عام افادیت کے ہوں کبھی کبھار آپ کی خدمت میں اگر ارسال کیا کروں تو آپ معارف میں جگہ دینا پسند فرمائینگے؟

پچھلے اکتوبر میں انڈونیشیا دس بارہ دن کے لیے جانا ہوا، حالات قریب اور غور سے دیکھے، انا للہ ہی پڑھنا پڑا، ملت اسلامیہ پر موسم خزاں کا وقت ہے، اب تو نزول مسیح ہی بہار لائے تو لائے،

اپنے لیے اصلاح حال اور حسن انجام کی دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ والسلام

ناچیز

غلام محمد

(۳۳)

حبیب منزل۔ علی گڑھ

۲۵ / ۲ / ۹۱ء

مکرمی و محترمی! السلام علیکم

فروری کے معارف کے اداریے میں عراق کے حالات پر آپ نے جو تبصرہ کیا ہے اس سے دل بہت خوش ہوا۔ اس مسئلے پر اتنا متوازن اور مبنی بر حقیقت اظہار خیال اس سے پہلے نظر سے مشکل ہی سے گزرا ہوگا ورنہ لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں کسی کے نزدیک صدام حسین ہیرو ہیں اور کوئی ان کی تکفیر سے بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو آپ نے لکھی ہے یعنی ایک طرف صدام حسین کا کویت پر حملہ اور قبضہ اور دوسری طرف سعودی حکومت کا اپنی سرزمین پر امریکہ اور اسکے ساتھی ملکوں کی افواج کو جمع کرنا دونوں اتنی بڑی غلطیاں تھیں جنھوں نے مغربی طاقتوں کو اپنی من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دیدی اور ان بدبختوں کو اپنے ناپاک عزائم پورے کرنے کا موقع مل گیا۔ خود امریکہ، برطانیہ وغیرہ کا دامن جارحیت سے جیسا "پاک" ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور پھر اسرائیل کی مسلسل جارحیت کو وہ جسطرح نہ صرف برداشت کررہے ہیں بلکہ اسکی حوصلہ افزائی کا موجب بن رہے ہیں وہ بھی سامنے کی بات ہے پھر یکایک انھیں کویت سے جو ہمدردی بلکہ محبت پیدا ہوگئی اسکے اسباب سمجھنا چنداں دشوار نہیں۔ ساتھ ہی ان عرب اور بعض دوسرے مسلم ممالک کی حکومتوں کا رویہ بھی تنقید سے بالاتر نہیں جو مغربی ممالک کا ساتھ دے رہی ہیں اور ان کا آلہ کار بن رہی ہیں نتیجہ یہ ہے کہ تباہی بہرصورت مسلمانوں اور عربوں کی ہورہی ہے چاہے وہ کویت ہو یا عراق یا سعودی عرب سب سے زیادہ نشانۂ ستم عراق ہی بن رہا ہے انا للہ وانا الیہ راجعون عربوں پر اللہ تعالیٰ کے جن قدیم وجدید احسانات کیطرف آپ نے اشارہ کیا ہے انکی موجودگی میں انکا یہ طرز عمل اور زیادہ افسوسناک ہے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو عرب سلاطین نے جسطرح ذاتی تعیش و تنعم میں صرف کیا بلکہ اب بھی کررہے ہیں وہ نہایت عبرتناک ہے اللہ تعالیٰ عقل سلیم مرحمت فرمائے روس کے انحطاط کے بعد اب امریکہ دنیا کی واحد بڑی طاقت ہے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیریت ہوگا۔ نیازمند ریاض الرحمٰن شروانی

وفیات

مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم

از ضیاء الصدیق دریابادی ندوی

دار المصنفین میں یہ خبر نہایت غم و اندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ امیر شریعت بہار واڑیسہ کے امیر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری، مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبر دار العلوم دیوبند و ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین مولانا سید منت اللہ رحمانی کا انتقال ۳ رمضان المبارک ۱۹ مارچ کی شب میں ہو گیا

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

ان کا مرثیہ صرف ایک عالم کا نہیں بلکہ ایک عالَم کا ماتم ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان جیسی ستودہ صفات ہستیاں اس دورِ قحط الرجال میں نعمت سے کم نہیں اور اس نعمت کے چھن جانے سے حرمان و نقصان کی کیفیت اور شدید ہو جاتی ہے۔

انھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم و معرفت اور شریعت و طریقت کی دولت سے مالا مال تھا، انکے والد ماجد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادیؒ سے تعلق، ردِ عیسائیت، تحریک ندوۃ العلماء اور ردِ قادیانیت میں اپنے کارناموں کے سبب نمونہ سلف اور طبقہ علماء و مشائخ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، انکی اقامت کانپور میں تھی لیکن ہدایت و ارشاد کے لیے وہ مونگیر اور اس کے اطراف

[illegible]

میں اقامت اختیار کی، مولانا [illegible]

بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے مولانا مونگیری کے انتقال کے وقت انکی عمر تقریباً دس برس تھی، ان سے بیعت کا شرف حاصل ہوا لیکن استفادہ کا زیادہ موقع نہ ملا، انھوں نے بعد میں دیوبند اور ندوہ میں بھی تعلیم حاصل کی، ندوہ میں وہ اپنے بھائی مولانا نوراللہ صاحب کے ساتھ آئے اور تقریباً چار سال قیام کیا، انکے زمانہ طالب علمی کے رفقاء میں مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم بھی تھے، جن کی اولوالعزمی اور شاہانہ حوصلہ نے تاج المساجد بھوپال کی تعمیر کی تکمیل پوری کر دکھائی تو مولانا منت اللہ صاحب نے بڑے پر لطف انداز میں فرمایا کہ اور کچھ ہو نہ ہو عمران خاں صاحب نے اپنی جنت تو پکی کرلی ۔

ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی جیسے ارباب فضل وکمال تھے، دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، مولانا سید اصغر حسین اور مفتی محمد شفیع سے استفادہ کیا، حاجی محمد شفیع بجنوری خلیفہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں پانچ سال رہے، بعد میں وہ اپنے والد ماجد کے خلیفہ مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری سے مجاز خلافت بھی ہوئے اور اپنے برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد خانقاہ رحمانی کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے ۔

[illegible] ملک وملت کی خدمت کا جذبہ ابتدا ہی سے تھا، خوش قسمتی سے ان کو مولانا محمد سجاد صاحب کی تربیت حاصل ہوگئی جو ایک دقیقہ رس عالم و فقیہ تھے اور جنکا [illegible] جیسے پیہم عمل، سوز و ساز، درد و داغ، جستجو و آرزو اور بے کل بیقراری اور ایک اضطراب مسلسل سے تیار ہوا تھا، انکے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے" ان کی سرپرستی میں مولانا منت اللہ رحمانی ۱۹۳۶ء میں سہرسہ سے بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے لیکن مولانا محمد سجاد کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ امارت شرعیہ کا قیام تھا، جو دراصل ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی انتشار، احساس شکست اور قنوطیت کے خلاف نئی بیداری اور نئی شیرازہ بندی کا پیام تھی، علماء و مفکرین اس کی ضرورت سے باخبر تھے، چنانچہ ۱۹۱۸ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خیال کو پیش کیا، یورپ سے واپسی کے بعد پھر انھوں نے اس ساز کو چھیڑا لیکن ان کے بقول" اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح نہ چلنے دیا" تاہم مخالفتوں کے باوجود مولانا سجاد کی قوت عمل نے بہار میں اس کو وجود کا قالب بخش دیا، سید صاحبؒ نے اسے ان کی سب سے بڑی کرامت سے تعبیر کیا کہ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، نظام شرعی کے قیام کی نیت کی برکت تھی کہ اس تحریک کو ملک کے علماء و مشائخ کی تائید حاصل ہوئی، چنانچہ اپنے عہد کے جنیدؒ و شبلیؒ، مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی اور پھر بعد میں مولانا شاہ محی الدین پھلواروی، شاہ قمرالدین پھلواروی کے علاوہ مولانا مونگیری، مولانا آزاد اور مولانا عبدالصمد رحمانی

میں برابر تشریف لے جایا کرتے تھے، جب وہاں قادیانیت کا فتنہ زیادہ سنگین ہوا ہوا تو اس کا مکمل قلع قمع کرنے کے لیے ۱۳۲۰ھ میں انھوں نے مستقل طور پر مونگیر میں اقامت اختیار کی، مولانا منت اللہ رحمانی سنہ ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے اپنے بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مولانا مونگیریؒ کے انتقال کے وقت انکی عمر تقریباً دس برس تھی، ان سے بیعت تو حاصل ہوئی لیکن استفادہ کا زیادہ موقع نہ ملا، انھوں نے بعد میں دیوبند اور ندوہ میں بھی تعلیم حاصل کی، ندوہ میں وہ اپنے بھائی مولانا نوراللہ صاحب کے ساتھ آئے اور تقریباً چار سال قیام کیا، انکے زمانہ طالب علمی کے رفقاء میں مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم بھی تھے، جن کی اولوالعزمی اور شاہانہ حوصلے نے تاج المساجد بھوپال کی تعمیر کی تکمیل پوری کر دکھائی تو مولانا منت اللہ صاحب نے بڑے پر لطف انداز میں فرمایا کہ اور کچھ ہو نہ ہو عمران خاں صاحب نے اپنی جنت تو پکی کرلی ۔

ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ، مولانا عبدالرحمٰن نگرانی ندوی جیسے ارباب فضل وکمال تھے، دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، مولانا سید اصغر حسین اور مفتی محمد شفیع سے استفادہ کیا، حاجی محمد شفیع بجنوری خلیفہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی خدمت میں پانچ سال رہے، بعد میں وہ اپنے والد ماجد کے خلیفہ مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری سے مجاز خلافت بھی ہوئے اور اپنے برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد خانقاہ رحمانی کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے ۔

ملک وملت کی خدمت کا جذبہ ابتدا ہی سے تھا، خوش قسمتی سے ان کو مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد کی توجہ بھی حاصل ہوگئی جو ایک دقیقہ رس عالم وفقیہ تھے اور جنکا خیر امت کے لیے پیہم عمل، سوز وساز، درد وداغ، جستجو وآرزو اور بے کلی بیقراری اور ایک اضطراب مسلسل سے تیار ہوا تھا، انکے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ "وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے" ان کی سرپرستی میں مولانا منت اللہ رحمانی ۳۶ء میں سہرسہ سے بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے لیکن مولانا محمد سجاد کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ امارت شرعیہ کا قیام تھا، جو دراصل ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی انتشار، احساس شکست اور قنوطیت کے خلاف نئی بیداری اور نئی شیرازہ بندی کا پیام تھی، علماء ومفکرین اس کی ضرورت سے باخبر تھے، چنانچہ ۱۸ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خیال کو پیش کیا، یورپ سے واپسی کے بعد پھر انھوں نے اس ساز کو چھیڑا لیکن ان کے بقول "اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح نہ چلنے دیا" تاہم مخالفتوں کے باوجود مولانا سجاد کی قوت عمل نے بہار میں اس کو وجود کا قالب بخش دیا، سید صاحبؒ نے اسے ان کی سب سے بڑا کرامت سے تعبیر کیا کہ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، نظام شرعی کے قیام کی نیت کی برکت تھی کہ اس تحریک کو ملک کے علماء ومشائخ کی تائید حاصل ہوئی، چنانچہ اپنے عہد کے جنیدؒ وشبلیؒ، مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی اور پھر بعد میں مولانا شاہ محی الدین پھلواروی، شاہ قمرالدین پھلواروی کے علاوہ مولانا مونگیری، مولانا آزاد اور مولانا عبدالصمد رحمانی

اس تحریک کی قیادت و سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی امارت شرعیہ کے چوتھے امیر تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلاف کی اس میراث و روایت کو اپنے علم و فضل رسوخ فی الدین، استقامت، فہم و فراست، اعتدال و توازن اور اعتماد و تعاون سے صرف قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسے مزید ترقی و وسعت بھی دی، گویا ان کی تنہا ذات میں پھلواری شریف کے بزرگوں اور مولانا مونگیری و مولانا سجاد کی برکات جمع ہوگئی تھیں امیر منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ایک تقریر میں "ہندوستان میں آزاد اسلام" کی جرأتمندانہ بات کہی تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا کہ وہ مطلبے اس مومنانہ اقدام کے لیے مستحق تبریک و تحسین ہیں"۔ آج امارت شرعیہ کے شعبہ دارالقضاء شعبہ افتاء، بیت المال وغیرہ اپنے امیر کی کامیاب قیادت کے نقیب و شاہد ہیں۔

ان کا دوسرا روشن اور نہایت اہم کارنامہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہے، یکساں سول کوڈ کے مطالبہ نے جب زور پکڑ لیا تو اس خطرہ کی شدت و سنگینی کو محسوس کرنیوالوں میں وہ پیش پیش تھے، ان کی مساعی کی بدولت ۱۹۷۲ء میں بمبئی کے ایک بڑے اجلاس میں مسلمانوں کے مختلف حلقہ فکر کے رہنما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور انھوں نے بورڈ کی تشکیل کی جس نے شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بڑا قابل قدر اور موثر کردار ادا کیا۔ مولانا کی یادگاروں میں جامعہ رحمانی بھی ہے جسے انھوں نے ۱۹۴۵ء میں قائم کیا تھا۔ جامعہ نے فقہ و افتاء کے شعبہ میں ممتاز اور قابل ذکر علماء پیدا کیے، اس کے کتب خانہ کو بھی انھوں نے بڑی وسعت دی۔

ندوہ سے ان کو خاص تعلق تھا، اپنے والد مولانا مونگیری سے اس کے رشتہ کو

انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا، ندوہ کے ناظم اور دارالمصنفین کے روح رواں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ان کا بڑا لگاؤ اور مخلصانہ روابط تھے اکثر قومی و ملی مسائل میں دونوں کو ایک دوسرے کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل رہتا تھا ندوہ کا عظیم الشان ۸۵ سالہ جشن منایا گیا تو اس کے آخری اہم اجلاس کی صدارت انھوں نے کی اور انہی کی دعا پر یہ جشن ختم ہوا، دارالمصنفین علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور معارف کے وہ قدرشناس تھے، علامہ شبلیؒ کے متعلق ایک جگہ لکھا کہ "وہ عالم اسلام کے مشہور عالم، ادب و تاریخ کے امام اور قدیم و جدید کے سنگم تھے" انھوں نے مولانا گیلانی کا یہ قول بھی نقل کیا کہ "بلاشبہ مولانا شبلیؒ قدیم وجدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے" اختلاف مسلک کو انھوں نے کبھی وجہ تلخی نہیں بنایا مکاتیب گیلانی کے ایک حاشیہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق انکی چند سطریں کئی قابل مطالعہ ہیں۔

انھوں نے مقالات و مضامین کثرت سے لکھے، وقتی مسائل پر انکے رسائل بھی ہیں گو مولانا کو تصنیف و تالیف کا بھی اچھا سلیقہ تھا مگر قومی و ملی زندگی کی مصروفیتوں نے انہیں اس جانب متوجہ نہیں ہونے دیا کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط کا ایک مجموعہ "مکاتیب گیلانی" کے نام سے مرتب کرکے شایع کیا تھا اس میں انھوں نے مکتوب الیہ کا مختصر حال تحریر کرنے کے علاوہ مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھے ہیں اس سے مولانا کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے مولانا گیلانی کا ہر خط عمدہ معلومات پر مشتمل ہوتا تھا اسلیے مولانا منت اللہ صاحب نے ان منتشر جواہر پاروں کو شایع کرکے بڑی مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے فاضل مرتب نے قارئین کی سہولت کیلئے ہر مکتوب کی مفصل فہرست بھی شایع کی ہے

مولانا کی زندگی اپنے کارہائے نمایاں کیوجہ سے اگر قابل رشک ہے تو انکی مبارک موت بھی حسن خاتمہ اور حسن قبولیت کی بشارت لائی، ۲۰ رمضان المبارک کو عشاء اور تراویح کی ابتدائی چند رکعات کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے، اللہ تعالیٰ انکو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے انکے پسماندگان خصوصاً انکے صاحبزادہ مولانا محمد ولی رحمانی اور تمام متعلقین کو صبر و رضا کی توفیق دے اور قوم و ملت اور امارت شرعیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

مطبوعات جدیدہ

ایقان اقبال (فارسی) از جناب پروفیسر محمد منور، ترجمہ فارسی از ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری تقطیع متوسط، کاغذ، طباعت بہترین صفحات ۲۵۲ قیمت ۸۰ روپے
پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، پاکستان۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے مستند اور بالغ نظر شارحین میں پروفیسر مرزا محمد منور کا نام نمایاں ہے، ان کی ایک کتاب "میزان اقبال" میں کلام اقبال کے ادبی پہلو کا فاضلانہ جائزہ لیا گیا تھا، ۱۹۷۷ء میں ان کی ایک اور کتاب "ایقان اقبال" کے نام سے شایع ہوئی، اس کے مباحث کا تعلق علامہ اقبال کے افکار و نظریات سے تھا مثلاً علامہ اقبال اور تعلیم آدمیت، تصور تقدیر، براہیمی نظر، حیات بعد الموت، تصور ملت، مرگ مجازی اور نظر اقبالیات کے شیدائیوں میں کتاب کی پذیرائی ہوئی، اب ایران کی ڈاکٹر شہین مقدم صفیاری نے اسے فارسی زبان کا قالب دیکر اقبالیات کے فارسی داں قدردانوں کے لیے ایک عمدہ علمی سوغات مہیا کر دی ہے، شروع میں ڈاکٹر خواجہ عبد الحمید عرفانی کے مختصر تعارفی مضمون کے علاوہ خود ڈاکٹر شہین کا مقدمہ بھی خوب ہے۔

اقبال اور قائد اعظم از پروفیسر احمد سعید، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۸۰ قیمت ۳۵ روپے پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور پاکستان۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کے نقوش فکر و عمل روز روشن کی طرح عیاں ہیں، دونوں نامور ہم عصر ابتدا میں بعض سیاسی مسائل پر مختلف الآرا تھے لیکن بعد میں دونوں کے خیالات میں اس درجہ یکسانی و ہم آہنگی ہوگئی کہ علامہ اقبال نے خود کو جناح صاحب کا معمولی سپاہی قرار دیتے ہوئے ان کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی کہ وہ دیانت دار ہیں اور خریدے نہیں جا سکتے۔ دوسری جانب قائد اعظم نے اس پر فخر کا اظہار کیا کہ علامہ اقبال کی قیادت میں ان کو ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا نیز انکی نظر میں علامہ اقبال سے زیادہ اسلام کا شیدائی کوئی اور نہ گزرا، ان دونوں رہنماؤں کے سیاسی نظریات تعلقات و اختلافات پر جناب احمد سعید نے ۱۹۷۵ء میں ایک مضمون لکھا تھا جو بعد میں چند اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شایع ہوا، زیر نظر کتاب اسی کا جدید ایڈیشن ہے، اس میں تین ابواب ۱۔ اختلافات ۲۔ خیالات میں ہم آہنگی و یکسانیت اور ۳۔ اختلافات کا خاتمہ شامل ہیں، ان کے ذیل میں سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ، سندھ کی علیحدگی، فرقہ وارانہ فیصلے، مغربی طرز جمہوریت پنجاب و بنگال کی اکثریت، فلسطین، مسجد شہید گنج وغیرہ کے بارے میں دونوں حضرات کے نقطہ نظر کا بڑی جامعیت سے جائزہ لیا گیا ہے جو پُر از معلومات ہے آخر میں مکاتیب اقبال بنام قائد اعظم بھی شامل کر دیے گئے ہیں ان انگریزی خطوط کا اردو ترجمہ پہلے بھی شایع ہو چکا ہے مگر مولف نے زیادہ سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کی کوشش کی ہے، اپنے موضوع پر یہ جامع اور پر از معلومات کتاب ہے اور اقبال اکادمی لاہور کے معیار کے عین مطابق ہے۔

نصف صدی قبل کا سفر نامہ حج از الحاج مولانا قاری حکیم محمد حمید الدین سنبھلی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت، بہترین، صفحات ۱۱۲ قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لکھنؤ۔

حج بیت اللہ اور مدینہ منورہ کی زیارت اور روضہ انور کی حاضری ہر مسلمان کا منتہائے شوق ہے، وادی شوق کے اس سفر کی ہر کیفیت کو یاد رکھنے اور لطف ولذت سے بیان کرنے کی مبارک روایت سے دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان کا دامن بھی تہی نہیں ہے، زیر نظر سفرنامہ حج اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مولانا قاری حمید الدین سنبھلی مرحوم متوفی ۱۹۵۵ء جو فن تجوید و قرأت میں اپنے وقت کے ممتاز و یگانہ شخص تھے۔ ۱۹۳۷ء میں حج بیت اللہ سے سرفراز ہوئے اور مدرسہ صولتیہ کے ناظم مولانا محمد سلیم کی فرمائش پر اپنے سوانح حیات "حمید السوانح" کی تالیف میں انھوں نے اس سفر سعادت کی پرکیف یادوں کو بھی قلمبند کیا، خوش قسمتی سے ان کا یہ مسودہ انکے ذی علم اور سعید فرزند مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء کو دستیاب ہوا تو انھوں نے اسے اپنے مفید حواشی کے ساتھ ماہنامہ ذکر و فکر میں بالاقساط شائع کیا اور اب کتابی صورت میں طبع ہوا ہے۔ پچاس برس کا عرصہ گو زیادہ نہیں لیکن موجودہ صدی میں گردش لیل و نہار نے جس تیز خرامی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا مشاہدہ اس سفرنامہ حج سے کیا جا سکتا ہے، مسافر حرم نے آرزوئے دید اور شوق وصال کی لذت و سرشاری کے ساتھ معمولی جزئیات تک سے اعتنا کر کے انہیں نہایت سادگی و دیانت سے بیان کر دیا ہے سبق آموز واقعات کی جانب توجہ دلائی تو مفید مشورے بھی دیے ہیں۔ پورا سفرنامہ پڑھنے کے لائق ہے، حواشی نے اس کی قدر و قیمت دوچند کر دی ہے، شروع میں صاحب سفرنامہ کے مختصر حالات زندگی بھی دیے گئے ہیں، مولانا محمد مسعود شمیم مکی اور مولانا عبد اللہ عباس ندوی کے مقدمہ و تعارف کے علاوہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے انکے الفاظ میں "یہ سفرنامہ بیک وقت شوق انگیز، معلومات خیز، دل دوز اور ایمان افروز ہے"

(ع۔ ص)

جلد ۱۴۷ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۱ء عدد ۵

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

گذشتہ عام انتخابات کو ابھی ڈیڑھ برس بھی نہیں ہوا تھا کہ اس مہینہ میں پھر نیا انتخاب ہونے والا ہے، لیکن اس میں بھی کسی ایک ہی پارٹی کو واضح اکثریت ملنے کے امکانات نظر نہیں آتے، کانگریس سب سے بڑی اور قدیم پارٹی ہے، اس کی کامیابی سے ملک کو پانچ برس کے لیے انتخابات سے نجات مل سکتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی موہوم اور پُرفریب وعدوں سے رائے عامہ کو ہموار کرنا چاہتی ہے، درحقیقت اس نے اپنی پچھلی ناکامی سے کوئی سبق نہیں لیا اس لیے اس سے لوگوں کی بیزاری اور نفرت قائم ہے، بھارتیہ جنتا پارٹی ایک منظم جماعت ہے، لیکن وہ کوئی ملک گیر پارٹی نہیں، اور اب ہر شخص یہ سمجھنے لگا ہے کہ وہ صرف اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے ذات پات، فرقہ واریت اور مذہبی جنون کو ہوا دے رہی ہے، جس کا نتیجہ خون خرابہ، تشدد اور انتشار ہے، جنتادل کا شیرازہ بکھر چکا ہے اس کے ووٹوں کی تقسیم سے کانگریس اور بھارتیہ جنتا پارٹی کو فائدہ پہونچے گا، بالفرض اس کو واضح اکثریت مل بھی گئی تو اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ اس میں پھر تقسیم نہ ہو کیونکہ اس کی حکومت گر جانے میں بھارتیہ جنتا کی حمایت واپس لینے سے زیادہ خود اس کی باہمی کشمکش اور رسہ کشی کو دخل تھا۔

ایسے غیر یقینی حالات میں انتخاب کے بعد بھی نہ سیاسی استحکام پیدا ہوگا اور نہ عوام کو راحت ملے گی، بلکہ ان کی پریشانیوں اور دشواریوں میں اضافہ ہوگا، رشوت، چور بازاری، مہنگائی اور بدعنوانی بڑھے گی، ملک میں فوضویت اور انتشار پیدا ہوگا، تشدد، خوں ریزی اور قتل و غارت گری کا دور دورہ ہوگا، شر و فساد پر آمادہ فرقہ پرستوں اور رجعت پسندوں کو کھیل کھیلنے کا موقع ملیگا، قوم و ملک کی تعمیر و ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں گے، آزاد، خوشحال اور پُرامن ہندوستان کا منصوبہ خاک میں مل جائے گا، درحقیقت خدا بیزار، کردار سے محروم اور اصول پسندی سے عاری سیاست کا یہی انجام ہوا کرتا ہے۔

ملک میں نہایت تیزی سے جو ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط آیا ہے، اس کا اثر سب سے زیادہ سیاست پر پڑا ہے، موقع پرست، مفاد پسند اور خود غرض سیاست دانوں نے پورے ملک کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے، ان کی دخل اندازی سے ہر شعبۂ زندگی میں بے اصولی، بدعنوانی اور خلفشار مچا ہوا ہے، سیاست کا نہ کوئی معیار ہے اور نہ ضابطۂ اخلاق، جیسے تیسے اقتدار پر قبضہ کرنا ہی مقصد رہ گیا ہے، کوئی پارٹی دودھ کی دھلی ہوئی نہیں ہے، سب کی نظر صرف ووٹوں پر ہے، جن کو حاصل کرنے کے لیے غلط اور خطرناک قدم اٹھانے اور ملک و قوم کے مفاد سے سمجھوتہ کر لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی، قوم کے بنیادی مسائل اور ملک کی اہم ضرورتوں سے کوئی سروکار نہیں، ہر پارٹی ایسے لوگوں کو ٹکٹ دیتی ہے جو لوٹ کھسوٹ، زور زبردستی اور غنڈہ گردی سے ووٹوں پر قبضہ کر لیں، خوف و ہراس، شورش اور دہشت زدگی کے اس ماحول میں نیک طبع، شریف اور امن و صلاح پسند لوگوں کی جان پر بن آئی ہے، اور انھوں نے سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں کے خوف سے چپ سادھ لی ہے۔

گو ان حالات میں بظاہر دم سادھ لینے ہی میں عافیت ہے، لیکن اس سے آنے والا طوفان رک نہیں سکتا، بلکہ شر پسندوں اور غلط کاروں کے حوصلے بلند ہوں گے اور انھیں اپنی من مانی کرنے کا مزید موقع ملے گا، اور رفتہ رفتہ حالات اس قدر بدتر ہو جائیں گے کہ اصلاح کی ساری امیدیں ختم ہو جائیں گی، غنیمت ہے کہ ملک کی اکثریت اب بھی سیکولر اور جمہوریت پسند ہے اس کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے، عام لوگوں کی طبیعت میں شرافت اور بھلمنساہت ہے، ان کو میل ملاپ، اخوت، بھائی چارگی اور امن و امان پسند ہے، لیکن وہ شور و غوغا میں الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں، جو مناسب نہیں، جمہوریت میں انتخابات کی بڑی اہمیت ہے، یہ ملک کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں کے ہوش و تدبر کے امتحان کا وقت ہے، یہ انتخاب نفرت و تشدد بھڑکانے والے، کمزور فرقوں، پسماندہ طبقوں اور لسانی و مذہبی اقلیتوں کی ترقی میں

رکاوٹ بننے والے افراد اور جماعتوں کے علاوہ ان لوگوں سے بھی چھٹکارا پانے کا وسیلہ ہے جنکے سایے میں فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر پھولتے اور پھلتے رہے ہیں، ملک و وطن سے محبت و خیر خواہی کا بھی تقاضا ہے، اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری دُہری ہے، کیونکہ حق و عدل کا قیام اور شر و فساد کا انسداد ان کا مذہبی و ملی فریضہ ہے۔

گزشتہ ماہ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور جناب میکش اکبر آبادی رحلت فرماگئے، قاضی صاحب میرٹھ کے ایک علمی و دینی خاندان کے فرد اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں تھے، وہ عرصہ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات و تاریخ اسلام کے صدر رہے، تحریر و تصنیف کا ذوق مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحبت میں پیدا ہوا، ابتدا میں مصطفےٰ منفلوطی کے عربی افسانوں کا اردو ترجمہ کیا، کئی برس تک میرٹھ سے "الحرم" نکالتے رہے، جس کے کئی خاص نمبر شایع ہوئے اردو عربی لغت میں بیان اللسان اور قاموس القرآن ترتیب دی، ندوۃ المصنفین دہلی کی کتاب "تاریخ ملت" کے بعض حصّے مرتب کیے، دو تین برس قبل ان کی کتاب "شہید کربلا" شایع ہوئی جمعیۃ علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے رہے، کئی برس سے بیمار تھے، ۱۹۸۳ء میں آخری بار دہلی کے مدنی سیمینار میں ملاقات ہوئی تو بہت کمزور ہوگئے تھے، طبیعت میں نفاست تھی، خوش وضع، خوش پوش اور خلیق و ملنسار شخص تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، میکش اکبر آبادی اردو کے پختہ مشق شاعر اور اچھے اہل قلم تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل مدرسہ عالیہ آگرہ میں کی، نظم و نثر میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ادبی رسالوں میں ان کی نگارشات برابر شائع ہوتی تھیں، اقبال و غالب بھی ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے، ان کا میلان تصوف کی طرف تھا، جس کا اثر ان کی نظم و نثر دونوں پر تھا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

مقالات

تاج الدین محمود اشنہی

چھٹی ساتویں صدی ہجری کے عارف، شاعر و ادیب

پروفیسر از نذیر احمد علی گڑھ

["زیر نظر مقالے کا خاکہ عرصہ ہوا تیار ہو گیا تھا، مگر اسکے مکمل کرنیکا موقع اب ملا،[1]

اس مقالے کی شان نزول بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی، راقم السطور کو عرصے سے عوارف المعارف تالیف شیخ شہاب الدین سہروردی کے فارسی ترجموں سے دلچسپی رہی ہے ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ سخاوت مرزا صاحب نے مجلہ فکر و نظر میں اشاعت کے لیے ایک مختصر سا مقالہ عوارف المعارف کے قدیم فارسی ترجمے کے عنوان سے بھیجا، اس میں کتابخانہ آصفیہ کے ایک نسخہ کا ذکر تھا، مترجم قاسم داود خطیب جر (کذا) نے شیخ بہاء الدین زکریا کے معاصر سلطان ابوبکر بادشاہ" ایران توران" کے لیے عوارف المعارف کا ترجمہ کیا۔ مرزا صاحب کے نزدیک سلطان ابوبکر سے مراد ابوبکر بن سعد بن زنگی آتابک سلجوقی (۶۲۳ - ۶۵۸) ہے اور 'جر' سے قصبہ جرنداب مراد ہوگا۔ یہ مضمون

[1] یہ محققانہ مقالہ کئی ماہ پہلے موصول ہوا تھا لیکن اشاعت کے لیے اب گنجائش نکل سکی ہے (ض)

مجلہ "فکر و نظر" جولائی سنہ ۱۹۶۳ء میں چھپا، مجلے کے اسی شمارے میں راقم نے اس کا تکملہ شایع کیا، اس میں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سلطان ابوبکر جس کا لقب تاج الدین تھا، عزالدین کبیر خانی کا بیٹا تھا، عزالدین مذکور منکبرنی کہلاتا ہے، وہ سلطان ایلتمش کا رومی غلام تھا جس نے سلطان رضیہ کے زمانے میں سنہ ۶۳۶ھ میں سندھ میں اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور راچہ اور ملتان پر بھی قبضہ کر لیا، لیکن جلد ہی سنہ ۶۳۹ھ میں اس کا انتقال ہو گیا، اس کی وفات پر اس کا بیٹا تاج الدین ایاز جانشین ہوتا ہے اور سندھ، ملتان اور راچہ پر اپنا قبضہ بحال رکھتا ہے، لیکن سنہ ۶۴۳ھ کے قریب وہ بھی فوت ہو جاتا ہے، اس کے بعد یہ علاقے دلی حکومت میں شامل ہوتے ہیں، قاسم داؤد خطیب مترجم عوارف خطیب اچہ تھے، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے اشارے پر وہ ترجمہ کرتے ہیں اور اس کو نوجوان فرمانروا تاج الدین ابوبکر جس کے القاب تقریباً ایک صفحے میں آئے ہیں۔ اس کے نام معنون کرتے ہیں، اس طرح یہ ترجمہ سنہ ۶۳۹ھ کے بعد ہوا اور سب سے قدیم ترجمہ قرار پایا۔ سلطان تاج الدین ابوبکر کی مدح میں عمید[1] لویکی کے دو قصیدے ملتے ہیں، عمید نے بھی اس کی ایک آزاد فرمانروا کی حیثیت سے مدح سرائی کی ہے، چند سال بعد راقم السطور کو قاسم داؤد کے ترجمے کے ایک دوسرے نسخے کا آگرے میں پتا چلا جو سنہ ۸۵۰ھ کا مکتوبہ تھا چنانچہ اس مخطوطے کے تعلق سے سنہ ۱۹۷۲ء میں ایک مقالہ انڈو ایرانیکا (کلکتہ) میں شایع کیا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد ظہیر الدین عبدالرحمٰن (وفات ۷۱۶) کے ترجمے تک رسائی ہوئی، ساتھ ہی ان کے پوتے صدرالدین جنید (وفات ۷۹۱) کا خلاصہ بھی

---

[1] اس کا دیوان راقم کی توجہ سے مجلس ترقی ادب لاہور سے شایع ہو چکا ہے۔

ان دونوں پر ایک مقالہ انڈو ایرانیکا میں شایع کیا، اسکے بعد شیخ اسماعیل بن عبدالمومن کے ترجمۂ عوارف کا ایک نسخہ جو برٹش میوزیم میں تھا، ملا، یہ ترجمہ ۶۶۵ھ کا تھا اور نسخہ ۶۹۷ھ کا مکتوبہ تھا۔ راقم السطور نے اس پر ایک مقالہ بنیاد فرہنگ تہران کے زیر اہتمام ایک جلسے میں سری نگر کشمیر میں پڑھا یہی مقالہ بعد میں مجلہ بیاض میں شایع ہوا۔ اسماعیل بن عبدالمومن شیخ المشایخ زین الدین کاموی کے مرید تھے کاموی کے حالات اس وقت نہیں ملے تھے، کچھ دنوں بعد جمالی اردستانی (وفات ۸۷۹) کی تحریروں میں کاموی کا تذکرہ نظر سے گذرا، اسی درمیان جمالی پر معارف ۱۹۷۰ء میں ایک مقالہ لکھا جس میں کاموی کے بارے میں بھی عوارف المعارف کے مترجم کی نسبت سے کچھ ضروری باتیں درج کیں، اسماعیل بن عبدالمومن اصفہانی نے اپنے ترجمے میں تاج الدین محمود اشنہی اور ان کے بیٹے صدرالدین محمد اشنہی کے اشعار درج کیے، راقم نے اپنے مقالے میں ان دونوں بزرگوں کو متعارف کرتے ہوئے ان کے اشعار اکٹھا کر دیے تھے، اسی زمانے میں کتابخانہ مجلس تہران (فہرست ج ۳ شمارہ ۹۰۰) میں ایک سفینہ اشعار کا تعارف نظر سے گذرا، اس قدیم سفینے میں ص ۳۰۷ بعد تاج الدین اشنہی کا کافی کلام درج ہے، اس میں موصوف کو ملک الحکما والواعظین کے لقب سے یاد کیا گیاہے۔ ان اشعار کے حصول کی ساری کوشش ناکام رہی، بہرحال سفینہ کے اشعار کا حوالہ میرے مقالے ص ۱۳۱ کے حاشیے میں درج ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ سال گذشتہ نجیب مائل ہروی نے مجموعۂ آثار تاج الدین اشنہی کے نام سے ایک رسالہ تہران سے شایع کیاہے جو تحقیق تدوین متن کا قابل تقلید نمونہ ہے۔ میری خوشی کی

کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس میں سفینۂ کتابخانۂ مجلس سے اشنہی کے اشعار لیے گئے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ اسماعیل بن عبدالمومن کے ترجمے پر میرا مضمون فارسی میں تھا، اس کا ذکر نہ اس ترجمے کے شایع شدہ نسخے میں ہے اور نہ نجیب مائل ہروی کے محققانہ مقدمے و تعلیقات میں، البتہ قاسم داؤد خطیب اچھے کے ترجمے پر میرا جو انگریزی میں مضمون ہے اس کا ذکر مصحح ترجمہ اسماعیل بن عبدالمومن اصفہانی اور نجیب مائل ہروی دونوں کے یہاں موجود ہے۔

میرے مضمون کے بعد اس سے تعلق رکھنے والی تین کتابیں ایران سے شایع ہوئیں :

(۱) ترجمہ عوارف المعارف از اسماعیل بن عبدالمومن ابی منصور ماشادہ، بہ تصحیح قاسم انصاری، شرکت انتشارات علمی و فرہنگی، تہران ۱۳۶۴، لیکن کتاب کے سرورق پر مترجم کا نام صرف ابوالمنصور عبدالمومن لکھا ہے، اس کے مقدمے وغیرہ میں میرے مقالے کا کہیں ذکر نہیں، البتہ قاسم داؤد پر جو مقالہ ہے اس کا ذکر موجود ہے

(۲) پنج گنج، اس کے مقدمے میں ہمایوں فرخ نے جمالی اردستانی کے منقولات جو شیخ زین الدین کاموی سے متعلق ہیں، جمع کر لیے ہیں، یہ مقدمہ میری نظر سے نہیں گذرا، مجھے معلوم نہیں کہ زین الدین کاموی کے بارے میں جمالی اردستانی کے مندرجات جن کی طرف میرے مقالہ معارف ۱۹۸۲ء میں اشارہ ہے، ان کا ذکر اس مقدمے میں ہے یا نہیں۔

(۳) مجموعۂ آثار فارسی تاج الدین اشنہی، مقدمہ، تصحیح و تعلیق از نجیب مائل ہروی، کتاب خانہ طہوری، تہران ۱۳۶۸، یہ رسالہ ادبی تحقیق کا قابل تقلید نمونہ ہے، اس میں مصحح نے تاج الدین اشنہی کے تعلق سے جو بھی مواد کہیں بھی ملا، اس سے پوری طرح استفادہ کر لیا ہے، اس میں تاج الدین کی تین تصانیف کا انتقادی متن ہے جو انتہائی محققانہ انداز میں تیار ہوا ہے۔ میں نے زیر نظر مضمون میں اسی کتاب سے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے،

اگرچہ تاج الدین اشنہی کے بارے میں ادھر کافی مواد جمع ہوا ہے، لیکن راقم نے آج سے بہت پہلے اس پر یادداشت لکھی تھی، اس لحاظ سے اس معاملے میں اولیت کا شرف میرے مقالے کو حاصل ہے"۔

تاج الدین اشنہی ساتویں صدی کے نامور عارف اور شاعر تھے، ان کا تعلق اشنہ سے تھا جو آذربائیجان میں ارومیہ (رضائیہ) سے دو روز راہ پر واقع ہے، یہ قصبہ اشنو، اشنویہ بھی کہلاتا ہے، تاج الدین اشنہی اشنوی، اشنوئی اور شنوی نسبت سے یاد کیے گئے ہیں اور ان کو شیخ شیوخ الاسلام، سلطان المحققین، ملک الحکما والواعظین اور سلطان المتکلمین وغیرہ کہا گیا ہے، ان کا نام محمود، کنیت ابو محمد، تاج الدین لقب معلوم ہوتا ہے، تحفۃ اہل الوصول میں[۱] یہ نام اس طرح آیا ہے۔

شیخ الاسلام حجۃ اللہ علی الخاص والعام سلطان سلاطین المحققین

---

[۱] ترجمہ عوارف، مقدمہ بقلم قاسم انصاری ص ۲۸، ۲۹، مجموعۂ اشعار فارسی، ترتیب نجیب مائل ہروی، مقدمہ ص ۱۵۔

ابو محمد محمود بن خداداد بن ابی بکر بن یوسف اشنہی۔

اشنوی کے آخذ میں ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، البتہ ان میں کچھ اشارے مل جاتے ہیں، اس طرح کے آخذ حسب ذیل ہیں :

۱۔ غایۃ الامکان فی درایت الزمان از خود اشنہی ۲۔ تحفۃ العرفان فی ذکر سید الاقطاب روزبہان از شیخ شرف الدین بن صدر الدین روزبہان ثانی ۳۔ روح الجنان از شیخ شمس الدین عبداللطیف بن صدرالدین روزبہان ثانی ۴۔ شد الازار از شیخ جنید شیرازی ۵۔ مجمل فصیحی در حوادث ۶۴۶۔ ۶۔ تاریخ گزیدہ احمداللہ مستوفی ۷۔ تحفہ اہل الوصول فی علم الفصول از اسماعیل بن عبدالمومن مترجم عوارف ۸۔ تاریخ وصاف حضرت ۹۔ ہزار مزار ترجمہ شد الازار از عیسیٰ بن جنید۔

تاج الدین اگرچہ اشنہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ ہرات میں گذرا مجمل فصیحی وقائع ۶۴۶ کے ذیل میں ہے کہ سیف الدین باخرزی (م : ۶۵۹) نے خرقہ تبرک اشنوی کے ہاتھ سے ہرات میں پہنا اور امام الدین داود بن محمد بن روزبہان الفرید (م : ۶۷۱) کو ہرات ہی میں اشنوی سے تلقین ذکر و اجازہ ملی۔ اصیل الدین واعظ اور جامی نے لکھا ہے کہ ہرات میں مجدالدین طالیہ کے مدفن کے پہلو میں دفن ہوئے۔

تاج الدین اشنوی کے زمانے کا قطعی تعین بھی دشوار ہے، اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شہرت ایک عارف کی حیثیت سے سنہ ۶۰۰ھ تک ہو گئی ہوگی، اس لیے کہ روزبہان بقلی (م : ۶۰۶) کی زندگی میں وہ مشہور ہو چکے تھے اور ۶۴۶ میں

سیف الدین باخرزی ہرات میں ان کے مرید ہو ہی چکے تھے، تاج الدین کے بیٹے[1] صدر الدین محمد اشنوی ۶۲۳ھ کے قریب جلاوطن کر دیے گئے تھے ان امور سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ شیخ تاج الدین ۵۵۰ھ کے قریب پیدا ہوئے[2] ہوں گے۔

تاج الدین کے والد کا نام تحفہ اہل الوصول[3] میں خداداد ملتا ہے، اسی کتاب کے حوالے سے یہی نام مقدمۂ ترجمۂ عوارف (ص ۲۸ میں) اور مقدمۂ روز بہان نامہ (ص ۵۱) میں درج ہے۔ لیکن مجمل فصیحی کے مطبوعہ نسخہ[4] میں ذیل واقعات ۴۶ تاج الدین کے باپ کا نام صداد ملتا ہے اور یہی نام علامہ قزوینی کے یہاں بھی ہے۔

تاج الدین کے شیخ شمس الدین محمد بن عبد الملک دیلمی تھے، مگر انکے بھی حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہے، ان کی متعدد تصنیفات میں ایک کشف الحقائق ہے جو ۵۸۹ھ میں تالیف ہوئی، اس بنا پر ان کی تاریخ وفات ۵۹۰ اور ۶۰۰ کے بیچ[5] قرار دی گئی ہے، اسماعیل پاشا[6] نے ان کی وفات ۵۰۳ ہجری میں بتائی ہے جو صحیح نہیں، سید نور بخش قہستانی (۷۹۵ھ - ۸۶۹) کے نزدیک وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، نجیب مائل ہروی نے ۴۲ کتابوں اور رسالوں کے نام مجموعۂ

---

[1] مجموعۂ آثار فارسی ص ۸ - ۹ [2] ترجمۂ عوارف، تصحیح قاسم انصاری مقدمہ ص ۲۸ [3] ج ۲ ص ۲۱۶: شیخ سیف الدین خرقۂ تبرک از دست شیخ تاج الدین محمود بن الاشنہی پوشیدہ در ہرات [4] دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی ص ۴ [5] اسماعیل پاشا کی کتاب ؟ المکان ؟ [6] دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی (ایضاً) [7] سلسلۃ الاولیا ص ۳۲۔

آثار فارسی (ص ۴-۷) گنائے ہیں، آقائے دانش پژوہ کے یہاں بھی بعض کتابوں کے نام ملتے ہیں۔

تاج الدین اشنہی کے مریدین میں تین اشخاص کا نام ملتا ہے۔

۱۔ شیخ سیف الدین باخرزی، مجمل فصیحی ج ۱ ص ۳۱۷ ذیل حوادث ۶۴۲ھ میں آیا ہے: شیخ سیف الدین باخرزی خرقۂ تبرک از دست شیخ تاج الدین محمود الاشنہی پوشیدہ۔

مجمل میں تو یہی ہے کہ شیخ سیف الدین نے تاج الدین اشنہی سے ۶۴۲ھ سے بہت قبل خرقہ تبرک پایا لیکن دانش پژوہ نے روزبہان نامہ (ص ۱۵) میں یہ جملہ لکھا ہے: این اشنہی استاد خرقۂ تبرک از سیف الدین باخرزی (۶-۵۸۶-۱۵۹) وارد بظاہر یہ قول مبنی ہے مجمل فصیحی کے بیان پر جہاں واضح طور پر ہے کہ باخرزی نے اشنہی سے خرقہ پایا نہ کہ اشنہی نے باخرزی سے۔

ابو المعالی سیف الدین باخرزی چھٹی اور ساتویں صدی کے مشائخ میں تھے، فصیحی کے قول کے مطابق مدت تک ہرات میں مقیم رہے اور فقہ، لغت اور تفسیر کا درس لیا اور اشنہی کے ہاتھ پر بیعت[۳] لی، ۶۴۲ میں بخارا میں وفات پائی، انکی متعدد تصانیف ہیں جس میں حسب[۴] ذیل قابل ذکر ہیں۔

---

[۱] مقدمۂ روزبہان نامہ [۲] دراصل اس سال یعنی ۶۴۲ میں شیخ باخرزی کی وفات ہے۔ انکی وفات کی دوسری تاریخ ۶۵۹ھ بھی مجمل میں ہے [۳] فقہ و لغت و تفسیر کی تعلیم ہرات اور نیشاپور میں حاصل کی اور چند شیخ میں انکے استاد شیخ شہاب الدین سہروردی (م: ۶۳۲) تھے انکے تین بیٹے تھے، جلال الدین محمد جو باپ سے پہلے بخارا میں فوت ہو چکے تھے، برہان الدین احمد جو حج سے واپسی پر کرمان میں مقیم ہو گئے، تیسرے مظفر الدین مطہر (مجمل فصیحی) [۴] مجموعۂ آثار فارسی ص ۸-۹۔

شرح اسماء الحسنیٰ: نسخۂ کتاب خانہ شیرانی، لاہور

وقائع الخلوۃ: نسخہ در فرہنگستان لائڈن

رسالۃ وصیۃ السفر: اس کا فارسی خلاصہ ابو المفاخر یحییٰ نے تیار کیا تھا۔

رسالۂ در عشق: تہران میں تین بار چھپ چکا ہے۔

منظومات: دو رسالہ عرفانی در عشق

رباعیات: اس کا نادر نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے، اس کی رو سے مجلہ دانشکدہ ادبیات تہران میں شایع ہو چکا ہے۔

(۲) خواجہ امام الدین داود پسر محمد پسر روزبہان ساتویں صدی کے مشایخ میں ہیں، انھوں نے طریقہ اسناد و دعوت شیخ نجم الدین ابی الجناب و شیخ تاج الدین اشنہی سے حاصل کیا، شد الازار کے ترجمہ ہزار مزار میں خواجہ داود کا لقب عزالدین لکھا ہے[1] اور یہ بھی لکھا ہے کہ عزالدین داود خرقہ از دست پدر خود پوشیدہ و پدر او از دست پدر خود پوشیدہ و پدر او از شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ شد الازار[2] سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ داؤد نجم الدین کبریٰ کے ارادتمند تھے لیکن ذکر و ارشاد کی تلقین اور دعوت کی اجازت تاج الدین اشنہی سے حاصل کی۔

۳۔ شیخ محمد گہرزنی، عبدالرحمن اسفرائنی نے لکھا ہے کہ شیخ محمود اشنہی قدس اللہ روحہ العزیز کے بارے میں آیا ہے کہ اس کے مریدوں میں ایک شیخ محمد گہرزنی اولاً یا زرکار رہنے والا تھا۔ جب اس کو اپنے وطن بھیج رہے تھے تو اس کو یہ وصیت کی تھی کہ جب وہ اپنے وطن پہنچے تو سوائے ذکر اور خلوت کسی اور کام میں مشغول

[1] ص ۴۴-۴۰۵، [2] ص ۳۵۲-

نہ ہو، شیخ گیرزنی نے پوچھا اے شیخ کیا اس کی اجازت ہے کہ کسی مسلمان بھائی کو مدد دے سکتا ہوں جس سے وہ آسودہ حال ہو جائے۔ جب یہ بات شیخ محمود اشنہی کو پہنچی تو سر جھکا لیا، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور کہا مجھے ایسے شخص کی حالت پر تعجب ہے کہ افعی نے اپنا زہر اس کے جسم میں پیوست کر دیا اور وہ دوسرے کے پاؤں میں سے کانٹا نکالنے میں لگا ہو۔

تاج الدین اشنہی کے بارے میں ایک روایت | تحفہ اہل عرفان[1] (ص ۲۷ - ۲۸) میں شرف الدین ابراہیم نے شیخ تاج الدین محمود کی بابت ایک روایت خود شیخ کے صاحبزادے صدر الدین محمد اشنہی کے حوالے سے نقل کی ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

شیخ صدر الدین پسر قدوۃ المحققین و سلطان المتکلمین تاج الملۃ والدین محمود اشنہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ میرے والد شیخ الاسلام تاج الدین محمود رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ میر سید الاقطاب شیخ روزبہان[2] روح اللہ روحہ کے معتقد و مرید تھے اور آنے جانے والوں سے شیخ روزبہان کے حالات معلوم کرتے رہتے اور جب کوئی مسافر شیراز کی طرف سے پہنچتا تو اکثر اس کو اپنی خانقاہ میں ٹھہراتے اور طرح طرح سے اس کی خاطر تواضع کرتے، ایک روز شیخ

---

[1] شرف الدین ابراہیم پسر صدر الدین ابی محمد روزبہان ثانی [2] سے مراد روزبہان بقلی (۵۲۲ - ۶۰۶)

[3] یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسماعیل بن عبد المومن اصفہانی مترجم عوارف المعارف شیخ تاج الدین اشنہی کا بڑا عقیدت مند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے شیخ کے ان جوابات کو جو سفر حج میں ان سے کیے گئے تھے فارسی میں منتقل کیا، دیکھئے مجموعۂ آثار فارسی ص ۵۸۔

رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید ان کے پاس آیا، میرے باپ شیخ الاسلام نے اس کی تعظیم و تکریم کی اور بہت عزت سے رکھا، چند روز اس طرح گذر ے، مسافر میرے والد شیخ الاسلام کے حالات کا بغور مطالعہ کرتا رہا، آخر اس درویش کے دل میں خیال آیا کہ انھیں (شیخ الاسلام) سے خرقۂ تبرک کی درخواست کرے، چنانچہ اپنی غرض شیخ تاج الدین سے بیان کی۔

شیخ نے فرمایا: ٹھہرو، درویش نے کہا جیسی آپ کی مرضی، جب کچھ رات ڈھلی شیخ تاج الدین آئے اور درویش کو بلا کر خانقاہ کی چھت پر لے گئے، اس کا کان پکڑا اور کہا کان لگاؤ، دیکھو کیا سنتے ہو، درویش نے کہا، میں نے خوب کان لگایا، ایک آہ سنتا ہوں جو میرے شیخ شیخ روزبہان کی آہ کے مانند ہے، پھر شیخ نے میرے کہا: غور سے سنو، پھر میں نے شیخ کی آواز سنی، میں نے کہا کہ اے شیخ یہ آہ میرے شیخ کی آہ ہے، شیخ نے فرمایا: اے درویش! تمھارے شیخ ایسے ہیں کہ ان کی آواز ایک ماہ راہ کی دوری سے سنائی پڑتی ہے، تو پھر (ایسے شیخ کے بجائے) مجھ سے خرقۂ تبرک طلب کرتے ہو؟ اس عزیز نے شیخ روزبہان کی خدمت میں استغفار کیا"

شیخ صدر الدین محمد اشنہی رحمۃ اللہ علیہ شیخ روزبہان کے مزار پر اکثر آتے اور فرماتے وہ عاشقوں کے بادشاہ ہیں، خلائق کی مراد ان کے روضے سے جلد ہی پوری ہو جاتی ہے، اگر دوسرے مشائخ دامن دامن بخشتے ہیں تو شیخ روزبہان خرمن خرمن، لٹاتے ہیں وہ اپنے وعظ میں شیخ روزبہان کے مقولے بہت نقل کرتے۔ روح الجنان میں مولف تحفۂ اہل عرفان کے بھائی عبد اللطیف[1] نے ہو بہو

[1] شمس الدین عبد اللطیف فرزند صدر الدین ابی محمد روزبہان ثانی، نجیب مائل ہروی کے یہاں بھی دونوں بھائی کے بیانات نقل ہیں ص ۶-۷ ۔

یہی باتیں صدر الدین اشنہی کی روایت سے نقل کی ہیں،[1] البتہ تفصیلات میں کہیں کہیں کچھ تفاوت ہے اس کا بھی ترجمہ دیا جا رہا ہے:

شیخ الشیوخ تاج الملۃ والدین محمود اشنہی رحمۃ اللہ علیہ شیخ (روزبہان) سے بڑی ارادت و محبت رکھتے تھے، ایک روز ان کی خدمت میں شیخ کا مرید پہنچا اور جیسا کہ مشائخ کا طریقہ ہوتا ہے کہ مسافر کے حالات دریافت کرتے اور اس پر عنایت فرماتے۔ عوام میں (مشائخ کے بارے میں) جو گفتگو ہوتی ہے (اس کی وجہ سے) اس درویش نے گھر کی راحت پر سفر کی مشقت کو ترجیح دیا تھا، اس کو شیخ کی سیرت بہت پسند آئی، چند روز کے بعد خرقے کی درخواست کی، شیخ نے کہا صبح تک انتظار کرو، جب سورج کا سفید چتر آسمان کے افق پر نمودار ہوا تو درویش کو رباط کی چھت پر بلایا اور کہا: جھروکے کی طرف کان لگاؤ اور سنو: کیا آواز آرہی، درویش نے سنا، آہ کی آواز تھی، شیخ نے کہا: اے درویش بتاؤ کہ کس کی آواز ہے، درویش نے جواب دیا: ایسا لگتا ہے کہ یہ میرے مرشد کی آواز نہیں ہے، اس نے دوبارہ کان لگایا اور کہا: اے شیخ یقین ہو گیا یہ آہ و فغاں شیخ روزبہان کی ہے، شیخ تاج الدین نے فرمایا: اے ضعیف الاعتقاد درویش! جس کا شیخ ایسا ہو کہ ہر صبح اس کی آواز باز کی طرح فضا میں پرواز کرے اور نالہ و فغاں کی آواز شیراز سے قصبہ اشنوہ میں صاحبدلوں کے کان تک پہنچا دے اس کے لیے یہ کیونکر مناسب ہوگا کہ وہ دوسرا مرشد تلاش اور خرقہ و لباس کی بات کرے، واپس جاؤ اور اپنے مرشد کے آستانے کو

---

[1] اگر نیست کے بجائے ہست ہوتا تو بیان زیادہ صاف ہو جاتا۔

غنیمت جانو، یہ حکایت شیخ کے خلف الصدق کی روایت کی ہوئی ہے"

شیخ تاج الدین اشنی کے پسر

شیخ اشنی کے ایک بیٹے کا پتا چلتا ہے جن کا نام صدرالدین محمد اشنی ہے۔ یہ بڑے فاضل اور دانشمند تھے، علوم اسلامی میں بڑا درک رکھتے تھے، تصوف و عرفان کے ساتھ فلسفہ کی طرف ان کا رجحان تھا، غرض اپنے عہد کے بڑے دانشمندوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں، صرف اتنا معلوم ہے کہ اپنے باپ تاج الدین کے بارے میں انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے[1] جس سے ان کے باپ کے مراتب عرفان کا پتا چلتا ہے، اسی سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ صدرالدین محمد بھی صوفیانہ رجحان رکھتے تھے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے والد بلکہ مشہور بزرگ روزبہان[2] بقلی کے ارادتمند و معتقد تھے وہ ان کے مزار پر حاضری دیتے اور کہتے کہ وہ عاشقوں کے بادشاہ ہیں، خلایق کی مراد ان کے روضے سے جلد حاصل ہوتی ہے، اگر عام مشائخ "دامن دامن" دیتے ہیں تو وہ "خرمن خرمن" بخشتے ہیں۔ اگر شیخ روزبہان کے آستانے کی خاک سونگھیں تو اس سے بوئے عشق آئے گی۔

تاریخ وصاف حضرت[3] سے معلوم ہوتا ہے کہ آتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ - ۶۵۸) کے عہد میں صدرالدین اشنی شیراز میں مقیم تھے، وہ دور تصوف و عرفان کا دور تھا، آتابک اہل عرفان و تصوف کا بڑا قائل تھا، وہ انھیں عالموں اور دانشمندوں پر ترجیح دیتا، اس نے متعدد فضلا کو جن کا میلان فلسفہ و کلام کی طرف تھا اپنے قلمرو سے اخراج کا حکم صادر فرمایا، وصاف حضرت میں ہے:

---

[1] دیکھئے تحفۂ عرفان تالیف شرف الدین ابراہیم، اس روایت کا ترجمہ نقل ہو چکا ہے۔
[2] انکے حالات کے لیے دیکھئے ہزار مزار ترجمہ شدالازار ص ۲۸۹-۲۹۳ [3] ص ۱۵۸-۱۵۹۔

اتابک باران انعام و اصطناع
بر زهاد و عباد و صلحا و متصوفه
فائض داشتی و جانب ایشان را
بر ائمه و علما و افاضل مرجح داشتی
و چون بداعیهٔ حسن اعتقاد خریدار
متاع زهد و تقشف بود متسلسان
و متزهدان خود را در زی زهادت
جلوه گری می کردند و به ایادی
و انعامات او محظوظ می شدند و
ارباب بلاغت و اصحاب نفوس
ساذجه را گفتی اولیاء خدای تعالی
اند و نفوس ملکی دارند و شائبه
شعوذه و احتیال خالی و عاری اند
هذا الحال از عهد او ندان ذکا و
فطنت و اهل نطق و فضیلت متشعر
بودی و ایشان را بجز بخبره و فضول
نسبت دادی، لاجرم چند افراد
از ائمهٔ نامدار و علمای بزرگوار
را بواسطهٔ نسبت علم و حکمت از

اتابک کی انعام و نعمت کی بارش
سے زاہد، عابد، صالح اور صوفی
فیضیاب ہوتے اور وہ ان کو ائمہ
و علما و فضلا پر ترجیح دیتا اور
چونکہ حسن اعتقاد کی بنا پر وہ زہد
و ریاضت کشی کی متاع کا خریدار
تھا تو مکار و زاہد نما حضرات زہد
کے لباس میں نظر آتے اور اسکے
انعام و اکرام سے بہرہ ور ہوتے
اور اہل بلاغت اور سیدھے
سادے حضرات کو کہتا کہ یہ
لوگ اولیا اللہ اور فرشتہ صفت
ہیں اور شعبدہ گری اور مکاری
سے دور، اس کے برعکس صاحبان
علم و دانش و اہل نطق و فضیلت
سے خالیت رہتا اور ان کو مکار
اور بے کار قرار دیتا، اس کا
نتیجہ ہوا کہ بڑے بڑے ائمہ اور
عظیم دانشوروں کو اس بنا پر

اخراج کردند قہراً و جبراً از شیراز
اخراج، از آنجملہ امام صدرالدین
محمود الاشنہی الواعظ بود کہ استغنا
و استبصار او در انتشار تجلی علوم
عقلی و نقلی چون بیاض نہار از
اقامت بینت استغنا داشت و
در شیوہ وعظ خود را ابن القری
عہد بل تریع الدہری انگاشت
جماعت فضلا کہ در مجلس تذکیر
او حاضر شدہ اند تقریر کردند
کہ کلیات و جزئیات علوم را
تا حدی مستحضر بود کہ اگر سائلی
از عویصات و مشکلات قسمی از
اقسام علوم و اصول و فروع و الہیات
و طبیعیات و ہندسہ و ہیئت
و حساب و طب و تفسیر و وجوہ
قرأت و احادیث و ادبیات
سوال کردی علی الارتجال
جواب مسئلہ را بہ وجہی ایراد

کہ وہ علم حکمت سے سروکار رکھتے
ان کو نکال دیا اور قہراً و جبراً
شیراز سے اخراج کا حکم دیا، ان
میں سے امام صدرالدین تھے جن
کا علم بہ لحاظ علوم عقلی و نقلی
میں صبح کی سفیدی کی طرح دلیل سے
بے نیاز تھی اور جو وعظ گوئی میں زمانے
کے ابن القری بلکہ انتخاب روزگار
تھے، جو فضلا ان کی مجلس وعظ میں
حاضر ہوتے ان کا قول ہے کہ علوم
کے کلیات و جزئیات ان میں اس
حد تک مستحضر ہیں کہ اگر کوئی سائل
اقسام علوم: اصول و فروع، الہیات
و طبیعیات ہندسہ، ہیئت، حساب
طب، تفسیر، وجوہ قرأت، احادیث
ادبیات، میں سے کسی علم کے مشکل
سے مشکل مسئلے کے بارہ میں سوال کرتے
تو وہ اس سوال کا جواب اسی
انداز سے دیتا کہ اہل علم و فضل

نمودی کہ موجب دہشت اولی
الالباب گشتی، سالی در میان حاج
بموضع عرفات وعظی گفت و شیخ
حقانی شہاب الدین عمر السہروردی
در زمان آخر عمر بود و چشم ظاہر
پوشیدہ شدہ او را بہ محفہ نشاندہ
بمجلس او حاضر آوردند، سخنان او
را نیک پسندیدہ فرمود و تحسینہا
فرمود و این دو بیتی او را بر حسب
حال خود و آنابک،

از صحبت تو کنون فراق اولی تر
بر درگہ تو زرق و نفاق اولی تر
چون پردۂ راستی مخالف کردی
ما را پس ازین راہ عراق اولی تر"

دنگ رہ جاتے، ایک سال
عرفات کے میدان میں حاجیوں کے
درمیان وعظ کہہ رہے تھے، شیخ
حقانی شہاب الدین عمر سہروردی
کا آخری زمانہ تھا اور ان کی بینائی
جاتی رہی تھی، ان کو پالکی میں بٹھا کر
صدر الدین اشنوی کی مجلس میں لے
گئے، انھوں نے اشنوی کی گفتگو بہت
پسند کی اور بڑی تعریف فرمائی
(اشنوی نے) یہ رباعی حسب حال کہی
ہے جس کا مفہوم یہ ہے۔
یعنی تیرے پاس رہنے سے تو تجھ سے
الگ ہو جانا ہی بہتر ہے، تیرے
دربار میں مکر و فریب کی گرم بازاری
مبارک رہے، تو نے پردۂ راستی[1] کو
پردۂ مخالف[2] کر دیا۔ اس کے بعد
میرے لیے راہ عراق[3] ہی بہتر ہے۔

---

[1] ایک نغمہ کا نام ہے [2] یہ بھی ایک نغمہ ہے [3] عراق بھی ایک نغمہ ہے، راہ بمعنی پردہ، معنی یہ ہے، تمہارے
یہاں سچائی کے بجائے عناد و مخالفت کا دور دورہ ہے، پس میرے لیے عراق چلے جانا ہی اچھا ہے۔

اگرچہ شیراز نامہ ص ۲۰۸ میں ماخذ کا ذکر نہیں لیکن اس کا حسب ذیل بیان مصنف حضرت سے ماخوذ ہے، خواجہ امام جاری جن کی کنیت ابو نصر تھی اتابک (ابوبکر) کا امام اور استاد تھا اور علوم شرعی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا، عربی زبان اور ادبیات میں بڑی دستگاہ بہم پہنچائی تھی، مشائخ، صلحا اور گوشہ نشینوں کا بہت معتقد تھا، ان لوگوں کی تربیت اور نگرانی کا فریضہ اس کے ذمہ تھا اور وہ ان کے ذکر خیر سے دریغ نہیں کرتا تھا، اس طرح لوگ اس کی بات کو بہت مانتے تھے، چونکہ وہ علوم شرعی کا ماہر تھا تو اس نے اتابک کے دل میں یہ بٹھا رکھا تھا کہ علما و طلبہ کی وہ جماعت جو علوم حکمت و اصول میں مہارت رکھتی ہے، ان کا درس و دور سنت و جماعت کے طریقے کے خلاف اور شیراز کے لوگوں کی گمراہی اور بد اعتقادی کا موجب ہے (لہٰذا) اتابک نے اس جماعت کے شیراز سے اخراج کا حکم صادر کیا، ان میں ایک مولانا صدرالدین اشنہی ہیں کہ "استحضار و استبصار او بہ کلیات علوم عقلی و نقلی چو بیاض نہار در ریاض بہار از اقامت بیان استغنا داشت و در علوم الٰہیات و طبیعیات و ہندسہ و جبر لیات سعی فرمود و این جملہ را درس گفتی و متبحر بودی" اور ان کے علاوہ امیر شہاب الدین تورہ پشتی و مولانا عزالدین قیسی اور ائمہ کی ایک جماعت کو بھی شہر شیراز سے اخراج کر دیا۔

ان جلا وطن کیے ہوئے علما میں ایک شہاب الدین تورہ پشتی بھی تھے، ان کے شہادت جانے کی وجہ سے محققین کو الجھن ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ مشائخ میں تھے، کئی کتابوں کے مصنف، مجمل فصیحی میں بذیل واقعات ۶۶۱ھ[1] ہے، وفات

---

[1] بخش ۲ ص ۳۲۰-۳۲۹، اس کتاب میں انکے تین بیٹوں اور ان کے بیٹوں کا حاشیہ ص ۳۴۱

شیخ الحفاظ، افتخار المحدثین شیخ شہاب الملۃ والدین فضل اللہ التوران پشتی شارح کتاب المصابیح و مصنف المعتمد فی المعتقد وغیرہ، بکرمان نجیب مائل ہروی[2] نے لکھا ہے کہ المعتمد فی المعتقد جو عقاید و اثبات صفات خداوند و شرح اسماء و کلام خدا و قضا و قدر و ایمان و کفر کے بارے میں ہے اور خود آتابک ابوبکر بن سعد زنگی کے نام معنون ہے۔ ظاہر ہے ایسے شیخ کے بارے میں اتنی سوء ظنی کہ خود جس حکمران کے نام کتاب معنون ہو، وہی شیخ کے جلا وطن کا فرمان جاری کرے۔

صدر الدین محمد اشنی صاحب تصنیف بزرگ ہیں، ان کی ایک کتاب "تحفہ اہل الوصول" موجود ہے اور کچھ عرفانی اشعار ترجمہ عوارف میں نقل ہیں:

۱۔ تحفۃ اہل الوصول فی علم الفصول، شیخ صدر الدین اشنی کی تقریر و تحریر کا مجموعہ، اس کا موضوع توحید، سماع، وفات نبی کریمؐ اور مذمت دنیا جس کے مرتب اسماعیل بن عبد المومن بن اسماعیل بن عبد الجلیل بن ابی منصور ماشادہ ہیں، جنھوں نے محمد اشنی کی وفات کے بعد اسے مرتب کیا، اس کے ایک نسخے کے بابت نجیب مائل ہروی نے خبر دی ہے۔ قاسم انصاری[1] مترجم نے کتاب کے مقدمہ

(حاشیہ ص ۳۴۴) پوتوں تک کے نام درج کیے ہیں۔ اس طرح:

شہاب الدین فضل اللہ

تاج الدین عبد اللہ — صدر الدین عبد العزیز — مجد الدین عبد الرحمن

تاج الدین عبد اللہ ← کمال الدین ← نظام الدین محمد ← تاج الدین عبد اللہ

صدر الدین عبد العزیز ← (لاولد)

مجد الدین عبد الرحمن ← شہاب الدین فضل اللہ، برہان الدین عبد المومن

شہاب الدین فضل اللہ ← رکن الدین سلیمان، عماد الدین عبد السلام

رکن الدین سلیمان ← صدر الدین عبد العزیز

عماد الدین عبد السلام ← اعظم شیخ زادہ صدر الدین ← عبد العزیز ندیم ← امیر معین الدین محمد

۱۔ اس کے جائے وقوع کے لیے دیکھیے حواشی تر دینی شد الازار، نیز دیک: ہزار مزار ص ۳۰۲-۳۰۴[2] ڈاکٹر مائل ہروی نے اسے طبع کر دیا ہے۔ مطبوعہ نسخے کے مقدمے سے یہ اطلاع لی گئی ہے۔

ص ۲۸ میں علت تالیف کے ذیل میں لکھا ہے کہ چون امام شیخ شیوخ الاسلام حجۃ اللہ علی الخاص والعام، سلطان المحققین.. ابو محمد محمود بن خداداد بن ابی بکر یوسف اشنہی وفات یافت.. فصولی چند کہ از بہر مبتدیان بروی اقتراح کردہ بودند بدست این ضعیف اسماعیل بن عبدالمومن بن اسماعیل بن عبدالجلیل بن ابی منصور ماشاذہ احسن اللہ عاقبۃ امرہ افتاد۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت بالا میں اصل مصنف یعنی صدر الدین محمد پسر ابو محمد محمود کا نام درج ہونے سے رہ گیا۔ اس لیے کہ تحفۃ اہل الوصول کے مصنف صدر الدین محمد اشنہی تھے نہ انکے باپ، صحیح مصنف کا نام خود مصحح عوارف نے ص ۲۹ پر اس طرح لکھا ہے:

و تالیف کتاب تحفۃ اہل الوصول را بمنظور حفظ مقداری از آثار صدر الدین اشنہی انجام داد۔

۲۔ اشعار جو باقی رہ گئے ہیں، صدر الدین اشنہی شاعر تھے اور انکی عمدہ رباعی جسکا مخاطب اتابک ابوبکر بن سعد ہے، اوپر درج ہو گئی۔ انکے کچھ اشعار اسماعیل بن عبدالمومن نے ترجمہ عوارف میں محفوظ کر دیے ہیں، راقم نے اپنے مقالہ، ترجمۂ عوارف المعارف از اسماعیل بن عبدالمومن میں یکجا کر دیے تھے، دوبارہ نجیب مائل ہروی نے انھیں مجموعہ آثار فارسی ص ۱۵-۱۶، جمع کر دیے ہیں، یہ سارے اشعار سادہ مگر عارفانہ ہیں: پہلی غزل ملاحظہ ہو:

فلک قدر ترا زیبد رسالت	ز رویت تافتہ نور جلالت
زخلق تو گرفتہ بوی ور مشک	ز رشک تو مہ نو در خجالت
چو بر گردون گذر کردی ملک گفت	بنام ایزد زہی جاہ و جلالت
چو پای خود نہادی بر سر عرش	بہ بانگ آمد کہ آیا این چہ حالت
مرا تاجی چنین کی بود کامشب	کہ باشم من کہ دریابم وصالت
گہی آنست کز حضرت بخواہی	مراد خود چو ہست اکنون مجالت
بخواہ آنہا کہ می خواہی ز حضرت	محبت خوش کشد نازد لالت
سلام حق بگوش سر تو بشنو	نظر کن در جمالش بی ملالت
مشنوی چون سراید مدحت تو	کہ بس تنگ است میدان مقالت

(ترجمہ عوارف باب سی ام)

(باقی)

برصغیر میں قرآن حکیم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ

از ڈاکٹر وفا راشدی ۔ کراچی ، پاکستان

حضرت مخدوم نوح سرور ہالائی سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے دسویں صدی ہجری میں "القرآن الحکیم" کا مکمل ترجمہ مع تفسیر فارسی زبان میں کیا۔ یہ نہ صرف سندھ بلکہ پورے برصغیر پاک و ہند میں قرآن مجید کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ ہے[1]۔ اس نسخے کو پاکستان کے مشہور قومی و علمی ادارہ سندھی ادبی بورڈ نے ۱۴۰۱ھ ۱۹۸۱ء میں

---

[1] اس ترجمے کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب "وحی منظوم" مصنفہ علامہ سیماب اکبرآبادی (مطبوعہ سیماب اکیڈمی کراچی ۱۹۸۱ء) کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں :-

"دہلی سے عرصہ ہوا فارسی کے دو ترجموں والا قرآن پاک شایع ہوا تھا ان میں سے ایک ترجمہ شیخ سعدی سے منسوب کیا گیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ترجمہ حضرت علی ابن محمد المعروف میر سید شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ) کا ہے اور دوسرا ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ) کا ہے لیکن شاہ صاحب سے پہلے مخدوم نوح ہالائی (المتوفی ۹۹۸ھ) نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا جس کا ایک پارہ راقم (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں) نے ۱۳۸۱ھ میں شایع کیا تھا۔"

اس وقت کے چیرمین ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی کی نگرانی میں نہایت اہتمام سے شایع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہی فارسی زبان میں اس نسخے کی تقدیم تحشیہ و تصحیح کے فرائض بطریق احسن انجام دیے ہیں۔ اس قرآن مجید کی طباعت و اشاعت انتہائی نفیس، صوری و معنوی اعتبار سے معیاری اور دلکش انداز میں ہوئی ہے جس سے ادارے کے قرآنی و دینی علوم سے شغف اور اعلیٰ کارکردگی کے نہج کا پتہ چلتا ہے۔

"القرآن الحکیم" کے زیر نظر مطبوعہ نسخے کی کل ضخامت بڑے سائز پر ۱۲۶۰ صفحات ہے۔ جس میں سے عربی متن (یعنی اصل قرآن) ۶۱۰ صفحات پر اور فارسی ترجمہ و تفسیر بھی اتنے ہی صفحات یعنی ۶۱۰ پر مشتمل ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کا مبسوط و مفصل مقدمہ ہے جو چالیس صفحات پر محیط ہے۔

ساتویں صدی ہجری یعنی حضرت مخدوم نوح کے ترجمہ سے پہلے کی صدیوں میں علماء و فقہائے ہند نے اپنے اپنے عہد میں قرآن شریف کے فارسی ترجمے کیے لیکن یہ تمام کے تمام ترجمے چند سورتوں اور آیتوں تک محدود تھے۔ مثلاً علامہ شمس الدین دولت آبادی ثم الدہلوی کی تفسیر بحر الامواج نویں صدی ہجری کی تالیف ہے یہ سورۂ فاتحہ سے سورۂ انعام تک ہے۔ علامہ ابوالفضل (متوفی ۱۰۱۰ھ) نے بھی دسویں صدی کے وسط میں تفسیر آیۃ الکرسی لکھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی نے اپنے مقدمے میں ان تفاسیر کے علاوہ کتب خانۂ آصفیہ کے حوالے سے جن قلمی نسخوں کا ذکر فرمایا ہے ان میں شیخ نظام الدین تھانیسری کی تفسیر فارسی ریاض القدس پارہ عم، نامعلوم مترجم کی تفسیر سورۃ الملک و سورۃ المدثر اور حضرت

شاہی کی تفسیر سالم الاسرار ہے۔

دسویں صدی ہجری میں حضرت مخدوم نوح ہالائی کے مکمل فارسی ترجمے کے بعد گیارہویں صدی ہجری سے علمائے کرام نے ترجمہ و تفسیر کی طرف زیادہ توجہ دی۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم نے معاشرے کی اصلاح و تطہیر کی خاطر تحقیق و تفہیم کے ساتھ درس قرآن کا سلسلہ جاری کیا۔ وہ سبق کے طور پر مطالب قرآن بیان فرماتے اور آیات قرانی کی روشنی میں مسائل زندگی پر بحث کرتے، قرآن کے متن کو لفظ بہ لفظ ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ سمجھاتے، حضرت شاہ عبدالرحیم کا نظریہ یہ ہے کہ قران حکیم ایک فن کی کتاب ہے۔ اہل علم حضرات کو اس فن میں کامل دسترس ہونی چاہیے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے نامور فرزند حضرت شاہ ولی اللہ (وفات ۱۱۷۶ھ) نے اپنے والد کے طریقے کو اختیار کیا۔ شاہ صاحب نے ۱۱۵۱ھ میں فتح الرحمٰن کے نام سے قرآن مجید کا مکمل فارسی ترجمہ بارہویں صدی ہجری میں کیا۔

تیرہویں صدی ہجری میں جو تفسیر مشہور ہوئی وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے خلف الرشید حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی ہے۔ یہ تفسیر مکمل نہیں۔ صرف سورۂ بقرہ اور پارۂ عم پر مشتمل ہے۔

حضرت مخدوم نوح ہالائی علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ قرآنی آیات کی تفسیر و تفہیم اور احادیث نبوی کی توضیح و تشریح سہل اور آسان الفاظ میں ایسے

دلآویز پیرایے میں بیان فرماتے کہ اس عہد کے بڑے بڑے علما و فقہا بھی ان کی ذہانت وادراک اور تبحر علمی کے مداح و معترف ہو جاتے۔ ان کے درس و تفسیر کی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ دور دور سے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے مسائل تصوف کے ساتھ مسائل جات کا حل دریافت کرتے اور ان کی بارگاہ سے فیضیاب ہو کر اٹھتے۔ حضرت مخدوم نوح ہالائی کی دینی علمی و قرآنی خدمات کا اندازہ ان کے ملفوظات، مکتوبات، ارشادات کے علاوہ ان کے ترجمہ و تفسیر قرآن سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے بلکہ صرف زیر تبصرہ ترجمۂ قرآن ہی ان کی عظمت کے لیے کافی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی[1] حضرت مخدوم نوح ہالائی کے اس مکمل فارسی ترجمے کی بے شمار خوبیاں ہیں۔ یہاں چند خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ قدامت میں اسے شرف اولیت حاصل ہے۔

۲۔ اس میں مقطعات و متشابہات کے اسرار و رموز کے واضح اشارے ہیں۔

۳۔ ہر صفحے کی داہنی طرف قرآن کریم کا اصل متن ہے۔ اس کے بالمقابل ہر صفحے پر ہر آیت کا سلیس اور جامع ترجمہ ہے۔ ساتھ ہی متشابہ آیات کی تاویل و تشریح بھی۔ حاشیے میں آیات کی تصریح، محاوروں، استعاروں پر مبنی لفظوں اور جملوں کی تحقیق بھی شامل ہے

---

[1] یہ عاجز فقیر (وفا راشدی) کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی جیسے استاد معظم کی براہ راست رہنمائی اور ان کے "مقدمہ" کی روشنی میں حضرت مخدوم نوح ہالائی کے ترجمہ فارسی کے بارے میں یہ چند سطریں قلمبند کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

۴۔ بین السطور میں مسائل کا حل ترجمہ میں اس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے کہ کسی اور ترجمے یا تفسیر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

۵۔ ترجمے کی زبان اس قدر سہل اور آسان ہے کہ عالم و غیر عالم سب ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۶۔ ایک سو چودہ سورتوں کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ایک سو چودہ مرتبہ جو ترجمہ کیا گیا ہے ہر ترجمہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح ہم معنی آیتوں کے ترجمے بھی مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں کیے ہیں۔ یہ جدت فارسی کے کسی دوسرے ترجمے میں دیکھنے میں نہیں آتی۔ یہ خصوصیت اس بات کی دلیل ہے کہ قدرت نے مترجم کو ترجمہ کے فن میں بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا اور وہ فارسی زبان و ادب پر بے مثال دسترس رکھتے تھے۔

۷۔ ترجمہ و توضیح میں اسلاف مفسرین و محدثین کے طریقوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

۸۔ ترجمے کے ضمن میں مختصر تعلیقات سے معانی و مطالب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی فتح الرحمٰن کے ترجمہ و تعلیقات میں یہی انداز اختیار کیا تھا اور طباعت کے وقت ایسے ہی تعلیقات حاشیے میں شامل کیے گئے۔

قرآن مقدس اور اس کے ترجمہ و تفسیر کا اصل نسخہ مترجم و مفسر حضرت مخدوم نوح ہالائی کے زیر نگرانی ان کے مرید و خلیفۂ خاص حضرت بہاء الدین گوڈڑیہ ٹھٹھوی نے لکھا تھا۔ وہ ٹھٹھے کے میمن قوم کے فرد تھے۔ حضرت مخدوم اور ان کے مریدین بہاء الدین گوڈڑیہ کا احترام کرتے۔ بہاء الدین گوڈڑیہ کے عقیدتمندوں میں سندھ کے عظیم صوفی شاعر حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے جد امجد (حضرت مخدوم نوح کے خلیفۂ خاص

حضرت شاہ عبدالکریم بلڑی والے (متوفی ۱۰۳۲ھ) بھی تھے۔ سندھ ہی کے عظیم المرتبت صوفی شاعر حضرت قاضی قاضن (متوفی ۹۵۸ھ) حضرت مخدوم نوح کے ہم عصر تھے۔ قاضی قاضن اور شاہ کریم دونوں وادی مہران کی برگزیدہ علمی و دینی شخصیات تھے۔[۱]

یہ نسخہ دو خطوں میں لکھا گیا۔ خط قرآن مقدس سیاہی میں، ترجمہ سرخی میں، ہر سطر کے نیچے ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ قاسمی مقدمہ (ص ۱۵) میں تحریر فرماتے ہیں کہ پہلے یہ خیال تھا کہ اسی نسخے کو آفسٹ میں چھاپا جائے لیکن خط قرآن رسم الخط مصحف عثمانی کے مطابق نہ تھا اور اس میں بہت سی غلطیاں تھیں لہذا اس ارادے کو ترک کر دیا گیا۔ اول تا آخر نسخے کی از سر نو کتابت کرائی گئی اور اس کی طباعت آفسٹ میں عمل میں آئی۔

اصل نسخے کے ورق اول میں جو عبارت درج ہے اس سے اس کا یہ سن کتابت معلوم ہوا[۲]

" بدانکہ بعد از آوردن کرخی از شہر تستر مورخہ بست و ہفتم ماہ شعبان در نوشتن ترجمہ بعد شروع کردم در تاریخ ۱۱۰۱ھ بفضل و کرم امید کہ بحرمت قرآن و حرمت نبی آخر الزمان جملہ ترجمہ بخیر و سلامت تمام کردہ آمین آمین۔

قرآن کریم اور حضرت مخدوم نوح کے ترجمہ مع تفسیر کا یہ اصل نسخہ درگاہ سرور بالا کے موجودہ ذی علم و فضل سجادہ نشین سندھ حضرت مخدوم

---

[۱] ملاحظہ ہو ابیات شاہ کریم مترجمہ ڈاکٹر نجم الاسلام مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی سندھ یونیورسٹی جام شورو ۱۹۸۷ء۔ [۲] ذکر برخی از تراجم و تفاسیر قرآن در زبان فارسی از علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی ص ۱۵، ۱۶

محمد زماں طالب مولائی کی ملکیت ہے۔ ان ہی کی تحریک پر ڈاکٹر قاسمی نے اسے مدون کیا۔ اس نسخے کی کتابت ۱۱۰۱ھ میں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ پانچ سو سالہ پرانا نسخہ ہے۔ پانچ صدیاں گزرنے کے بعد اس کے کاغذ کا خستہ و خراب ہونا، رنگ کا بدلنا، حروف کا مدہم ہونا اور اکثر حصوں کا ناقابل خواندہ صورت میں موجود ہونا کوئی تعجب خیز بات نہیں تھی۔ ان حالات میں ڈاکٹر صاحب کو مخطوطہ پڑھنے، تصحیح کرنے، صاف کرنے اور کتابت و طباعت کے لائق بنانے میں بڑے دشوار گذار مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ تاہم انھوں نے مخطوطہ شناسی عربی و فارسی علوم اور زبانوں میں مہارت، ترجمہ و تفسیر کے فن سے دلچسپی اور دین سے گہرے تعلق کی بنا پر کئی سال کی شب و روز محنت شاقہ عرق ریزی اور دیدہ وری کے بعد ہر قسم کی مشکلات پر قابو پا لیا اور تکمیل کے آخری نکتے پر پہنچا کر دم لیا۔

عربی متن کے ہر صفحے کے سامنے فارسی ترجمہ و تفسیر آیت بہ آیت نمبر وار لکھی گئی ہے۔ عربی و فارسی دونوں کی کتابت نفیس ہے، خطوں اور سطروں میں یکسانیت وہم آہنگی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ نے اپنے مقدمہ کے آغاز میں قرآن مقدس کے نزول سے لے کر اب تک کے اس کے قلمی نسخوں اور ساری دنیا میں بتدریج اس کی ترویج کی تاریخ نیز قرآن حکیم کی فضیلت اور علوم قرآنی کی اشاعت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنے موضوع کی وضاحت اس قسم کے عنوانات کے تحت کی ہے۔

۱۔ جمع آمدن قرآن بوسیلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ

۲۔ شروط تفسیر قرآنِ مقدس

۳۔ تفسیر آیات متشابہات ۴۔ مسئلہ نسخ در قرآن۔

"ذکر برخی از تراجم و تفاسیر قرآن در زبان فارسی" کے زیر عنوان ان تمام تراجم و تفاسیر کا اجمالی احاطہ کیا ہے جو تبلیغ قرآن کے ابتدائی دور سے لے کر حضرت مخدوم نوح ہالائی (متوفی ۹۹۸ھ) اور ان کے بعد حضرت شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ ان کی اولاد اور ان کے عہد کے دیگر علما و فقہا کے توسط سے معرض وجود میں آئیں۔ غرض ڈاکٹر قاسمی نے علمائے عرب و عجم کے فارسی ترجموں اور تفسیروں کا تذکرہ کر کے اس ترجمہ و تفسیر کی خوبیاں اور خصوصیات پوری طرح نمایاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اس خدمت قرآنی کی بہترین جزا دے۔

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پھلواری شریف پٹنہ

اس مضمون کا عنوان اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کی غزلیات حصہ اول (..... سے ۱۹۰۵ء تک) کے درج ذیل شعر کا ایک مصرعہ ہے، جو غزلیں انھوں نے لاہور کے مقامی کالج کی طالبعلمی کے زمانہ میں کہی تھیں ؎

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے　　بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تونے اے واعظ!

اقبال نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں واعظوں کو اپنے طنز کا نشانہ اس لیے بنایا ہے کہ "استوا علی العرش" کے فقرے کے جو معنی وہ پہناتے ہیں اور خدا کے عرش پہ جلوہ فرما ہونے کی باتوں کو جس طرح وہ پیش کرتے ہیں اس سے عام انسانوں کے ذہن میں خدا سے دوری کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خدا اور انسان کے رشتوں کا صحیح تصور ان کے سامنے نہیں آپاتا۔ اقبال نے انہی احساسات اور تصورات کی تردید، قرآنی معنوں میں، اس مصرعہ میں کی ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس تردید کے جواز میں خدا کے انسان سے قریب تر ہونے کی بات کو ایک مسلمہ بنا کر پیش کیا ہے جو ان کا اس شعر میں اصل مقصد ہے۔

جہاں تک خدا کے عرش پر مستوی ہونے کی باتیں ہیں، ایسی چند قرآنی آیات کے ترجمے درج ذیل ہیں جن میں "استواء علی العرش" کا ذکر وارد ہوا ہے :-

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا (ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ) (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷)" حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے (ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ)" (سورہ یونس ۱۰۔ رکوع ۱) "وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے (اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى)" (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵)

خدا کے "استواء علی العرش" (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا تو مشکل ہے۔ مگر اس کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد کہیں بے تعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خودسری کی ضلالت میں۔ اس طرز بیان سے قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور

خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

از
جناب محمد بدیع الزماں صاحب۔ ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔ پھلواری شریف، پٹنہ

اس مضمون کا عنوان اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کی غزلیات حصہ اول (.... سے ۱۹۰۵ء تک) کے درج ذیل شعر کا ایک مصرعہ ہے، جو غزلیں انھوں نے لاہور کے مقامی کالج کی طالبعلمی کے زمانہ میں کہی تھیں ؎

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ! خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

اقبال نے اس شعر کے پہلے مصرعہ میں واعظوں کو اپنے طنز کا نشانہ اس لیے بنایا ہے کہ "استوا علی العرش" کے فقرے کے جو معنی وہ پہناتے ہیں اور خدا کے عرش پہ جلوہ فرما ہونے کی باتوں کو جس طرح وہ پیش کرتے ہیں اس سے عام انسانوں کے ذہن میں خدا سے دوری کا احساس جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی خدا اور انسان کے رشتوں کا صحیح تصور ان کے سامنے نہیں آپاتا۔ اقبال نے انہی احساسات اور تصورات کی تردید، قرآنی معنوں میں، اس مصرعہ میں کی ہے اور دوسرے مصرعہ میں اس تردید کے جواز میں خدا کے انسان سے قریب تر ہونے کی بات کو ایک مسلمہ بنا کر پیش کیا ہے جو ان کا اس شعر میں اصل مقصد ہے۔

جہاں تک خدا کے عرش پر مستوی ہونے کی باتیں ہیں ایسی چند قرآنی آیات کے ترجمے درج ذیل ہیں جن میں "استواء علی العرش" کا ذکر وارد ہوا ہے ۔

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا (ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۷) "حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ تخت سلطنت پر جلوہ گر ہو کر کائنات کا انتظام چلا رہا ہے (ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ" (سورہ یونس ۱۰۔ رکوع ۱) "وہ رحمٰن (کائنات کے) تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہے (اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی"

(سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۵)

خدا کے "استواء علی العرش" (تخت سلطنت پر متمکن ہونے) کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا تو مشکل ہے ۔ مگر اس کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ بھی ہو، قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے ۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد کہیں بے تعلق ہو کر بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرماں روائی کر رہا ہے اس طرح قرآن اس بنیادی غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خودسری کی ضلالت میں۔ اس طرز بیان سے قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کرتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں پادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور

حاکمیت جس شے کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اسے واحد معبود مانتے ہوئے سیاسی و تمدنی معنوں میں بھی اس کی حاکمیت کو تسلیم کرے۔ اسی لیے فرمایا گیا :-

" خبردار رہو! اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔ (اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ)

(سورۃ الاعراف ۵۔ رکوع ۷)

متذکرہ بالا فقرے میں اسی " استوار علی العرش " کی وہیں مزید تشریح ملتی ہے جو پہلے مجملاً بیان کیے گئے ہیں۔ یعنی یہ کہ خدا محض خالق ہی نہیں آمر اور حاکم بھی ہے۔

" استوار علی العرش " کی اس مختصر سی تشریح و توضیح کی روشنی میں اقبال نے زیر تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں خدا اور انسان کے رشتوں کو ایک مسلہ بنا کر پیش کیا ہے اور وہ مسلہ یہ ہے کہ جب انسان کا خالق خدا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو ہستی کسی چیز کی خالق ہو وہ اپنی مخلوق سے اس کی تخلیق کے بعد بے تعلق ہو کر دور جا بیٹھے اور اس سے محبت و شفقت نہ رکھے اور پھر جب اس خالق نے اپنی اس مخلوق کے لیے ایک روشن راہ کھول رکھی ہے تو وہ کیوں نہیں اپنی مخلوق کی آئے دن کی کارگزاریوں سے باخبر رہنا پسند کرے گا۔ چنانچہ اس دوسرے مصرعہ میں اقبال نے بلاواسطہ ان بہت سی آیات کی طرف دھیان مبذول کرایا ہے جن میں خدا نے قرآن میں مختلف مقامات اور مختلف مواقع پر اس دوری کی غلط فہمی کی خود تردید کی ہے اور بار بار یہ یاد کرایا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے قریب ہی نہیں بلکہ اس کے لیے کتنا رحیم و کریم و شفیق بھی ہے۔ چند ایسی آیات کے ترجمے ذیل میں درج ہیں :-

" اور اے نبیؐ ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں ، تو انھیں

بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اسکی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پہ ایمان لائیں۔ (یہ بات تم انہیں سنا دو) شاید کہ وہ راہ راست پالیں" (سورۃ البقرہ ۲۔ آیت ۱۸۶) "ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں۔ ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں" (سورہ قٓ ۵۰۔ آیت ۱۶) "وہ سب کچھ سنتا ہے اور قریب بھی ہے (اِنَّهٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ)" (سورہ سبا ۳۴۔ رکوع ۶) "اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو بآواز بلند کی جاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو" (سورۃ الانبیآء ۲۱۔ آیت ۱۱۰)

"کیا دنیا والوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ رکوع ۱)

"وہ سینوں کے چھپے ہوئے راز جانتا ہے..... یقیناً وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نگاہ رکھتا ہے (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۳)

"اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے..... وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے..... اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے...... جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے" (سورۃ الحدید ۵۷۔ رکوع ۱)

"جہاں بھی تم ہو گے، اللہ تمہیں پالے گا۔ اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں..... اور اللہ تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے..... تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا، اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو"

(سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۸)

اس سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ خدا نے انسان کو صرف پیدا کر کے ہی نہیں چھوڑ دیا اور وہ ہر وقت اس سے صرف قریب ہی نہیں ہے بلکہ اس نے اس کی رہنمائی کا بھی ذمہ اپنے سر لیا ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس قربت کا حق کیونکر ادا کر سکتا ہے اور اس کی طرف رجوع ہو کر ایک دوسرے سے باہم دیگر ہونے کی کیا صورت ہے۔ خدا نے اس کی بھی نشاندہی قرآن میں مختلف مواقع پر مختلف طریقے سے کی ہے۔ جیسے کئی مواقع پر فرمایا گیا:۔

"یہ تمہاری دولت اور تمہاری اولاد نہیں ہے جو تمہیں ہم سے قریب کرتی ہو۔ ہاں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے انکے عمل کی دوہری جزا ہے اور وہ بلند و بالا عمارتوں میں اطمینان سے رہیں گے" (سورہ سبا ۳۴۔ آیت ۳۷) "(اے نبیؐ) کہو: اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے" (سورۃ الرعد ۱۳۔ رکوع ۴)

"وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے" (سورۃ الشوریٰ ۴۲۔ رکوع ۳)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ نیکوکاروں ہی کے ساتھ ہے" (سورۃ العنکبوت ۲۹۔ آیت ۶۹)

چونکہ عام انسانی ذہن خدا کی ہستی کا تصور آسانی سے نہیں کر سکتا اس لیے خدا سے قریب تر ہونے کی واحد سبیل جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہے وہ رسول اللہؐ

کی پیروی ہے۔ ایک موقع پر فرمایا گیا:۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہدو کہ: "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے"۔ ان سے کہو کہ: "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو"۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے، جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں" (سورۃ آل عمران ۳۔ رکوع ۴)

اقبالؔ نے انھی آیات کی ہو بہو ترجمانی "بانگ درا" کی نظم "جواب شکوہ" کے اس شعر میں کی ہے ؎

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی پس منظر میں دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کی قربت حاصل کرنے کے لیے اتباع رسولؐ کی اہمیت ایک موقع پر اس طرح بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے:۔

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا (اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ) ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے" (سورۃ الاحزاب ۳۳۔ آیت ۲۱)

زیر تجزیہ شعر کے دوسرے مصرعہ میں جب اقبالؔ یہ کہتے ہیں کہ: "خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے" تو وہ خدا اور انسان کے رشتوں کو قرآن کے پس منظر میں استوار کرنے کی تلقین کرتے ہیں جس طرح استوار کرنے کی ہدایت خدا نے دی ہے۔ جہانتک احتراز کرنے کی بات ہے تو خدا اپنے ایسے بندوں سے

ضرور احتراز کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتے یا اس کی خاطر مجاہدہ نہیں کرتے۔ اس لیے خدا نے ایسے بندوں سے احتراز کرنے کا ایک کلیہ سورہ آل عمران ۳ کے رکوع ۴ کی آیات میں (جو اس مضمون میں گزر چکی ہیں) صاف طور پر یہ مرتب کر دیا ہے کہ جو خدا کے عاشق بننے کا دعویٰ کرتے یا اس سے قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں انہیں پہلے رسول اللہؐ کا عاشق بننا ہوگا اور آپؐ کی دعوت قبول کرنی ہوگی، اور اگر وہ آپؐ کی دعوت قبول نہیں کرتے تو خدا صاف طور پر احتراز کی توجیہ بھی یہ کہہ کر پیش کر دیتا ہے کہ:۔

"پھر اگر وہ تمہاری (یعنی رسولؐ کی) دعوت قبول نہ کریں، تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔"

خدا سے قربت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تزکیہ نفس کے ذریعے مسلک عشق اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ یہ جذب کر لینے اور اپنے آپ میں سمو لینے کی خواہش کا دوسرا نام ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ کی سیرت میں جذب کر لینے والے عمل کا سبق موجود ہے۔ عشق کے بغیر خودی یعقوبؑ کا وہ بیت الحزن ہے جس میں وہ اپنے یوسف گم گشتہ کے فراق میں تڑپ رہا ہو۔ اس بیکراں کائنات میں عشق ہی وہ قوت ہے جو استعداد سے قوت پیدا کر دیتی ہے کہ زمین و آسمان کا فاصلہ ایک ہی جست میں طے ہو جاتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　　اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
(بال جبریل۔ غزل ۴۱)

اسی عشق کی بدولت جب مظاہر پرست آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں اور انسان حسن مطلق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے تو صرف کائنات کا طلسم ہی ٹوٹ نہیں جاتا بلکہ "استوا علی العرش" کے سارے عقدے خود بخود حل ہو جاتے ہیں اور جسے انسان عرش پر متمکن سمجھتا تھا اسے اپنے خانۂ دل میں مکین پا لیتا ہے۔

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر　　　تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے
(بانگ درا۔ "سرگزشت آدمؑ")

مصر کے مشہور ادیب و صحافی احمد حسن الزیات

از:
جناب ابوسفیان اصلاحی شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

ہفت روزہ مجلہ "الرسالہ" کے ایڈیٹر احمد حسین الزیات گو عظیم ادیب و مصنف نہیں ہیں تاہم اس ادبی مجلہ کی بدولت ان کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی، جس کے صفحات مصر کے ادیبوں، نقادوں اور شعرا کی نگارشات کے لیے وقف ہوتے تھے، بہت سے اہل قلم اسی رسالہ کی وجہ سے ادبی حلقوں میں روشناس ہوئے، اس مضمون میں ان کے حالات وکمالات پر بحث وگفتگو کی جائے گی۔

مختصر حالات احمد حسین الزیات "طلخا" کی ایک چھوٹی سی بستی "کفر دمیرۃ القدیم" میں ۱۸۸۵ء[1] (۱۶ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ) کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم "طلخا" میں ہوئی۔ اس کے بعد قاہرہ آکر جامعہ ازہر میں داخلہ لیا جہاں عربی اور دینی علوم حاصل کیے۔ پھر قدیم مصری یونیورسٹی گئے۔ مدرسۃ الفریر میں بھی عربی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ مدت قاہرہ کے "مدرسۃ الحقوق الفرنسیۃ" میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں قیام کے دوران فرانسیسی زبان بھی سیکھی، آخری امتحان پیرس میں ۱۹۲۵ء میں دیا۔

---

[1] احمد حسین الزیات کے لڑکے کے مطابق انکی تاریخ پیدائش ۱۸۸۶ء ہے اسکے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ "الاعلام" دار العلم للملایین۔ الطبعۃ الخامسۃ۔ بیروت ۱۹۸۰ء ص ۱/۱۱۳

احمد حسن الزیات بعض سرکاری اسکولوں میں عربی زبان و ادب کے درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ ۱۹۲۹ء میں بغداد کے "دار المعلمین العلیا" میں انہیں شعبۂ عربی ادب کا صدر مقرر کیا گیا جہاں اپنے سہ سالہ قیام کے دوران انھوں نے "العراق کما عرفتہ" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی لیکن اشاعت سے قبل ہی اسے نذر آتش کر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں مجلہ "الرسالہ" نکالا جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۳ء تک بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا رہا۔ اس کے بند ہونے کے بعد "الروایۃ" نکالا جو تھوڑی ہی مدت بعد بند ہو گیا[1]

تدریس کے دوران میں انھوں نے عربی ادب کی ایک مختصر تاریخ "تاریخ الادب العربی"[2] کے نام سے تصنیف کی جو بہت مقبول ہوئی[3]۔ اس کی اور دو فرانسیسی قصوں کے ترجمے کی اشاعت کے بعد ان کی شہرت بہت بڑھ گئی، ان میں سے ایک ترجمہ جرمنی شاعر گوئٹے کے "آلام فرتر" کا اور دوسرا فرانسیسی شاعر "لامرتین" کے "رفائیل" کا تھا۔ یہ دونوں ترجمے کے بجائے طبع زاد معلوم ہوتے تھے[4]

علمی اعزاز | احمد حسین الزیات خداداد صلاحیتوں کی بنا پر "المجمع العلمی" دمشق کے صدر کرد علی (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۳ء) نے پہلے انھیں ۱۹۲۶ء میں اکیڈمی کی ممبر شپ

---

[1] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۷۷۰ و المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۵ مزید دیکھیں الاعلام ۱/۱۱۳ [2] تاریخ الادب العربی کے دو ترجمے اردو میں ہوئے ایک ڈاکٹر طفیل احمد مدنی کا ہے جو ایلیان کمپنی الہ آباد سے پہلی بار ۱۹۲۹ء میں شایع ہوا اور دوسرا عبد الرحمان طاہر سورتی کا ہے جو ۱۹۶۱ء میں لاہور سے شایع ہوا [3] مجلہ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۷۷۰ [4] ایضاً ص ۷۷۰۔

قبول کرنے کی دعوت دی اور جون ۱۹۲۷ء میں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ان کا شاندار اور شایان شان خیر مقدم کیا۔[۱]

۱۹۴۹ء میں قاہرہ کی "مجمع اللغۃ العربیۃ" کے ممبر ہوئے۔ ان کا شمار اس اکیڈمی کے ممتاز ممبران میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مختلف علمی کمیٹیوں مثلاً "لجنۃ تیسیر الکتابۃ" "لجنۃ الفاظ الحضارۃ" "لجنۃ معجم الفاظ القرآن الکریم" "لجنۃ الادب" "لجنۃ اللھجات" "لجنۃ الاصول" اور "لجنۃ المعجم الکبیر" وغیرہ کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔ "المعجم الوسیط"[۲] کی ترتیب کے لیے جن چار افراد پر مشتمل کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ان میں ان کا نام بھی تھا بلکہ یہی کمیٹی کے صدر مقرر کیے گئے تھے جن کی نگرانی میں یہ کام بحسن وخوبی پایہ تکمیل کو پہنچا۔

۱۹۶۲ء میں وہ "المجلس الاعلی للادب والفنون والعلوم الاجتماعیۃ" کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں "الجمھوریۃ العربیۃ المتحدۃ" نے انہیں "الدولۃ التقدیریۃ" کے ایوارڈ سے نوازا۔[۳] ۱۹۶۳ء میں قدردانوں کے اصرار پر "الرسالہ" کا دوبارہ اجرا عمل میں آیا لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے یہ پھر بند ہو گیا۔[۴]

الرسالہ کے بند ہونے کے بعد تین سال تک مجلۃ "الروایۃ" کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے۔[۵]

---

[۱] مجلۃ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء)، ص ۶۸۱ [۲] المعجم الوسیط دو جلدوں پر مشتمل ہے جو "المکتبۃ العلمیۃ" طہران سے شایع ہوئی ہے جسے ابراہیم مصطفیٰ۔ احمد حسین الزیات، حامد عبدالقادر اور محمد علی النجار نے ترتیب دیا۔ [۳] مجلۃ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۶۸۱-۶۸۲ [۴] ایضاً ص ۶۸۰ [۵] احمد حسین الزیات۔ وحی الرسالہ۔ الطبعۃ الاولیٰ۔ مطبعۃ الرسالہ ۱۹۵۶ء ۴/ ۳۶۷۔

پھر مجلہ الازہر کے ۱۳۶۲ھ سے ۱۳۷۰ھ تک مدیر رہے[1] جس میں عقائد پابندی سے لکھتے رہے۔ انہیں ادباء اور شعراء کو اپنے گرد جمع کر لینے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔

الرسالہ کی بلند پائیگی | الرسالہ ادبی حیثیت سے بلند پایہ تھا جس کے گہرے اثرات عربی زبان و ادب پر پڑے[2] اور اس نے الزیات کو شہرۂ آفاق شخصیت کا حامل بنا دیا اس لیے اس کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۳۲ء میں جب بغداد سے الزیات قاہرہ واپس آئے تو اس وقت یہاں کوئی قابل ذکر ادبی رسالہ ایسا نہ تھا جو ارباب ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا۔[3] اس بنا پر الرسالہ کے ذریعہ انھوں نے تمام عرب ممالک کے خیالات کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی، اس میں عرب قومیت اور اسلام کی حمایت پر خاص توجہ مرکوز کی گئی۔ انور الجندی کا کہنا ہے کہ اس پر عربی اور اسلامی رنگ غالب تھا۔ اس کو سیاسی پہلو سے کوئی تعلق نہ تھا، وہ قومی ادب اور فرعونی کلچر سے ہمیشہ برسرپیکار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں "علی ہامش السیرۃ" اور "عبقریۃ محمد" جیسی نگارشات شائع ہوئیں۔ محمود محمد شاکر، سعید العریان (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۶۴ء) اور کامل محمود حبیب وغیرہ نے اس میں مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے۔ یہ تمام ادباء مصطفی صادق الرافعی کے خیالات سے متاثر تھے۔ عبد المنعم نے "مزامیر النفس العربیۃ" کے خلاف لکھا اور طنطاوی (۱۸۰۰ء۔ ۱۹۳۰ء) نے عرب قومیت اور اسلامی اقدار کے خلاف جو زہر اگلا تھا اسے رد کیا گیا۔ خود الزیات نے اسلامی اقدار پر اعلیٰ چیزیں لکھیں

---

[1] الاعلام ۱/۱۱۳ [2] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۵۵ [3] مجلۃ المجمع العلمی دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۷۷۶۔

اور عبقریۃ الاسلام سے متعلق "شا نو بریان" کی تصنیف کی تردید میں ایک کتاب لکھی الرسالہ نے "ہجرت" پر کئی خصوصی نمبر بھی نکالے۔

عرب قومیت اور اسلام کے مخالفین کے خلاف الرسالہ نے ہمیشہ علم بغاوت بلند کیا۔ عرب قومیت کے سلسلے میں اس نے میانہ روی اپنائی، نیز یہ بھی کہا کہ ۱۹۳۳ء کے بعد بھی ہمارے طریقۂ کار میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور ہم مغربی نظریات کو قبول کرنے میں غلو سے کام نہیں لیں گے[1]

الزیات کی متانت معاملات میں جلد بازی اور تشدد کو پسند نہیں کرتی تھی، اس زمانے میں سیاسی مکتب فکر سے وابستہ بعض اہل قلم ثقافت فراعنہ اور جدیدیت کے علمبردار تھے۔ اس مکتب فکر کے دو مصنفین کی جن دو کتابوں نے مصری معاشرہ میں خاص طور پر بحران پیدا کر رکھا تھا ان کے نام یہ ہیں "الشعر الجاہلی" اور "الاسلام واصول الحکم"۔ الرسالہ میں نہ قدیم ادب سے استفادہ کو معیوب قرار دیا گیا اور نہ جدید چیزوں کو تحقیق کے بعد قبول کرنے میں حرج تصور کیا گیا۔

"السیاسۃ" میں قدیم و جدید کے سلسلے میں جو نزاع برپا رہی وہ ایسی ہی تھی کہ کسی عمارت کی تعمیر سے قبل ہی اسے منہدم کرنے پر غور کر لیا جائے۔ الرسالہ نے قدیم وجدید اور مشرق و مغرب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی[2]

الرسالہ میں تاریخی، ادبی اور ثقافتی مسائل زیر بحث آتے۔ الزیات کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی[3] الرسالہ کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے

---

[1] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۰ [2] ایضاً ص ۶۵۵ [3] فی کتاب "ہذا مذہبی" بحوالہ المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۴ - ۶۶۵۔

لکھا ہے "ہمارا رسالہ سیاست سے پاک اور خالص ادبی مباحث پر مشتمل ہوگا اس میں اصحاب ذوق اور ارباب ادب کی تشفی اور قوم کی ہدایت ور وشنی کا سامان ہوگا"[1]

الرسالہ کے مضامین میں تنوع ہوتا۔ تنقید، انشائیہ، شاعری، افسانے اور دوسرے جدید اصناف ادب اس کے دائرۂ تحریر میں شامل تھے۔

طہ حسین ۱۹۲۳ء میں "حدیث الاربعاء" کے عنوان سے مجلہ السیاستہ میں اموی اور عباسی عہد کے اسلامی معاشرے پر لکھ رہے تھے اور ۱۹۳۳ء میں "علی ہامش السیرۃ" کے عنوان سے الرسالہ میں لکھنا شروع کیا جو فنی اعتبار سے ایک نئی چیز تھی۔ رافعی، عقاد، عبدالرحمٰن شکری، عبدالوہاب عزام (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۵۹ء) وغیرہ نے بھی بہت سے مقالات الرسالہ میں تحریر کیے[2] زکی مبارک نے "وحدت الوجود" اور فلسفیانہ نظریات کی تردید میں بہت سے مقالات لکھے۔ جواباً ان پر بھی تنقیدی مقالات شایع ہوئے[3] مشرقی عرب کی دوسری نسل کے ادیبوں میں سے بے شمار ادیبوں کی نگارشات الرسالہ کی زینت بنیں[4] رسول ایسی کتابیں قسط وار اس میں شایع ہوتی رہیں[5]

الرسالہ کے بارے میں یہ بات بغیر کسی خوفِ تردید کے کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنا ایک نیا طرز قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے مقالہ نگاروں کی ایک ایسی جماعت وابستہ رہی جس نے مستقبل میں عربی ادب کی نمایاں خدمات انجام دی۔

---

[1] فی کتاب "ہذا مذہبی" بحوالہ لمحات فی النظرۃ والتجدید فی النثر العربی۔ ۹۵ [2] ایضاً ص ۶۵۶-۶۵۷

[3] ایضاً ص ۶۶۲ [4] ایضاً ص ۶۶۳-۶۷۲ [5] ایضاً ص ۶۶۷۔

وفات | احمد حسن الزیات کی باکمال شخصیت ۱۲ جون ۱۹۶۸ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ ۱۳ جون ۱۹۶۸ء کو قاہرہ میں نماز جنازہ ہوئی جس میں مختلف مکتب فکر کے نمائندوں اور ادیبوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد ان کی نعش ان کے مسقط الراس "کفر دمیرۃ القدیم" میں لائی گئی اور وہیں تدفین ہوئی۔[1]

وہ اگرچہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن الرسالہ میں شایع ہونے والے ان کے مضامین و مقالات ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

زیات کی مقالہ نگاری | عربی مقالہ نگاری کی حیثیت سے احمد حسن الزیات عظمت وانفرادیت کے حامل تھے۔ انھوں نے تین مجلات "الرسالہ" (۱۹۳۳-۵۳ء)"الروایۃ" (۱۹۵۴-۵۶ء) اور "الازہر" (۱۳۷۲-۱۳۸۰ھ) کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ انکے مقالات کی چار جلدیں "وحی الرسالہ" کے نام سے منظرِ عام پر آچکی ہیں اس کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصل رجحان ادب کی جانب تھا[2] جس کی اشاعت و فروغ ان کی زندگی کا مقصد تھا، اسی غرض سے انھوں نے اپنا مجلہ "الرسالہ" بھی نکالا تھا۔ المدرسۃ الاعدادیہ میں تدریس کے زمانے ہی میں انھوں نے تصنیف و تالیف کے سلسلہ کا آغاز کر دیا تھا، الرسالہ کے اجرا کے بعد وہ ادیب کی حیثیت سے معروف ہوئے[3] انھوں نے بے شمار معاشرتی، مذہبی اور ادبی مقالات لکھے۔ وہ اسلامی وحدت کے بڑے حامی تھے۔ اس لیے ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرونا چاہتے تھے۔ دنیا کے کسی گوشے میں بسنے والے مسلمانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد تصور کرتے۔ وہ

---

[1] مجلۃ المجمع العلمی، دمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۴۸۲ [2] احمد حسن الزیات: وحی الرسالہ۔ الطبعۃ الاولیٰ۔ مطبعۃ الرسالہ ۱۹۵۶ء ۴/۱۱۸-۱۱۹ [3] ایضاً ۴/۱۱۹

خلافت عثمانیہ کے زبردست مؤید تھے۔ اسے مسلمانوں کی معراج تصور کرتے۔ ان کا ذوق دینی و مذہبی تھا۔ حمایت اسلام کے لیے ہمیشہ الرسالہ کے صفحات کو وقف رکھتے تھے۔

اسلام سے وابستگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عقاد، طٰہٰ حسین اور احمد امین کی طرح مغربی ادب کی اندھی تقلید نہیں کی۔ وہ مغربی علوم و فنون سے تجزیہ و تحلیل کے بعد ہی کوئی چیز اخذ کرتے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہمارا معاشرہ یورپ کی آغوش میں جا بیٹھا ہے اور ادیب حضرات انہیں کے نظریات کو عربی ادب میں فروغ دے رہے ہیں اس لیے یہ لوگ عربی ادب کی روح سے ناواقف ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جدید ادب کی بے اعتدالیوں سے نالاں اور کلاسیکل ادب سے استفادہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مصطفیٰ صادق الرافعی کی تحریروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

الزیات نے اپنے مقالات میں عربی زبان و ادب کے ارتقاء اور ترویج و اشاعت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ عرب ممالک کو اس کی تاکید کرتے کہ عربی زبان سے ہمارا ماضی، ہماری تاریخ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا مذہب وابستہ ہے قرآن کریم اور حدیث شریف عربی زبان میں ہیں۔ اس لیے ہمیں بہر حال اس زبان سے نہ صرف اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہیے بلکہ اس کے مستقبل کو خوب سے خوب تر بنانے کی کد و کاوش بھی کرنی چاہیے۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ عرب قومیت کی حمایت میں بھی مقالات تحریر کرتے رہے۔ ان کے نزدیک عرب قومیت کو عام مصری قومیتوں پر برتری حاصل ہے۔

انھوں نے عربی موضوعات پر خصوصی توجہ دی۔ اس سلسلے میں انہیں دوسرے

ادباء سے محاذ آرائی بھی کرنی پڑی۔ انھوں نے جب دیکھا کہ موجودہ صحافت زبان کے قواعد وضوابط پر توجہ نہیں دے رہی ہے تو اس کے خلاف علم احتجاج بلند کیا۔ عبدالقادر مازنی اور عباس محمود العقاد نے الزیات کے مقابلے میں تردیدی مقالات سپرد قلم کیے[1]

احمد حسن الزیات کے مقالات مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ جن کو تین موضوعات ادبی، معاشرتی اور مذہبی کے تحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ادبی مقالات | انھوں نے مختلف ادبی موضوعات کے علاوہ ادباء، شعراء اور ناقدین پر بھی اظہار خیال کیا۔ بہت سے انشائیے تحریر کیے۔ جدید و قدیم عربی ادب پر ان کی گہری نظر تھی اور انھوں نے ان دونوں کو موضوع بحث بنایا۔ بہت سی کتابوں پر ان کے تبصرے بھی چھپے۔ زیات کے مقالات سے ان کی جودت طبع، اپج، بالغ نظری اور ادبی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ابن سینا (۹۸۰–۱۰۳۷ء) عبدالعزیز فہمی (۱۸۷۰–۱۹۵۱ء) قاسم امین (۱۸۶۳–۱۹۰۸ء) احمد امین، محمد اقبال[2]، احمد لطفی السید، احمد ذکی پاشا (۱۸۶۷–۱۹۳۴ء) محمد عبدہ، حافظ ابراہیم، سعد زغلول پاشا، احمد شوقی، ابو الطیب المتنبی، مصطفیٰ لطفی المنفلوطی، محمد فرید وجدی (۱۸۷۵–۱۹۵۴ء) العقاد، مصطفیٰ عبدالرزاق بک، مصطفیٰ صادق الرافعی[3]، جمال الدین افغانی، علی محمود طہ، احمد عرابی (۱۸۴۱–۱۹۱۱ء) توفیق الحکیم، النقراشی (۱۸۸۸–۱۹۴۸ء)

---

[1] انور الجندی۔ المعارک الادبیۃ۔ مطبعۃ الرسالہ (بدون تاریخ) ص ۱۶۶

[2] احمد حسن الزیات: وحی الرسالہ ۴/۳۶۴–۳۶۵ [3] ایضاً الطبعۃ الخامسۃ۔ مطبعۃ الرسالہ۔ ۱۹۵۶ء ص ۱/تا ٹیل۔

عبدالقادر مازنی، مصطفیٰ کامل اور ابو العلا المعری[2] (۹۷۳ء-۱۰۵۷ء) وغیرہ کے نظریات و خیالات پر جو بحث کی ہے اس سے خود ان کے ادبی خیالات اور نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، اس لیے ذیل میں مذکورۂ بالا ادبا و شعرا اور ناقدین و مصلحین میں سے بعض کے متعلق ان کے خیالات پیش کیے جاتے ہیں

علی محمود طہ | وہ بیسویں صدی کے شاعر علی محمود طہ (۱۹۰۲ء-۱۹۴۹ء) کے متعلق کہتے ہیں میں علی سے ستائیس برس سے واقف ہوں جب میں نے انھیں منصورہ کی شاداب سرزمین پر دیکھا تھا، اس وقت وہ نوجوان ہونہار، بلند حوصلہ تھے، انکے خیالات سحر انگیز تھے، صرف جمال پسندی، تغزل اور لطف و لذت کے دلدادہ تھے اور زندگی کو آسمانی غزل کا حصہ سمجھتے تھے۔ جس کے گیت زمانہ گاتا ہے اور جس پر فلک وجد کرتا ہے[3]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علی محمود فطرت کے حسن و جمال کا شیدائی اور اس کی صناعی سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیتاب ہے، وہ فطری شاعر تھا جس کی شاعری حقیقت سے قریب اور عشق و محبت کے جذبات سے مملو ہے، زیات نے اپنے مقالہ میں علی محمود طہ کی شاعری کے علاوہ اس کی سیرت و شخصیت کے خط و خال بھی نمایاں کیے ہیں۔ ایک دوسرے مقالہ "علی محمود طہ بین اللحد والمھد" میں وہ کہتے ہیں کہ

علی محمود طہ کا پورا دن ساحل سمندر پر واقع ہوٹل میں گزرتا۔ دن بھر وہ کبھی لکھتا اور کبھی پڑھتا۔ یہی اس کا مشغلہ تھا اور جب کبھی اس سے فراغت ملی تو

---

[1] احمد حسن الزیات، الطبعۃ الثانیہ۔ مکتبہ نہضہ مصر ۱۹۵۶ ص ۳۰۳-۳۰۴ [2]

ایضاً الطبعۃ الرابعۃ۔ مطبعۃ الرسالہ۔ مصر ۱۹۵۸ء ۲/ صور [3] ایضاً ۲/ ۱۷۵۔

وہ افق بعید پر غائرانہ نظر ڈالتا اور اس سے فرصت پانے کے بعد ایک شاعر کے مانند وہ غور و فکر میں محو ہو جاتا ہے۔

ان دونوں مقالوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تنقیدی شعور کے حامل تھے اور ان کی تنقید میں استدلال کا رنگ ہوتا تھا۔ انھوں نے علی محمود طٰہ کے متعلق جو باتیں کہیں ہیں وہ حقیقت سے بہت قریب ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ الزیات نے بڑی وقت نظر اور باریک بینی سے علی محمود طٰہ کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔[1]

حافظ ابراہیم الزیات نے حافظ ابراہیم کی زندگی اور شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی تعمیری مقصد نہیں تھا۔ اس نے تمام چیزوں کا صرف ظاہری مشاہدہ کیا۔ ان کی گہرائی معلوم کرنے اور انکی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ حکمت و فلسفہ سے ناواقف ہے۔ اس کا مطالعہ اور دائرۂ تحقیق محدود ہے۔ اس کی زندگی مادیت سے عبارت ہے۔ مصر میں اس کی امیدیں خدیو کے آستانہ سے وابستہ رہیں اور وہ ہمیشہ خدیو عباس اور سلطان عبدالحمید کی قصیدہ خوانی میں مصروف رہا وہ امام محمد عبدہ اور ان کے ہمنواؤں سے اس بنا پر جا ملا کہ یہ حضرات برسر اقتدار انگریزوں کے محبوب تھے۔ اس دوران ملکہ وکٹوریہ کی شان میں قصیدہ کہا اور بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی بھی تعریف سے باز نہ آیا۔ اس کے بعد عوام کے وفد میں شامل ہوا مصطفیٰ کامل کے ساتھ رہا اور اپنے قصائد کے حوالے سے عوام کے اندر جذبہ وطنیت قومیت کو بیدار کیا حشمت پاشا کے حضور بھی مدحیہ قصیدہ پیش کیا۔ مختصر یہ ہے کہ حافظ ابراہیم کی

---

[1] وحی الرسالہ ۳/ ۲۰۸

توجہ کا مرکز وہ مقامات بنے جہاں سے اسے مادی منفعت کی امید وابستہ تھی۔ آخری ایام میں "وفد" پارٹی[1] سے وابستہ ہو گیا تھا[1]

حافظ ابراہیم کی ذہنیت اور شاعری کے بارے میں یہ اظہار خیال بجا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر کوئی شاعر درباروں اور آستانوں کا ہو کر رہ جائے تو اس کی شاعری میں تعمق، دقیق النظری اور گہرائی نہیں آسکتی۔ بلکہ اس کی نظریں صرف درباروں اور سلاطین کی جاہ و حشمت تک ہی محدود رہیں گی لیکن تاہم زیات کو اس کا اعتراف ہے کہ حافظ ابراہیم صاحب ذوق، پاک طینت اور زبردست قوت حافظہ کا مالک تھا جو اپنی صلاحیتوں کی بنا پر بادشاہوں کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل کر کے ان کی فیاضیوں اور داد و دہش سے متمتع بھی ہوتا تھا[2]

حافظ ابراہیم کی شاعری کے ضمن میں سلاطین کی مجالس کے بارے میں دلچسپ معلومات، ادیبوں کے اشعار و زبان دانی کے واقعات تحریر کیے ہیں۔

آخر میں الزیات نے لکھا ہے کہ نقائص کے باوجود حافظ کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید شاعری کی ابتدا کی۔ بارودی، حافظ، شوقی، صبری (۱۸۶۸ء۔۱۹۲۳ء) اور خلیل مطران کے زمرہ میں اس کا نام بھی آتا ہے، ان شعراء نے عربی شاعری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا، حافظ ابراہیم قدیم شاعری سے استفادہ کے قائل تھے، ان میں یک گونہ انفرادیت بھی ہے، انھوں نے آلام و مصائب اور قوم کے حالات کی اچھی تصویر کشی کی ہے[3]

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۲۶۳-۲۶۴ [2] ایضاً ۲/۲۶۴-۲۶۵ [3] ایضاً ۱/۲۶۵ [4] ایضاً ۱/۲۶۶۔

مصطفیٰ صادق رافعی

علی محمود طٰہٰ اور حافظ ابراہیم سے متعلق الزیات کے خیالات کو پیش کرنے کے بعد بیسویں صدی کے تین اہم ادیب مصطفیٰ صادق الرافعی، مصطفیٰ منفلوطی اور احمد امین کے بارے میں احمد حسن الزیات کے خیالات پیش کیے جائیں گے۔ ان تینوں میں ان کو رافعی کی تحریروں سے بڑی گہری وابستگی تھی اور یہ نظریاتی لحاظ سے ان سے ہم آہنگ بھی تھے۔

وہ رافعی کے اسلوب تحریر سے بہت متاثر تھے اور اسے مثالی اسلوب قرار دیتے تھے ان کے نزدیک حسد وجہل اور ماضی سے رشتہ جوڑے رکھنے کی بنا پر رافعی پر روایت پرستی کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔

ان کے بیان کے مطابق رافعی کا اسلوب داخلی اور خارجی عیوب سے پاک ہے اس میں سلاست، ایجاز اور گہرائی کی کارفرمائی ہے جو ان کی اپنی صلاحیت، خوش ذوقی اور ذہانت وذکاوت کا نتیجہ ہے۔ رافعی کی تحریروں سے فنی بلند پائیگی کا پتہ چلتا ہے۔ یہی قوت فنی ایک صاحب فن کی سب سے بڑی معراج ہے، یہی چیز اسے اختراع اور منظر کشی کی قوت عطا کرتی ہے، وہ مفرد لفظوں کو ویسے ہی آراستہ کرتا اور سجاتا ہے جس طرح کہ ایک مصور مختلف رنگوں سے تصاویر کی نوک و پلک درست کرتا ہے[۱]

رافعی چیزوں پر غور کرتے ہیں اور مکمل غور وخوض کے بعد ہی وہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں اور خیالات کو کم سے کم الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی ان کے یہاں خشکی محسوس ہونے

---

[۱] وحی الرسالہ ۱/۲۰۳۔

گئی ہے[1] رافعی کو عربی زبان وادب پر عبور حاصل تھا وہ عربی ادب کی باریکیاں سے واقف تھے۔ خدا نے انہیں تنقیدی بصیرت عطا کی تھی۔ نحو وصرف کے قواعد لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال اور جملوں میں ربط پیدا کرنے کے ماہر تھے[2]۔

رافعی نے عربی زبان وادب کے علاوہ کسی دوسری زبان وادب کو معیار و فخر قرار نہیں دیا۔ اس سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ الزیات نے عربی ادب کو معیاری اس لئے قرار دیا کہ قرآن کریم کا نزول اس زبان میں ہوا اور ادب و بلاغت کے نقطۂ نظر سے یہ الہامی اور دنیا کی سب سے شاہکار کتاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عظیم کتاب کے ہوتے ہوئے قدیم و جدید کی بحث کو انھوں نے لائق اعتناء تصور نہیں کیا[3]۔

رافعی کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے تمام ادبی و معاشرتی مسائل میں قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کی ہے اور قرآن ہی ان کی نظر میں دنیا کا سب سے عظیم فلسفہ ہے۔ انہیں نظریات کی وجہ سے ان کو ہدف ملامت بننا پڑا لیکن وہ ہر قسم کے طنز و تعریض کے باوجود اپنے موقف پر ثابت قدم رہ کر ملحدانہ نظریات کا جواب دیتے رہے۔

لطفی منفلوطی | لطفی منفلوطی اپنی دو کتابوں "النظرات" اور "العبرات" کی بدولت عربی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب و مصنف تھے۔ جن کو ان دونوں کتابوں نے شہرت دوام بخشی ہے۔ اہل ذوق ان کی لطافت و حلاوت سے برابر لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ الزیات بھی

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۳۸۸ [2] ایضاً ۱/۳۲۸ [3] ایضاً ۱/۳۵۰۔

منفلوطی کے اسلوب نگارش سے متاثر تھے۔ وہ رقمطراز ہیں:

"کان المنفلوطی قطعۃ موسیقیۃ فی ظاھرہ و باطنہ۔ فھو متوقف الخلق، متلائم الذوق، متناسق الفکر، متسق الاسلوب منجم الزی۔ لا تلمح فی قولہ ولا فی فعلہ شذوذ العبقریۃ ولا نشوز الفدامۃ۔ کان صحیح الفھم فی بطء، سلیم الفکر فی جھد، دقیق الحس فی سکون، عیوب اللسان فی تحفظ وھذہ الخلال تظھر صاحبھا للناس فی مظھر الغبی الجاھل فھو لذلک کان یتقی المجالس و یتجنب الجدل ویکرہ الخطابۃ۔"[1]

دراصل منفلوطی فطری ادیب تھے، اس میں ان کے ریاض و اکتساب کا کوئی دخل نہیں تھا، ریاضت، اکتساب اور کثرت مطالعہ سے کوئی ادیب ایجاد و اختراع اور انفرادی اسلوب کا مالک نہیں ہو سکتا ہے۔[2] منفلوطی کو ایجاد و اختراع کی صلاحیت مبدأ فیاض کی طرف سے ودیعت کی گئی تھی۔

قدماء میں منفلوطی، ابن مقفع اور ابن العمید سے متاثر ہوئے اور نئے ادباء میں خلیل جبران اور نعیمہ سے۔ ابن مقفع اور ابن العمید سے انداز تحریر لیا اور خلیل جبران و نعیمہ سے موضوعات کی جدت اور افکار کا تنوع اخذ کیا۔[3] لیکن انھوں نے دوسروں سے ماخوذ چیزوں کو بھی اپنے مخصوص رنگ میں کرلیا ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہوتی ہے۔

احمد امین | منفلوطی اور رافعی کے بعد آیئے دیکھیں کہ بیسویں صدی کے عقلیت پسند

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۳۹۲ [2] ایضاً ۱/۳۹۴ [3] ایضاً ۱/۳۹۵۔

ادیب احمد امین کے متعلق الزیات کا کیا خیال ہے۔ احمد امین کو دینی علوم اور عربی زبان پر قدرت حاصل تھی۔ انھیں ازہر کے ان نابغۂ روزگار علماء و ادباء میں شمار کیا جاتا ہے جنھیں دقیق النظر اور وسیع النظر تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ دینی حیثیت سے مجتہد اور لسانی نقطۂ نظر سے صاحب الرائے مانے گئے ہیں[1]

احمد امین نے اسلوب سے زیادہ مفہوم و معنی پر زور دیا ہے۔ افکار و خیالات کو ان کے یہاں اولیت حاصل تھی اور زبان کو محض ترسیل و ابلاغ کا ایک آلہ تصور کرتے تھے[2] انھوں نے اپنی تحریروں میں قرآن و حدیث سے بھی استدلال کیا۔ عربی شاعری اور نثر پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔ انہیں علم بیان و تنقید پر بھی عبور حاصل تھا۔ افکار و خیالات سے قطع نظر انھوں نے اپنی تحریروں میں حسن و دلآویزی بھی پیدا کی۔ الفاظ و معنی میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا انہیں اچھا سلیقہ تھا۔ جیسا کہ ان کی مشہور سرگزشت حیات "حیاتی" سے ظاہر ہے[3]

وہ ایک مستند و معتبر ادیب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے عربوں اور دنیا کے تمام مسلمانوں کو عقلیت پسندی کا درس دیا۔ ان کی شہرۂ آفاق کتابوں "فجر الاسلام"، "ظہر الاسلام" اور "ضحی الاسلام" میں یہی علمی، عقلی اور معروضی انداز پایا جاتا ہے۔ ان کتابوں کی تصنیف و تالیف میں انکی محنت شاقہ اور انکا خون جگر شامل ہے۔ ان سے ضلالت و گمراہی سے مامون رکھنے والی عقل اور حق کیطرف رہنمائی کرنے والی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور مختلف مذاہب و مکاتب فکر سے واقفیت ہوتی ہے[4]۔ احمد امین کی علمی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ورق گردانی میں صرف کر دی۔ مطالعہ کی کثرت سے انکی بصارت جاتی رہی۔ وہ ایک کسان کے بیٹے تھے لیکن اپنی محنت، لگن اور جوش و جذبہ عمل سے آفاقی شخصیت کے مالک ہو گئے۔

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۶۴، [2] ایضاً ۴/۱۴۶، [3] ایضاً ۴/۱۴۷، [4] ایضاً ۴/۱۴۷۔

ادب و معاشرہ | زیات کے یہاں ادب معاشرہ پر اثر انداز ہوکر اس کی تعمیر و تشکیل میں حصہ لیتا ہے وہ اپنے مقالہ "الامتیازات والادب" میں لکھتے ہیں ادب روح کی تعبیر، افکار کی وضاحت اور جذبات کی عکاسی کا نام ہے۔ زندگی کے ارتقائی مراحل اور نت نئی تبدیلیوں کے اثرات ضرور قبول کرتا ہے۔ یہ دراصل ان جہتوں کی تلاش کا نام ہے جن میں تعمیری پہلو پنہاں ہو۔ ادب کبھی انسانی جذبات میں اشتعال اور تلاطم پیدا کرتا ہے اور کبھی انہیں سرد اور منجمد کر دیتا ہے مسکراہٹیں اور تلخیاں دونوں عطا کرتا ہے۔ ادب کی نشو و نما میں معاشرہ کا بڑا حصہ ہوتا ہے، معاشرہ کے ضعف و انحلال، فساد و انتشار یا قوت، و استحکام اور صحت و درستگی کے اثرات ادب پر بھی مترتب ہوتے ہیں جس زمانے میں عربوں کی شجاعت کا چرچا ساری دنیا میں تھا اور وہ مجد و شرف سے ہمکنار تھے اس وقت ان کا ادب صداقت کا آئینہ دار تھا۔

قدیم زمانے کا عربی ادب حقائق اور سچائیوں کا ترجمان ہوتا تھا۔ لیکن موجودہ عربی ادب کا رشتہ اصل عربی ادب سے منقطع ہو گیا ہے اور اس نے یورپین ادب کلچر کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے اس لیے اس سے ہمارے اصلی احساسات و جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی اور یہ ہمارے مسائل و افکار اور مصائب و مشکلات کو پیش کرنے سے قاصر ہے کیونکہ دونوں کی قدروں میں مشرق و مغرب کی دوری ہے[1]

الزیات نے یورپین ادب کی اندھی تقلید کی ہمیشہ مخالفت کی، کیونکہ وہ عرب معاشرے پر منطبق نہیں ہو سکتا۔ جدید مصری ادب کے باب میں کہتے ہیں کہ

---

[1] وحی الرسالہ ۱/۱۲۴-۱۲۵۔

اس کی مثال اس جدید مصری معاشرہ کے مانند ہے جو اپنے وجود کو کھو بیٹھا اور اپنے امتیازات کو دریا برد کر چکا ہو، دوسری زبان کی اس طور سے پابندی کرنے کا بھی یہی انجام ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ غیر ملکی زبان کے عقائد بھی اس پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔

الزیات کا کہنا ہے کہ مصری معاشرے پر یورپی ادب کا انطباق جہالت کے مترادف ہے کیونکہ عرب اور یورپ کے مزاج میں تضاد ہے۔ مصری شعراء کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ صحرا کے بارے میں غور کریں نخلستان کی منظر کشی کریں۔ نہ کہ وہ انگریزی مزاج کی ترجمانی کریں۔ الزیات کے نزدیک فن کو اپنے ملک، اپنے معاشرے اور اپنی شخصیات کی ترجمانی کرنے والا ہونا چاہیے۔ اگر شعراء اپنے جذبات سے انحراف کریں تو ان کی شاعری لایعنی ہے۔ الزیات کو شکایت ہے کہ ہم اس مستعار ادب پر قانع ہو گئے ہیں جو ہمارے ذہن و دماغ پر مسلط کیا جا رہا ہے اور ہمارے کانوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ اس وقت مصری ادیب تمام چیزوں میں غیر ملکیوں کی پیروی کر رہے ہیں[1]

الزیات اپنے متعدد مقالات میں یورپین ادب سے کلی اتفاق کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ عربی زبان اور اس کے آداب و اصول کی حمایت میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ ادب کا مفہوم اور عربی و انگریزی ادب کا بنیادی فرق واضح کرتے ہوئے عربی ادیبوں اور شاعروں کے اس رویہ کا ذکر کرتے ہیں جو انگریزی اور مصری ادب کے سلسلے میں ان کا ہونا چاہیے۔ الزیات نے

---

[1] وحی الرسالہ ۱/ ۱۲۷۔

ادب سے متعلق اپنے ایک مقالہ میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ادب کا انقلاب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے اور اسے کامیاب بنانے میں اہل علم و ادب کا غیر معمولی حصہ ہوتا ہے۔

انقلاب کی راہ سیاست داں ہموار کرتے ہیں لیکن بعد میں اہل علم و ادب اس کو لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بنا دیتے ہیں۔ وہ ان کے دلوں کو انقلابی نعروں سے بھر دیتے ہیں۔ الزیات کہتے ہیں کہ قائدین اپنی سیاسی بصیرت، حسن تدبر اور لائحہ عمل سے دنیا کو متحیر کر دیتے ہیں اور ادباء اور شعراء بیان کی صداقت، زبان کی بلاغت اور استدلال کی قوت سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ کر دیتے ہیں جبکہ نہ انہیں سیاسی تعلیم دی گئی ہے نہ انھوں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے اور نہ ہی ان کو ادب کی تعلیم کے مواقع میسر آئے ہیں۔ لیکن جب انسان کے اندر جرأت و شجاعت کا عنصر پیدا ہوتا ہے تو یہ چیز اس کے اندر بلندی، خود اعتمادی اور روحانی طاقت کو مضبوط اور مستحکم کر دیتی ہے۔ آدمی کی فطرت پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہے اسی مناسبت سے اسے لقب بھی دیا جاتا ہے مثلاً انسان کو لیڈر، سیاست داں، مصلح، مصنف یا شاعر اس کے اندر کارفرما قوت ہی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ حضرت خالدؓ، حضرت معاویہؓ، نیپولین، سحبان، جاحظ، متنبی اور ہوجرو غیرہ کا شمار عبقریوں میں ہوتا ہے لیکن انکی قوتوں اور صلاحیتوں کے مدنظر انہیں مختلف القاب سے نوازا گیا[1]

احمد حسن الزیات کہتے ہیں کہ ادب اور انقلاب لازم و ملزوم ہیں۔ ادب

---

[1] وحی الرسالہ ۱/ ۲۵۴۔

فکری رہنمائی کا نام ہے اور انقلاب عملی کارکردگی کا۔ ادب ایک نظریہ ہے اور انقلاب ایک عزیمت کا نام ہے۔ جن لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کا اثر اہل انقلاب پر نہیں ہوتا وہ حق کے منکر اور حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں۔ آلام و مصائب میں جب سارے لوگ خاموش ہو جاتے ہیں تو ادب ہی اس وقت لوگوں میں بیداری پیدا کرتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ ملک کی قیادت و سیادت ظالم سلاطین کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے، جب گمراہ سیاست داں قوم کو ذلیل و خوار کر دیتے اور اس کے اندر انتشار برپا کر دیتے ہیں اور ترقی کی راہیں مسدود کر کے اسے بے حیائیوں کے اس موڑ پر کھڑا کر دیتے ہیں جہاں سے واپسی اور نجات کی کوئی سبیل نہیں ہوتی تو ان حالات میں ادب بھی جمود و تعطل کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن قوم کے اندر جب بیداری آئی اور اس کے قائدین جاگ اٹھے تو خاموشی ٹوٹی۔ ادیب پر لازم ہے کہ وہ انقلاب سے قبل اور انقلاب کے بعد بھی قوم کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے اور قوم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اہل قلم کے لیے ایسے مواقع فراہم کرے جن میں وہ آزادی کے ساتھ ملک و قوم کے حالات پر اظہار خیال کر سکیں اور اہل قلم کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ قوم کے ضمیر کو مردہ نہ ہونے دیں۔ اگر یہ دونوں گروہ اس طرح دوش بدوش جدوجہد کریں تو ایک تعمیری انقلاب برپا ہوگا[1] ہر زمانے میں ایسی مثالیں موجود رہی ہیں کہ اہل قلم نے عوام کے تعاون سے تاریخ اور زمانے کا رخ موڑ دیا ہے۔

(باقی)

---

[1] وحی الرسالہ ۱/

احوال قادر ولی عرف شاہ میراںؒ کا تحقیقی جایزہ

از جناب شاکرہ صاحبہ وجیانگر کالونی حیدرآباد

فروری ۱۹۹۱ء کے معارف میں اردو کی ایک قدیم مثنوی "احوال قادر ولی عرف شاہ میراں کا تحقیقی جائزہ" کے عنوان سے جناب ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب کا تحقیقی مضمون دلچسپی سے پڑھا۔ ندوی صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے جنوبی ہند کے دور دراز گوشہ کی ایک بزرگ ہستی کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں کتاب کے مصنف اور اس کے ممدوح کے بارے میں کچھ مزید معلومات ڈاکٹر صاحب اور قارئین معارف کی اطلاع کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔

جیسا کہ مثنوی کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی نگار کا نام اعز الدین اور تخلص نامی تھا۔ ان کے بارے میں حسب ذیل کتب و رسائل میں بھی مواد موجود ہے۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی : مدراس میں اردو۔ حیدرآباد ۱۹۳۸ء

۲۔ ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال : مدراس میں اردو ادب کی نشو و نما جلد اول ۱۹۷۹ء حیدرآباد۔

Mohd Yusuf Kokan-Arabic and Persian-۳

incarnatae Madras. 1974.

۴۔ رسالہ نوائے ادب: اپریل ۱۹۵۵ء مضمون سخاوت مرزا۔

اس کے علاوہ ان قدیم کتابوں میں بھی نامی کا تذکرہ موجود ہے۔

تذکرہ گلزار اعظم تذکرہ صبح وطن سخنوران بلند فکر	اول الذکر دونوں کتابیں نواب غلام غوث خاں کی تالیف ہیں اور تینوں مدراس سے طبع ہو چکی ہیں۔

مندرجہ بالا کتابوں میں اعز الدین خاں نامی کے جو حالات درج ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اعز الدین خاں کی پیدائش ۱۱۸۰ھ ۱۷۶۶ء میں ہوئی ان کا تاریخی نام غلام علی ہے۔ ان کے والد نواب حامد علی خاں مدراس کے والاجاہی خاندان کے مرزبوم گوپامئو کے رہنے والے تھے۔ ان کی نواب انور الدین خاں سے قرابت تھی۔ اعز الدین خاں کی شادی بھی والاجاہی خاندان ہی میں ہوئی تھی۔ وہ جنوبی ہند کے مشہور شاعر باقر آگاہ کے شاگرد تھے۔ نامی اور مستقیم تخلص تھا انھوں نے اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں مشق سخن کی ہے یہ نواب عمدۃ الامرا کے درباری شاعر تھے اور انہیں ملک الشعرا اور مستقیم جنگ کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔

نامی کے شعری سرمایہ میں دیوان کے علاوہ نوبہار عشق، بہارستان عشق، سلیمان نامہ، گنج قدرت، قصہ بی بی مریم اور داغستان کلفت وغیرہ شامل ہیں۔

مثنوی گنج قدرت ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء میں نامی نے لکھی تھی اس میں جنوبی ہند کی

ایک بزرگ شخصیت شیخ شاہ الحمید میراں عبدالقادر المتوفی ۹۷۸ھ کے حالات نظم کیے ہیں۔ یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں مدراس کے مطبع عزیزیہ سے شایع ہو چکی ہے۔

نامی کا انتقال ۱۸ جمادی الاول ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء کو مدراس میں ہوا۔ ساحل سمندر کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔ جہاں اب پریسیڈنسی کالج ہے (غالباً مزار محصور ہے)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے جس بے نام مثنوی کا تجزیہ کیا اور نمونہ دیا ہے وہ نامی کی گنج قدرت ہی ہے۔

متعلقہ مقامات میں کچی یا کوچی کا موجودہ نام کوچین ہی ہے۔ البتہ ننتم ہو سکتا ہے کہ متھم ہی کا بدلا ہوا نام ہو جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے۔

قادر ولی کے بارے میں بھی مندرجہ بالا کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ الحمید ۹۱۰ھ/۱۵۰۴ء میں مانک پور میں پیدا ہوئے اور کم عمری ہی میں دینی خدمت کے لیے وطن سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے گوالیار آئے وہاں سید محمد غوث گوالیاری م ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر حج و زیارت اور کئی ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے موجودہ ٹامل ناڈو سابقہ مدراس صوبہ کے شہر ناگور میں مقیم ہوئے اور یہیں وفات پائی۔ ان کی درگاہ اب بھی زیارت گاہ عام ہے اور عرس بہت دھوم دھام سے ہوتا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں بڑی عقیدت سے شریک ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ درگاہ ناگور کے بارے میں کچھ اور معلومات مندرجہ ماخذ

میں شامل ہیں The Dargah of Nagore and The culture of The Tamil Muslims by M. Abdur Raheman _ Additional Professer of Bulletin of The Institute of Traditional culture Madras. university of Madras 600005. India. Jan. To June. 1973

اس کا بھی خلاصہ پیش ہے

توزک والاجاہی مرتبہ برہان خاں ہانڈی کے مطابق جو ابتدائی انیسویں صدی عیسوی میں لکھا گیا ہے۔ قادر ولی سید محمد غوث گوالیاری کی ہدایت پر پہلے ترچناپلی نطرنگر (موجودہ ترچراپلی) میں نطرولی سے ملاقات کرکے ناگور پہنچے جس کا نام بعد میں انہیں کے نام پر قادر نگر رکھا گیا (یہ نام اب رائج نہیں ہے) قادر ولی کے حالات و کرامات میں عربی فارسی، اردو اور ٹامل میں کئی کتابیں ملتی ہیں۔ سب سے مشہور اور مقبول غلام قادر ناولار کی کنج الکرامات یا گنج الکرامات ہے جو ٹامل زبان میں ۱۸۸۹ء میں لکھی گئی۔ ممکن ہے کہ اسی کا کوئی دکھنی یا ٹامل نسخہ کنز الکرامات کے نام سے نامی کو دستیاب ہوا ہو۔ کیونکہ ٹامل میں ز کے بجائے ج ہی کا لفظ مستعمل ہے

پورے ساحل کارومنڈل پر جگہ جگہ مسلم اولیا یا شہیدوں کے مزارات ملتے ہیں جو اسلام کے ابتدائی دور میں آنے والے ان مسلمانوں کے ہو سکتے ہیں جو حملہ علائی سے بہت پہلے وسط ایشیا کے ملکوں سے جنوبی ہند کے ساحلوں پر پہونچے اور یہیں فوت ہوئے یا پھر پرتگیزیوں سے مقابلہ میں

شہید ہوئے ہوں۔ ان کے بارے میں تاریخی شہادت بہت کم ملتی ہے۔ معاصر تاریخیں اور سفرنامے جواب دستیاب ہیں وہ اس بارے میں خاموش ہیں (معاصر عربی تاریخوں میں شاید ہی ان کا ذکر ہوا ہو) بہرحال گنج الکرامات اور عوامی روایات کے مطابق قادر ولی تنجور کے اچیوت اپا نایک کے زمانے میں ناگور آئے۔ آپ کی دعا سے راجا کو ایک مزمن مرض سے شفا حاصل ہوئی اور ایک لڑکا بھی اس کی رانی کے یہاں پیدا ہوا۔ اس واقعہ کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اچیوت اپا نایک بیحد روادار راجہ تھا۔ جو مسلمانوں کو دوست رکھتا تھا البتہ پرتگیزیوں کے تبلیغی طریقوں اور مقامی لوگوں سے ان کے برتاؤ پر ناخوش رہتا تھا اور آگے چل کر دونوں میں لڑائی بھی ہوئی۔ راجا کی بیماری کا بھی مقامی ادب میں اشارہ ملتا ہے اور آگے کے دور میں یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ تنجاور کے مرہٹہ راجا قادر ولی کے عقیدت مند تھے، پرتاپ سنگھ (۱۷۳۹ء ۔ ۱۷۶۳ء) نے درگاہ کے اخراجات کے لیے پندرہ گاؤں دیے تھے اور اسی نے درگاہ اور اس کے ساتھ مسجد تعمیر کرائی تھی درگاہ کا مینار بھی اسی راجہ کا تعمیر کیا ہوا ہے۔

سرسوتی محل تنجور کے موڑی اور ٹامل اسناد سے ان راجاؤں کی درگاہ سے عقیدت اور فیاضانہ عطایا کا پتہ چلتا ہے۔

اس علاقہ میں ہندو مسلم یک جہتی کو قادر ولی کے روحانی اثرات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

بڑا اچھا ہوگا اگر ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صاحب اس موضوع پر مزید تحقیق و تفحص کریں۔

سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سیمنار

"علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر"

از ضیاء الدین اصلاحی

۲۹ اپریل تا یکم مئی ۱۹۹۰ء کو سرسید اکادمی علی گڑھ کی جانب سے مسلم یونیورسٹی میں اس کا تین روزہ سیمنار "علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر" کے عنوان سے ہوا، جس میں اتر پردیش، دہلی، بہار اور کیرالا کی یونیورسٹیوں کے فضلا شریک ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد جب مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں گھر گئے تو انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کیلئے علی گڑھ تحریک وجود میں آئی، اس کا مقصد ان کی نشأۃ ثانیہ اور ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و انقلاب برپا کرنا تھا چنانچہ مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر اس کے دوررس اثرات مترتب ہوئے اور تحریک سے علم و ادب کا فروغ اور اردو زبان کی مفید خدمت بھی انجام پائی، سیمنار میں ان تمام پہلوؤں پر مضامین پڑھے گئے، افتتاحی جلسہ کی صدارت پروفیسر محمد نسیم فاروقی وائس چانسلر نے کی، پروفیسر انوار الحق حقی نے کلیدی خطبہ دیا جو سیر حاصل تھا، سرسید اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر عتیق احمد صدیقی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں تحریک کے خط و خال نمایاں کیے اور سرسید اکادمی اور سیمنار کے اغراض و مقاصد بتائے۔

مقالات کے پانچ جلسے ہوئے، پہلا جلسہ علی گڑھ تحریک کے سیاسی پہلو پر پروفیسر ابو الفضل عثمانی کی صدارت میں ہوا، دوسرا علی گڑھ تحریک اور اردو زبان و ادب کے موضوع پر پروفیسر منظر عباس صدر شعبۂ اردو کی صدارت میں ہوا، علی گڑھ تحریک اور مذہبی فکر پر ہونے والے جلسہ کی صدارت راقم نے کی، علی گڑھ تحریک اور سماجی و تہذیبی اصلاح کا جلسہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) کی اور

علی گڑھ تحریک اور تعلیم کا پروفیسر عشرت فاروقی کی صدارت میں ہوا۔

راقم نے "علی گڑھ تحریک اور اس سے وابستہ ایک محب اردو۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق" پر اپنا مضمون پڑھا تو کچھ لوگوں کو حیرت ہوئی اور بعض نے طنز بھی کیا، راقم نے عرض کیا کہ میں نے مولوی صاحب کی اردو خدمات اور تحقیقی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اس میں مولانا شبلیؒ، مولانا ابوالکلامؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ پر ان کے بیجا اعتراض اور نکتہ چینی سے تعرض کا موقع نہیں تھا۔ اس جلسہ کے صدر پروفیسر منظر عباس نے مولانا شبلیؒ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید کے رفقا میں ان کو سب سے قدآور عالم، ادیب اور انشا پرداز بتایا۔

مجھے علی گڑھ تحریک اور مذہبی فکر کے موضوع پر ہونے والے جلسہ کی صدارت دے کر عجیب مشکل میں ڈال دیا گیا تھا کیونکہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے، سرسید کے انتقال کے بعد مولانا شبلیؒ جب لوگوں کے اصرار سے ان پر لکھنے کے لیے مجبور ہوئے تو سرسید احمد خاں اور اردو لٹریچر کے موضوع پر لکھا تاکہ ان کے مذہبی افکار و خیالات زیر بحث نہ آئیں، میں نے ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس بارے میں لوگوں کو ان سے اختلاف کا حق تو ہے لیکن ان کی تحقیر و استخفاف اور ان پر کوئی فتویٰ عائد کرنے کا حق نہیں، میں نے خطبات احمدیہ، سرسید کے عشق رسول، اخلاص اور نیک جذبہ کا ذکر کرکے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اسی کو دیکھے گا اور اس کی وجہ سے ان کی خطاؤں کو بھی معاف کر دے گا۔

سیمنار میں پڑھے جانے والے مقالات پر اچھی بحث و گفتگو ہوئی اور وہ اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر عتیق احمد صدیقی اور ان کے رفقائے کار کی سعی و جانفشانی سے کامیاب رہا، البتہ جلسوں میں حاضرین کی کم تعداد دیکھکر حیرت ہوئی۔

اخبار علمیہ

روس میں سن ۱۹۳۰ء میں اسٹالن کے حکم سے جب عربی حروف کا استعمال ممنوع ہوا تو حکومت نے عربی رسم الخط کی جگہ روسی رسم الخط کو رائج کر دیا، اس کے بعد وہاں قرآن مجید کی تعلیم و تدریس بھی موقوف ہوگئی، مگر اب روسی مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ عربی حروف و رسم الخط کو دوبارہ سرکاری حیثیت دی جائے، چنانچہ تاجکستان کی ریاست نے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک نئے قانون کے تحت روسی حروف کو موقوف کر دیا، وہاں کی نیشنل اکادمی روسی رسم الخط میں شایع شدہ بارہ ہزار اہم کتابوں کو عربی رسم الخط میں منتقل کر رہی ہے، داغستان، ازبکستان، ترکمنیہ اور آذربیجان میں بھی عربی رسم الخط سے تعلق و شیفتگی بڑھ رہی ہے۔ روسی ٹیلی ویژن پر پہلی بار امام بخاریؒ کی حیات مبارکہ پر ایک مذہبی سیریل بھی پیش کیا گیا جسے مصری ٹی وی کے تعاون سے تیار کیا گیا تھا، اس میں ان تمام مقامات کی تصویر کشی کی گئی جہاں امام بخاریؒ نے اپنی زندگی گزاری تھی، سیریل کی زبان عربی ہے مگر اس کے ساتھ روسی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

چین کے مسلمانوں کے حالات بھی روسی مسلمانوں سے مختلف نہیں، ان کی تعداد تقریباً ۵۰ ملین ہے تاہم اخبار و رسائل میں ان کے متعلق معلومات کم شایع ہوتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے وہ خود نام و نمود کے بغیر خاموشی اور یکسوئی سے اپنی زندگی کی تعمیر نو میں مصروف ہیں، روسی مسلمانوں کی طرح وہ بھی کمیونسٹ نظام

کے اندر اک آگ کے دریا سے گزرے ہیں لیکن موجودہ حالات کے نتیجہ میں بندشیں کچھ نرم ہوئیں اور مذہب، زبان اور ثقافت کے تحفظ کے لیے بعض مراعات بھی حاصل ہوئیں، پاکستان کے انگریزی ماہنامہ الفاروق انٹرنیشنل کے ایک پُر از معلومات مضمون سے معلوم ہوا کہ پورے چین میں ۲۵۰۰۰ سے زیادہ مساجد ہیں جن میں پندرہ ہزار صرف زن جیانگ XINJIANG میں ہیں، چند مسجدیں ساتویں آٹھویں صدی کی ہیں، قدیم ترین مسجد چین کے قدیم دارالسلطنت زیان میں ہے، وہاں کے ایک غیر مسلم حکمران نے آٹھویں صدی میں ایک مسجد تعمیر کی تھی جس کا شمار دنیا کی چند سب سے بڑی مسجدوں میں کیا جاسکتا ہے، چینی زبان کے علاوہ زن جیانگ کی مقامی زبان UIGHUR میں بھی قرآن مجید کے تراجم موجود ہیں، اس زبان کا رسم الخط سندھی زبان کے مشابہ ہے، مسلمانوں کے لیے حلال ذبیحہ کے لیے جدا مذابح بھی ہیں، اہم ریستورانوں، جہاز اور ریل وغیرہ میں بھی انکے لیے حلال ذبیحہ مہیا کیا جاتا ہے۔

لندن یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ ہند کے استاد پروفیسر اے ایل باشم کا ایک مجموعۂ مقالات 'دی اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف کلاسکل ہندوازم' کے نام سے ان کے انتقال کے بعد حال ہی میں شایع ہوا ہے' یہ ہندو مذہب کی تاریخ اور فلسفہ کو جاننے کے لیے بڑا معاون ہے۔ عقیدۂ تناسخ ان مقالات کا بنیادی و مرکزی نقطہ ہے، انکے خیال میں اسے قبائلی سماج کی بدامنی، عدم تحفظ اور مایوسی کی وجہ سے فروغ ہوا۔ انکی تحقیق کے مطابق رام جی کی پوجا حضرت عیسیٰؑ کے بعد شروع ہوئی، ہنومان کے تصور کی مقبولیت رزم نامۂ رام کے ساتھ ہوئی،

صرف گونڈ قبائل کی داستانوں میں چار بھائیوں کی کہانی میں ایک بندر کا ذکر ملتا ہے جس نے ایک پرشور دریا عبور کرانے میں ان بھائیوں کی مدد کی تھی وہ کہتے ہیں کہ بھگوت گیتا کی مذہبیت ایک نئے ہندو مت کی نقیب ہے جو پُرانوں کی پوجا سے جدا ہے۔

برہمن ہندوستان کی کل آبادی میں ۵ء۳% سے زیادہ نہیں ہیں لیکن علم، سائنس، انتظامیہ اور حکومت میں وہ ہمیشہ اعلیٰ مقام پر فائز رہے مہاراشٹر کے مسٹر اسپٹنی نے سرکاری ملازمتوں میں ان کے اور دوسروں کے اعداد و شمار کا یہ جائزہ پیش کیا ہے، برطانوی عہد میں حکومت کے عہدوں پر سب سے زیادہ کائستھ فائز تھے، اس وقت ان کا تناسب تقریباً ۴۰ فیصد تھا، اب وہ صرف ۷ فیصد رہ گئے ہیں، دور غلامی میں مسلمانوں کا تناسب ۳۵ فیصد تھا اور اب ۵ء۳ فیصد ہو گیا ہے، عیسائی، انگریزوں کے سایہ میں ۱۵ فیصد ملازمتوں میں تھے، اب وہ صرف ایک فیصد ہیں، اچھوت اور بیک ورڈ اس وقت صفر تھے اور اب ۹ فیصد ہیں، آزادی سے پہلے برہمنوں کی نمائندگی ۳ فیصد تھی، لیکن اب وہ ۷۰ فیصد محکموں پر چھائے ہوئے ہیں، ....

اعلیٰ درجہ کی ملازمتوں میں ۵۰۰ میں ۳۱۰ برہمن ہیں، ۲۶ اسٹیٹ چیف سکریٹریوں میں ۱۹، ۲۷ گورنروں اور لفٹیننٹ گورنروں میں ۱۳، سپریم کورٹ کے ۱۶ ججوں میں ۹، ہائی کورٹ کے ۳۳۰ ججوں میں

۴۳۸،۵۰ وائس چانسلروں میں ۹۸،۵۸ سفیروں میں ۱۴۰،۱۶۶ ضلع مجسٹریٹوں میں ۱۲۵۰ اور ۳۳۰۰ آئی اے ایس افسروں میں ۲۳۷۶ برہمن ہیں، لوک سبھا کے ۵۳۰ ممبروں میں سے ۱۹۰ اور راجیہ سبھا کے ۲۴۴ میں ۸۹ ممبر برہمن ہیں یعنی تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔

ملک کی کثیر آبادی کے اس استحصال پر لوگ چپ سادھے ہوئے تھے مگر اب اس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگی ہیں، بنگلور کے روزنامہ دکن ہیرالڈ میں پی ایس سریدھر مورتی کے ایک مراسلہ میں نہایت تلخی سے ریڈیوں شتکاروں، جاٹوں اور دکالیگاؤں کو دھرم میں شودر قرار دیے جانے کا ذکر ہے، حجام، ملاح، دھوبی اور مہتر وغیرہ بھی شودر میں اور یہ کل آبادی کا چالیس فیصد ہیں، ڈاکٹر کے، وی پٹ اپانے وید کے مطابق جب خود کو شودر پایا تو اعلان کر دیا کہ وہ ہندو ہی نہیں ہیں، آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی اور برہمو سماج کے راجہ رام موہن رائے نے صاف صاف کہا کہ ہندو مندر، ذات پات کی تفریق و امتیاز کا سب سے بڑا مرکز تھے اور ویدوں اور اپنشدوں میں مورتی پوجا کی کوئی بنیاد نہیں، ڈی کے پارٹی کے بانی ای، وی راما سوامی نے تمام مندروں کے انہدام کی آواز بلند کی ہے، تعلیم یافتہ دلتوں کی بھی یہی رائے ہے کیونکہ انکے آباء و اجداد کو انکی وجہ سے ذلت و رسوائی برداشت کرنی پڑتی تھی، مراسلہ نگار کے نزدیک اجودھیا کے مندر کا افسانہ سراسر بے بنیاد ہے جس کی تعمیر کا مطالبہ صرف ۱۵ فیصد لوگ کر رہے ہیں ہندوؤں کی اکثریت کو اس سے سروکار نہیں

مکتوبِ پاکستان

لاہور ۲۵ر اپریل ۱۹۹۱ء

محب فاضل و مکرم جناب اصلاحی صاحب

السلام علیکم۔ معارف کا تازہ شمارہ (اپریل ۱۹۹۱ء) کل ملا، اگرچہ مارچ کے شمارے کا ہنوز انتظار ہے۔ شاید یہ شمارہ لاہور میں کسی کو نہیں ملا[1]

آپ نے اخبار علمیہ کے تحت یورپ اور امریکہ میں اسلامی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کی کثرتِ تعداد پر اپنے استعجاب اور حیرت کا اظہار کیا ہے، لیکن اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ان ممالک کے سیاست کاروں اور دانشوروں کی انگلیاں ہمیشہ عالم اسلام کی نبض پر رہتی ہیں۔

یورپ اور امریکی یونیورسٹیاں اور دوسرے علمی ادارے اپنے ہاں کے طلبہ کو گرانقدر وظائف دے کر اسلامی ممالک میں مطالعہ اور علمی تحقیق کے لیے بھیجتے رہتے ہیں اور یہ طلبہ کئی کئی ماہ ان ممالک میں قیام کرکے دوست و دشمن اور موافق و مخالف شخصیات سے مل کر مفید مطلب معلومات حاصل کرکے اپنی حکومتوں کو پہونچاتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں کے اہل علم اسلامی ممالک میں آثار قدیمہ دیکھنے جاتے ہیں اور کسی علمی یا سیاسی شخصیت سے ملنا گوارا نہیں کرتے، پچھلے برس ایک امریکن اسکالر ہمارے اردو دائرہ

---

[1] معارف پابندی سے روانہ کیا جاتا ہے، لیکن محکمۂ ڈاک کی کرم فرمائیوں سے وہ اکثر قدردانوں کو نہیں ملتا۔

معارف اسلامیہ کا طریق کار دیکھنے لاہور آیا تھا اور وہ روانی سے اردو بولتا تھا۔

شاید آپ کو معلوم ہوگا کہ عربی کی نئی کتابیں، جو مراکش سے لے کر کویت تک کے عرب ممالک میں شایع ہوتی ہیں، ان کی دو ماہی فہرست مطبوعات امریکن لائبریری آف کانگرس کا ایک ذیلی دفتر واقعہ قاہرہ شایع کرتا ہے۔ ان کے علاوہ فرانس اور جرمنی میں عربی زبان و ادب، اسلامی تاریخ و ثقافت اور مسلم ممالک کے تازہ حالات پر اس کثرت سے کتابیں شایع ہوتی ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ گذشتہ برس اقبال کے جاوید نامہ کا فرانسیسی میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب ایک مصری عالم نے اس فرانسیسی ترجمہ کو عربی میں منتقل کر دیا ہے۔

قومیت عربی کی تحریک اور اس کے فروغ پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قلق اور اضطراب بالکل بجا اور صحیح ہے۔ موصوف کئی برسوں سے عالم عرب کو اس تحریک کی فتنہ انگیزی کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے ایک عراقی نمائندے یعنی صدام حسین نے عالم عرب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی ضد، ہٹ دھرمی، خود پسندی اور خود رائی نے امتِ عربیہ کو رو سیاہ کر دیا ہے۔

عرب قومیت کے فتنے کا توڑ اخوان المسلمون کی تحریک کر سکتی تھی، مگر افسوس ہے کہ یہ مفید تحریک بعض پرجوش اخوانی رہنماؤں کی جلد بازی اور انتہا پسندی اور مصری حکومت کے تشدد اور منتقم مزاجی سے جلد ہی دم توڑ گئی اور تحریک کے کارکنوں کو ناقابل بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم پر مولوی عمیر الصدیق صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے مگر وہ ایک بات لکھنی بھول گئے، یعنی مرحوم کانگرس کی کسی تحریک

میں گرفتار ہو کر قید و بند سے بھی دوچار ہوئے تھے

آپ معارف کے شذرات کو کتابی صورت میں شایع کر رہے ہیں، لیکن اس سے زیادہ اہم کام حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ مکاتیب وقت گزرنے کے ساتھ کہیں تلف اور ضایع نہ ہو جائیں[1]

میں نے ترجمان القرآن، لاہور (فروری ۱۹۹۱ء) میں مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی اور ان کی علمی خدمات پر ایک مضمون لکھا تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ مضمون آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ شاید یہ مضمون تذکرۃ المحدثین جلد چہارم میں کارآمد ہو سکے[2]

تذکرۃ المحدثین جلد سوم کا ابھی تک انتظار ہے۔ پچھلے خط میں آپ نے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہوگا۔

رفقائے کرام کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔

فقط والسلام

نیاز مند

(شیخ) نذیر حسین

---

[1] حضرت سید صاحبؒ کے نام بعض مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ جلد ہی شایع ہونے والا ہے، اس کے دیباچے میں ہم نے درخواست کی ہے کہ جن کے پاس حضرت سید صاحبؒ کے خطوط ہوں وہ ہم کو بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ اب یہی درخواست معارف کے ذریعہ کر رہے ہیں۔

[2] ضرور، مگر یہ شمارہ یہاں تک نہیں پہنچا۔ انشاء اللہ کہیں سے حاصل کر دوں گا۔

وفیات

آہ! مولانا عبدالملک جامعی مدنی

از مولانا افتخار فریدی، مراد آباد۔

یہ خبر انتہائی رنج اور صدمہ کے ساتھ سنی گئی کہ مہاجر مدینہ مولانا عبدالملک جامعی مدینہ منورہ میں انتقال فرما گئے۔ ان کی ذات گرامی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابقین اولین میں تھے اور اس کے کئی شعبے ان کی صلاحیتوں سے پروان چڑھے۔ مولانا، مولانا محمد علی جوہر کے فدائی اور خادم اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے محبوب شاگردوں میں سے تھے۔ حق بات کہنے میں کبھی ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔ اپنے استاد ذاکر صاحب سے بھی اس وقت کے امر کی ایک بات کہی تھی جس سے ذاکر صاحب رات بھر روتے رہے۔

مولانا عبدالملک کا بچپن اپنے والد منشی عبدالقیوم صاحب کیساتھ جو مشہور خطاط تھے بجنور میں گزرا جہاں سے مشہور زمانہ اخبار "مدینہ" نکلتا تھا۔ یہاں وہ کئی عبقری صحافیوں اور ہمدردان ملت کی خاص شفقتوں کے مورد رہے[1]۔ وہیں سے مولانا نے تحریک خلافت

---

[1] یہیں کے قیام میں انھوں نے مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ سے عربی کے چند سبق پڑھے، جس کا اعتراف انھوں نے اپنے بعض خطوط میں مجھ سے ممنونیت کے ساتھ کیا، مولانا اصلاحی ان دنوں مدینہ کے اڈیٹر تھے (معارف)

میں بھی حصہ لیا، مولانا کے والد محترم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں رہ کر "ترجمان القرآن" کی کتابت بہت ہی بے کسی کے عالم میں کی اور اسے مدینہ پریس بجنور میں طبع کرایا۔ دوسرا ایڈیشن لاہور میں طبع کرایا اور دونوں کا منافع مولانا آزاد کو پہنچایا۔

مولانا عبدالملک صاحب مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کے فدائی اور عاشق تھے اور ساری ایمان افروز تربیت انہیں سے حاصل کی تھی۔ فرمایا کرتے تھے مولانا محمد علی بیسویں صدی کے مرد مومن ہیں۔ ان کا تعلق مولانا کے خاندان کے ہر ہر فرد سے تھا۔ کراچی میں بھی ان کے نواسوں سے بڑی محبت کیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے تقریباً ۵ سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور حفظ قرآن کا نظام چلاتے رہے۔ مولانا کی زندگی بہت ہی بے کسی اور غربت میں گزری اور کبھی کوئی دنیاوی منفعت حاصل نہیں کی حتیٰ کہ مدینہ کے پچاس سالہ قیام کے دوران وہاں کی شہریت حاصل کرنے کیلئے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی جبکہ چاہتے تو یہ کام انتہائی آسان تھا دعوت و تبلیغ کے اہم ترین کام کا وہ ہمیشہ ان پر غالب رہا اور سخت سے سخت حالات اور صحت کی خرابی کے باوجود اسکی فکر فرماتے رہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل مرحوم نے راقم کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس میں اسکی بشارت دی تھی کہ روس چین اور ہندوستان کے ایک علاقے کو ہدایت ملے گی۔

مولانا مرحوم نے مدینہ اور اس کے اطراف میں حفظ قرآن کو فروغ دیا اور تحفیظ القرآن کے نام سے ایک ادارہ کی منظوری سعودی حکومت سے ایک ایسے وقت میں کرائی جبکہ حفظ قرآن کا نظام وہاں بے حد کمزور ہو گیا تھا۔ اب الحمدللہ اس ادارہ کی برکت سے مدینہ منورہ میں ایک لاکھ سے زیادہ قرآن مجید کے حفاظ موجود ہیں۔

خدا مولانا مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتبہ سے سرفراز فرمائے۔ آمین

مطبوعات جدیدہ

کاروان زندگی (حصہ چہارم) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۴۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر مکتبہ اسلام ۳۰ گوئن روڈ لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی آپ بیتی لکھنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، یہ اس کی چوتھی جلد ہے جو تین برسوں ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء تک کے واقعات وحوادث پر مشتمل ہے اس میں ملک وبیرون ملک کی مختلف دینی واصلاحی سرگرمیوں، اداروں اور تحریکوں، علمی سفر اور کانفرنسوں اور جلسوں کی روداد قلمبند کی گئی ہے، مولانا کے درد مند دل کو جس واقعہ نے بہت زیادہ تڑپایا اور بے چین کیا ہے وہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا مسئلہ ہے، اس کی وجہ سے انسانیت کا زیاں ہوا ہے، ملک تباہی وبربادی کے دہانے پر پہنچ گیا ہے اور امن وامان مفقود ہو گیا ہے، مولانا کے سحر طراز قلم نے اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی وحشت ودرندگی، نفرت وتشدد اور فرقہ وارانہ ماحول کی پوری تصویر کھینچ دی ہے اور بتایا ہے کہ معاملہ کو اتنا پیچیدہ اور اس حد تک بگاڑ دینے میں ہندو مسلم فرقوں کے لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی اور اہل سیاست کی کرتب بازی کو خاص دخل ہے، بابری مسجد کی اس انداز سے تحریک چلانے والے مسلم لیڈروں نے ہندوؤں میں مذہبی جوش پیدا کر دیا اور اپنی جذباتیت اور کوتاہ نظری سے غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کی راہ روک دی، مولانا نے بابری مسجد کے حل کے لیے اپنی اور اپنے بعض رفقا کی کوششوں اور مدراس کے شنکرا چاریہ سے ملاقات کا

ذکر کیا ہے اور اس کے تعلق سے اپنے اوپر ہونے والی نکتہ چینی کا جواب دیا ہے، دوسرا واقعہ جس پر مولانا کو سب سے زیادہ قلبی اذیت ہے وہ عالم عربی کا تازہ المیہ ہے جس کے خطرات کو ان سے زیادہ محسوس کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہے، روس کے موجودہ انقلاب ۱۹۸۹ء میں ہندوستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلی پھر وی۔پی سنگھ کی وزارت عظمیٰ سے سبکدوشی اور چندر شیکھر کے اس عہدہ پر فائز ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ان برسوں میں وفات پانے والے جن اہل تعلق کے حالات و کمالات بیان کر کے اپنے غیر معمولی رنج و ملال کا ذکر کیا ہے انکے نام یہ ہیں۔ پاکستانی صدر محمد ضیاء الحق، شیخ محمد صالح قزاز، مولانا حبیداللہ بلیاوی، ڈاکٹر محمد آصف قدوائی، شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری، پروفیسر مشیر الحق، میرواعظ مولوی محمد فاروق، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نیز اپنی اہلیہ اور عزیز بھائی سید احمد حسنی مرحوم فاضل مصنف بین الاقوامی شخصیت کے مالک اور عالمگیر شہرت کے حامل ہیں، ہندوستان اور عالم اسلام ہی نہیں یورپ، افریقہ اور امریکہ کی مختلف انجمنوں اور اداروں سے ان کا تعلق ہے۔ اس کتاب میں مختلف جگہوں کے سفر، جلسوں اور سیمناروں میں شرکت اور خطاب فرمانے کا ذکر ہے، ان تقریروں اور اپنی دوسری تحریروں کے جابجا اقتباسات بھی دیے ہیں، اپنی مشہور کتاب المرتضیٰ کی تالیف کے اسباب اور اسکی رسم اجرا کی تقریب کی روداد تحریر کی ہے، اصلاح وارشاد اور دعوت و تبلیغ مولانا کا خاص ذوق ہے جو کتاب میں ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ، اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور سرمایہ ملت کی نگہبانی کے علاوہ انسانیت کی فلاح و ترقی، ملک و قوم کی تعمیر و تشکیل اور ہندوستان کی عظمت و سرخروئی کے لیے مولانا کے جوش و خروش اور دلچسپی و سرگرمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے واقعات و حالات کو بے کم و کاست بیان کر کے اپنی آپ بیتی کو مستند تاریخی دستاویز بنا دیا ہے یہ انکے قلم کی شگفتگی و دلآویزی کا بھی عمدہ نمونہ ہے، اس میں اسماء و اعلام کا اشاریہ اور مکمل فہرست بھی دی گئی ہے۔ "ض"

نوائے مشرق از جناب سعید احمد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۹، قیمت ۳۰ روپیے، پتہ: تاج کمپنی ۱۵۰۳ ترکمان گیٹ دہلی

جناب سعید احمد لکچرر محمد حسن انٹر کالج جونپور، علامہ اقبال اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، دونوں کے شیدائی اور عقیدتمند ہیں، ان کی نظر میں ان دونوں مشاہیر کے فکر و نظر اور دل و دماغ میں یکسانیت ہے، بطور ثبوت انھوں نے کلیات اقبال کے ۱۱۵ اشعار کا انتخاب کیا اور ہر شعر کی ترجمانی مولانا مودودی کی تحریروں میں تلاش کرلی، ان کی یہ کوشش ندرت و افادیت سے خالی نہیں، البتہ ان کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ "اقبال پر ناقدین نے بہت کچھ لکھا ہے مگر کسی نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا" ان کی یہ رائے بھی مبہم ہے کہ "اقبال کا پیغام انقلاب کے پردوں میں چھپا رہ گیا بلکہ چھپا دیا گیا"، ان کے خیال میں ان کی دونوں ممدوح ہستیوں میں وہی فرق ہے جو لاکھ حکیم سربجیب اور ایک کلیم سربکف میں ہوتا ہے، خدا معلوم مدح و تحسین کی یہ کون سی قسم ہے تنقیحات کو ہر جگہ تنقیہات لکھا گیا ہے۔ جو کتابت کی غلطی ہوگی۔

نمود صبح از جناب تہور علی زیدی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت بہتر نیا، طباعت دیدہ زیب، صفحات ۲۰۲، قیمت پچاس روپیے، پتہ: درج نہیں۔

جناب تہور علی زیدی پاکستان کے خوش فکر و خوش گو شاعر ہیں، انھوں نے پاکستان بننے سے پہلے علی گڑھ و بلند شہر میں مسلم لیگ کی تحریک میں جوش و سرگرمی سے حصہ لیا، تقسیم کے بعد وہ حیدرآباد سندھ میں مقیم

ہوئے، اور سیاست کو خیر باد کہہ کر پیشہ طب کو خدمت خلق کا ذریعہ بنایا، شاعری انھوں نے اپنے عہد اور گرد وپیش کے حالات و واقعات اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے کی، زیر نظر مجموعہ ان کے پاکیزہ خیالات کا خوبصورت مرقع ہے، اس کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے کی گئی ہے اور آخر میں غزلیں دی گئی ہیں، نعتیہ اشعار میں ان کی طبیعت کی سرشاری اور جذبات کی وارفتگی نے بڑی تاثیر پیدا کردی ہے غزلوں میں بھی نعتیہ شعر آگئے ہیں، شروع میں ان کی صاحبزادی مہ جبیں زیدی کے قلم سے ان کا تعارف درج ہے، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی اور احمد ہمدانی کی مختصر تحریریں بھی مجموعہ میں شامل ہیں، باطنی محاسن کی طرح کتاب ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے، سرورق پر نمود صبح کی نہایت خوبصورت عکاسی ہے

شیشہ کے گھر از جناب محمد عبدالحکیم شرف قادری، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸ پتہ: مرکزی مجلس رضا، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۰۷ لاہور پاکستان۔

بعض اہل حدیث علماء نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی اور ان کے مکتب فکر کے لوگوں پر انگریزی حکومت سے سازباز کا الزام لگایا تھا، اس کتاب میں کہا گیا ہے کہ ع این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

رفیق منزل مولانا افضل حسین مرحوم نمبر، مدیر منور حسین فلاحی، صفحات ۱۴۴، کتابت و طباعت بہتر، قیمت دس روپیے، پتہ: رفیق منزل، ۲۳۰ ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جماعت اسلامی کے قدیم و مخلص رکن مولانا افضل حسین مرحوم پہلے درسگاہ

اسلامی رامپور کے ناظم اور آخر میں جماعت اسلامی کے قیم ہوئے وہ جماعت کے علاوہ دوسرے ملی کاموں میں بھی پیش پیش رہے، اور وہ حلقہ جماعت کے باہر کے لوگوں میں بھی مقبول تھے، دینی تعلیم و تربیت ان کا خاص موضوع تھا' بچوں کے ذہن، مزاج اور طبیعت کے مطابق اسلامی رنگ میں انھوں نے جو نصاب تیار کیا اسے اور ان کی کتاب' فن تعلیم و تربیت' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، جس کے متعدد ایڈیشن شایع ہوئے، ماہنامہ رفیق منزل نے مولانا کی وفات کے بعد ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے جس میں مولانا ابو اللیث اصلاحی مرحوم، مولانا وحید الدین خاں اور مختلف اصحاب قلم نے مولانا کی سیرت و شخصیت کے جلووں کو نمایاں کیا ہے، مولانا مرحوم کی ڈائری کے چند صفحات اور ان کا ایک اہم مضمون 'اقلیتی ممالک میں بچوں کی دینی تعلیم و تربیت' اور ان کے ایک خط کا عکس بھی اس نمبر میں شامل ہے۔

شعاع سالانہ میگزین انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول ماہم، مدیرہ، مس رحمانی محمود صفحات ۱۱۶، کتابت و طباعت، دیدہ زیب' قیمت درج نہیں، پتہ: انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول ماہم بمبئی ۴۰۰۰۱۶۔

انجمن اسلام گرلز پرائمری اسکول، بمبئی کا ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے پہلے اس کے سالانہ میگزین کونپل کے نام سے نکلتے تھے' یہ نیا میگزین شعاع کے نام سے شایع ہوا ہے جو مفید دینی و اخلاقی مضامین پر مشتمل ہے، اس کے لیے اسکول کی طالبات اور استانیاں تحسین و حوصلہ افزائی کی مستحق ہیں۔

ناشنیدہ مرتبہ ڈاکٹر طفیل احمد مدنی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۶۴ مجلد مع گردپوش قیمت ۴۰ روپیہ پتہ: عبداللہ سہیل ۱۸۰ منہاج پور، الٰہ آباد ۳

ڈاکٹر طفیل احمد مدنی ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر ہیں جو شعرا کی گروہ بندی اور ستایش وصلہ سے بے پروا ہوکر اپنے حال میں مست و سرشار رہتے ہیں، انکی شاعری اسی مستی و سرشاری کا نتیجہ ہے، ان کا میلان غزل کی طرف ہے، عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات کی ترجمانی میں بھی انکے یہاں عہد و ماحول کی تصویر ملتی ہے، انھوں نے غزل کی لطافت و دلکشی بھی باقی رکھی ہے، اردو فارسی اور عربی زبانوں پر اچھی نظر ہونے کی وجہ سے ان کا کلام اغلاط سے محفوظ ہے وہ معرفت و حقیقت کے لذت شناس ہیں اس لیے ناشنیدہ حقایق بھی انکے لیے شنیدہ کے مانند ہیں، یہ مجموعہ ادبی حلقوں کی پذیرائی کے لایق ہے۔ (ع۔ ص)

ضروری اطلاع

کاغذ اور طباعت کی دوسری اشیا کی بڑھتی ہوئی گرانی کے پیش نظر معارف کے زرتعاون میں اضافہ ناگزیر ہوگیا ہے، توقع ہے کہ یہ اضافہ اس کے قدردانوں کو گراں نہیں گذرے گا جون ۱۹۹۰ء سے زرتعاون درج ذیل شرح کے مطابق روانہ فرمائیں۔

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے۔ فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک سے پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

" " بحری ڈاک سے پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس۔ ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ کراچی ڈرافٹ "دارالمصنفین شبلی اکیڈمی" اعظم گڈھ کے نام سے بنوا کر بھیجیں۔

نوٹ: دارالمصنفین کی مطبوعات کی نئی قیمت معلوم کرنے کیلئے دفتر سے نئی فہرست طلب کریں "منیجر"

جلد ۱۴۷ ماہ ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۱ء - عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

شذرات

آہ! مسٹر راجیو گاندھی!!

کانگریس آئی کے صدر اور سابق وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کا وحشیانہ اور بے رحمانہ قتل ملک و قوم کا بڑا المناک سانحہ ہے، اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے، وہ مدراس کے انتخابی دورہ کے سلسلہ میں ۲۱ مئی کو دس بجے کے بعد رات میں سری پرمبودور کے ایک انتخابی جلسہ میں خطاب کرنے جارہے تھے تو کسی درندہ صفت، شقی القلب اور لئیم نے ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا، ان کی اس اذیت ناک موت نے ایک بار پھر ان کی والدہ مسز اندرا گاندھی اور قوم و ملک کے محسن گاندھی جی کی یاد تازہ کر دی، اور ہر انسان دوست اور محب وطن شخص یہ سوچنے لگا کہ گوتم بدھ اور گاندھی کے اس دیس میں کب تک راون اور ناتھورام گوڈسے ہنسا اور تشدد کی ریت قائم و دائم رکھیں گے

راجیو گاندھی ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے، دون اسکول میں ابتدائی و ثانوی تعلیم پانے کے بعد لندن گئے اور میکنیکل انجینیرنگ کا کورس کیا، ہندوستان واپس آکر ہوائی جہاز چلانے کی ٹریننگ لی، اور انڈین ایرلائنز سے وابستہ ہوئے، وہ ایک کامیاب پائلٹ تھے لیکن اپنے چھوٹے بھائی سنجے گاندھی کے ہوائی حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد انھیں اپنی والدہ کی مدد کے لیے سیاست میں آنا پڑا، ۱۹۸۱ء میں پہلی بار پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی مقرر کیے گئے، ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد وہ وزیر اعظم ہوئے، اسی سال انھوں نے قبل از وقت انتخاب کرایا اور پانچ برس تک وزارت عظمی کے منصب پر فائز رہے، ۱۹۸۹ء کے الکشن میں

گو ان کی پارٹی کو سب سے زیادہ سیٹیں ملیں تاہم انھوں نے حکومت کی تشکیل نہ کرکے اپوزیشن میں رہنا پسند کیا، ابھی ڈیڑھ برس بھی نہیں ہوئے تھے کہ پھر نئے انتخاب کی نوبت آگئی جس کے دوران ہی میں انھیں بم سے اڑا دیا گیا، دنیا کی جس زندگی پر انسان پھولا نہیں سماتا اس کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یہی حال ہے۔

مسٹر راجیو گاندھی کی ابھی عمر ہی کیا تھی، وہ اس ملک کے سب سے کم سن وزیر اعظم تھے طَرَفَتِیْ سَادَ الْعَشِیْرَۃَ اَمْرَدًا۔ ان کے سر پر وزارت عظمی کا تاج رکھا گیا تو پورے ہندوستان کا دل دھڑک رہا تھا، مگر کم سنی اور طویل سیاسی تجربہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ اور ملک اور پارٹی کا اتحاد برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے، ان کی قیادت میں ہونے والے پہلے انتخاب میں انھیں زبردست کامیابی ہوئی، ۸۹ء کے انتخاب میں واضح اکثریت نہ ملنے کے باوجود انھوں نے پارٹی کو انتشار سے بچایا، ان کی حکومت کے دونوں رخ ہیں، لیکن یہ ان کی بڑائی تھی کہ غلطی کے احساس کے بعد انھیں اس کا اعتراف کر لینے میں تامل نہیں ہوا، خیال تھا کہ دوبارہ برسراقتدار آنے پر وہ پچھلی غلطیوں سے سبق لیں گے اور ان کی تلافی کریں گے، اقلیتوں کے معاملہ میں فراخدلانہ رویہ اختیار کریں گے، جن کی تصویر ملک میں روز بروز بگڑتی ہی جارہی ہے، لیکن یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں اور ملک کے مستقبل پر ان کی موت سے دھند اور غبار چھا گیا۔

اس سنگدلانہ حادثہ کے پس پردہ جن لوگوں کا واقعی ہاتھ ہے ان کا سراغ لگنا مشکل ہے، اس سے پہلے دنیا کے بعض ملکوں کے سربراہوں کو اسی طرح لقمۂ اجل بنا دیا گیا، لیکن ان کے قتل کا راز سربستہ ہی رہا، کیونکہ اس قسم کے قتل کا رخ غیر متعلق لوگوں کی جانب اس طرح

موڑ دیا جاتا ہے کہ صحیح صورت حال سامنے نہ آئے، بہر حال یہ سوچی سمجھی گہری سازش ہے، جس میں بیرونی ملکوں کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن اس صورت میں بھی ملک کے بد باطن لوگوں کا اس میں ملوث ہونا یقینی ہے، یہ سانحہ جمہوریت اور ملک کے امن و استحکام کے لیے بھی ایک چیلنج ہے، سیاست پر سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں کے اثر و نفوذ بڑھ جانے کی وجہ سے آج جو انجام راجیو گاندھی کا ہوا ہے وہی دوسروں کا بھی ہو سکتا ہے، اس لیے تمام سیاسی پارٹیوں اور ملک کے سنجیدہ اور درد مند لوگوں کو اس کی روک تھام کے لیے کمر بستہ ہو جانا چاہیے ورنہ ملک تباہ ہو جائےگا

تھوڑے سے وقفہ کو چھوڑ کر ۱۹۴۷ء سے اب تک ملک کی باگ ڈور نہرو خاندان ہی میں رہی، راجیو گاندھی کے بچے ابھی چھوٹے ہیں جن کے سیاست میں آنے کا کوئی سوال نہیں، اس وقت وزارت عظمیٰ کے دعویدار تو بہت ہیں مگر ملک بڑے بحرانی دور سے گذر رہا ہے، ایک طرف مذہبی اور فرقہ وارانہ جنون حد سے بڑھ گیا ہے، دوسری جانب مہنگائی، گرانی، رشوت، چور بازاری اور کرپشن نے ملک کی چولیں ہلادی ہیں اور اس کی وحدت و سالمیت خطرے میں آگئی ہے، ایسے بحرانی وقت میں صاف ستھری اور مدبرانہ قیادت ہی ملک کو اس بحران و انتشار سے بچا سکتی ہے

دارالمصنفین کو راجیو گاندھی کی حسرتناک موت کا دوہرا غم ہے، ان کے ننھیال سے اس ادارہ کا گہرا تعلق رہا ہے، ان کے پرنانا پنڈت موتی لال نہرو اور نانا پنڈت جواہر لال نہرو اس کو اپنی تشریف آوری اور کرم سے برابر نوازتے رہے، موخر الذکر دارالمصنفین کے بڑے محسن اور لائف ممبر تھے، مسز اندرا گاندھی نے اپنے بزرگوں کی روایت برقرار رکھی، دارالمصنفین راجیو گاندھی کے سوگوار خاندان کے غم میں شریک ہے۔

یہ سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ انتخابی نتائج کی ابتدائی خبروں کے مطابق مرکز میں کانگریس کی حکومت کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں، البتہ بعض بڑے صوبوں میں رجعت پسند پارٹیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات تشویشناک ہیں۔

مقالات

تاج الدین محمود اشنہی

چھٹی ساتویں صدی ہجری کے عارف، شاعر و ادیب

از پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ

(۲)

اشنوی کی تصانیف اشنوی کی دو عارفانہ تصانیف نثر میں ہیں اور ان کے اشعار کا مجموعہ بھی تھا جو عارفانہ مضامین سے مملو ہوگا، لیکن مجموعہ مفقود ہے اور کم ہی اشعار موجود ہیں، اس کی بحث آگے آئے گی۔ نثری تصانیف یہ ہیں۔

(۱) **غایۃ الامکان فی درایۃ المکان**: اشنوی کا یہ رسالہ بہت مقبول رہا ہے اس کے متعدد نسخے ملتے ہیں، نجیب مائل ہروی نے اس کو اپنے رسالہ بنام مجموعہ آثار فارسی تاج الدین اشنوی میں شامل[۱] کرکے شایع کردیا ہے، یہ رسالہ نہایت محققانہ انداز میں مرتب ہوا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

غایۃ الامکان ایک مقدمہ اور تین فصل اصلی اور ایک فصل فرعی پر مشتمل ہے، مقدمہ بہت مختصر ہے جس میں حمد و تنزیہ کے بعد رسالہ کا سبب تالیف لکھا ہے،

۱؎ ص ۵۴ تا ۸۲۔

پہلی فصل توحید پر ہے، دوسری فصل میں مکان اور اس کے انواع کی بحث ملتی ہے، تیسری فصل میں زمان کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔[1]

"غایۃ الامکان" کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ مولف نے ایک ایسی خبر کو جس میں لفظ "مکان" آیا تھا، موضوع گفتگو قرار دیا، اس کی بنا پر بعض لوگوں نے اشنوی پر اتہام "تشبیہ" باندھا اور ان پر کفر کا فتویٰ لگایا، ان سے نمٹنے کے لیے اشنوی کو یہ رسالہ لکھنا پڑا، اس رسالے کی تالیف سے ان کو چنداں خوشی حاصل نہیں ہوئی، محض مخالفوں کا منہ بند کرنے اور الزام و اتہام کو رفع کرنے کے لیے اس رسالہ کو مرتب کیا۔

"ولیکن عذر در جلوہ کردن این مخدرۂ عذرا آنست کہ وقتی در اثنای سخن و حالتی گرم بر زبان ما برفت کہ لفظ مکان چون در اخبار آمدہ است انکار نباید کرد ولیکن مکان ہر چیزی بباید شناخت تا تشبیہ از راہ برخیزد پس جماعتی از کوردلان و شوربختان از سر تعصب و حسد و عناد وجود این کلمہ را دستاویز خود ساختند و رنجانیدن ما را میان دربستند و رقم تشبیہ بر ما کشیدند و بہ تکفیر ما فتوی بنوشتند، ناچار ما را بہر اظہار برارت ساخت خود از غبار تشبیہ این مخدرۂ عذرا بدان عیان بایست دادن و این یوسف با جمال را بدان کوردلان جلوہ بایست دادن، اگرچہ معلوم بود کہ درد تعصب و حسد درمان نپذیرد .... ولیکن نومید نیستم کہ صاحب دولتی از سر درد طلب درین مجموع نگرد و ازین گنج معرفت برخوردار

---

[1] ایضاً ص ۸۴۔

شود ما را به دعای خیر یاد کند، اکنون پیش از شروع در غرض این مجموع
فصلی در توحید بنویسیم تا عاقل منصف را معلوم شود که تشبیه در راه روندگان
خود امکان ندارد چه در چشم شهود ایشان خود هیچ چیز را وجود نیست و نتواند
بود، پس او را تعالی بچه مانند کنند چون با او هیچ چیز نیست"

[لیکن اس مخدرۂ عذرا (کنواری لڑکی) کو سامنے پیش کرنے کا عذر یہ ہے کہ ایک مرتبہ گفتگو کے دوران اور ایک خاص کیفیت کے وقت ہماری زبان پر آ گیا کہ لفظ "مکان" چونکہ حدیث میں آیا ہے، اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے لیکن ہر چیز کا "مکان" جان لینا چاہیے تاکہ تشبیہ ختم ہو جائے۔ پس سیہ دلوں اور بدبختوں کی ایک جماعت تعصب، حسد اور دشمنی و عناد کی بنا پر اس کلمے کو بنیاد بنا کر ہم کو رنج پہنچانے کے لیے آمادہ ہو گئی اور تشبیہ کا الزام ہم پر لگایا اور ہماری تکفیر کا فتوی لکھا مجبوراً اپنے میدان کو غبار تشبیہ سے برائت کے لیے اس کنواری کو ان حجروں کے اور اس خوبصورت یوسف کو ان سیہ دلوں کے سامنے پیش کیا، اگرچہ اچھی طرح معلوم ہے کہ تعصب اور حسد کا مرض لاعلاج ہے لیکن میں ناامید نہیں ہوں ایسے کہ ممکن ہے کوئی خوش نصیب "طلب" کی آرزو میں اس مجموعے پر نظر کرے اور معرفت کے خزانہ سے بہرہ ور ہو اور ہم کو دعائے خیر میں یاد رکھے۔

پس اس مجموعہ کے مقاصد شروع کرنے سے پہلے توحید پر ایک فصل لکھ رہا ہوں تاکہ انصاف کرنے والے دانشور کو معلوم ہو جائے کہ روندگان (سالک) کی راہ میں تشبیہ کا خود کوئی امکان نہیں اس لیے کہ ان (سالکوں) کی چشم شہود (ظاہری نظر) میں خود کسی چیز کا وجود نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ پس خدائے تعالیٰ کو کس چیز سے

تشبیہ دیں جبکہ اسکے ساتھ کوئی چیز نہیں]

بیان المکان[1] کی فصل اس طرح شروع ہوتی ہے:

امداد لطف الٰہی و امداد عطف پادشاہی نثار روزگار کسی باد کہ درین فصل بہ دیدۂ انصاف نگرد نہ بہ دیدۂ خلاف و مضمون آن را از راہ طلب حق تصفح کند نہ از راہ تتبع عثرات کہ پادشاہ تعالی غیور است، اسرار صمدیت خود با ہیچ جاحد و معاند در میان نہ نہد بلکہ عین ستر را سپر ستر گرداند و بہ نزدیک گویندۂ این کلمات آنست کہ در آسمان و زمین ہیچ سر عزیز تر و بزرگوار تر و پر فایدہ تر از سر زمان و مکان نیست چہ بیشتر اسرار کہ مشایخ طریقت و علماے حقیقت در آن سخن گفتہ اند اسرار کار حق تعالیٰ است و مکان و زمان، شناخت سر ذات و صفات اوست و ہر کہ زمان و مکان نشناسد او را از معرفت ذات و صفات مقدس بہرۂ بیشتر نباشد۔

[خدا کی مہربانی اور بادشاہ (کائنات) کی عنایت ایسے شخص کے شامل حال ہو جو اس فصل کو انصاف کی نظر سے دیکھتا ہے نہ کہ مخالف کی نظر سے اور اس کے مضمون پر حق کے حصول کی نیت سے غور و خوض کرتا ہے نہ کہ اس میں لغزش و خامی کی تحقیق و تلاش کے ارادہ سے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے، اپنی بے نیازی کے راز کسی منکر اور دشمن پر نہیں کھولتا، بلکہ راز ہی کو راز کے نہ ظاہر ہونے کا وسیلہ بناتا ہے اور راقم الحروف کے نزدیک بات یہ ہے کہ آسمان و زمین میں کوئی راز زمان و مکان کے اسرار سے زیادہ عزیز زیادہ اہم اور زیادہ فائدہ مند

---

[1] ص ۵۷-۶۲۔

نہیں اس لیے کہ بیشتر اسرار جن کے بارے میں مشائخ طریقت و علمائے حق نے لکھا ہے وہ حق تعالیٰ کے کاموں کے اسرار ہیں اور مکان و زمان اس کی ذات و صفات کے اسرار کا پہچاننا ہے اور جو شخص زمان و مکان کو نہیں جانتا اس کو خدا کی ذات و صفات کی معرفت کا زیادہ حصہ نہیں ملتا]

زمان اور کن فیکون کی معرفت کی فصل[1]

قولہ تعالیٰ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۴/۵۰) و قولہ تعالیٰ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۱۶/۴۰)

سوال اعتقاد اہل سنت و جماعت آنست کہ اللہ تعالیٰ مرید است بہ ارادت قدیم ازلی متعلق بہ ارادت نا متناہی و ارادت قدیم جز موجبہ نتواند بود و موجبہ آن باشد کہ حصول ہمہ مرادات بدو مقرون بود بدین رنگ، و معلوم است از مرادات، ازلی نیست چہ تعلق ارادت بہ چیزی، حدوث آن چیز اقتضا کند زیرا کہ تعلق ارادت بہ قدیم محال است، پس مرادات کہ تا ابد الآباد در وجود خواہد آمد متعلق ارادت موجبہ کہ در ازل الازال بود، چون تواند بود؟ و نیز از موجودات چیز ہست کہ شش ہزار سال موجود گشت و آن آسمان و زمین است کہ "فی ستۃ ایام" وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ (۷/۵۴، ۲۲/۴۷) و چیزی ہست کہ بہ چہل ہزار سال موجود گشت و آن آدم بود صلعم "خمرت طینۃ آدم بیدہ اربعین صباحا، پس کن فیکون کہ بہ چہل ہزار سال فرا دید آید، چگونہ دانیم"

---

[1] ص ۷۳ -

(اللہ تعالیٰ کا قول: اور ہمارا حکم یکبارگی ایسا ہو جائے گا جیسا آنکھوں کا جھپکنا
(ترجمہ) اللہ کا قول: ہم جس چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں پس اس کے ہمارا آتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ تو پیدا ہو جا پس وہ موجود ہو جاتی ہے۔

(سوال: اہل سنت و جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مرید[1] ہے ارادت ازلی قدیم کا جو متعلق ہے ارادت[2] نا متناہی کا، اور ارادت قدیم بجز موجبہ[3] کے نہیں ہو سکتی ہے اور موجبہ وہ ہے جس سے تمام مرادوں کا حصول بغیر ادنیٰ تاخیر کے وابستہ ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مراد کی کوئی چیز ازلی نہیں، اس لیے کہ کسی چیز سے ارادت کا تقاضا ہے کہ وہ چیز وجود میں آئے، بنا بریں ارادت کا تعلق قدیم سے محال ہے، پس وہ مرادات جو ہمیشہ ہمیش (ابد الآباد[4]) تک وجود میں آتی رہیں گی ان کا تعلق ارادت موجبہ سے جو ازل الازال[5] میں موجود تھی، کیونکر ہو سکتا ہے اور نیز موجودات میں ایسی چیزیں ہیں کہ چھ ہزار سال سے ہیں وہ آسمان و زمین ہیں جو چھ[6] دن میں پیدا ہوئے) اور بیشک[7] ایک دن اللہ کے نزدیک برابر ایک ہزار سال کے ہے، تم لوگوں کے شمار کے موافق اور ایک چیز ہے کہ چالیس ہزار سال

---

[1] خواہندہ، خدائی صفات میں ایک صفت ہے [2] ارادت: مشیت خواست خدا توجہ خاص مرید: مرشد [3] قضیہ موجبہ ایسا قضیہ جس میں ثبوت کا حکم موضوع پر محمول ہوتا ہے، جیسے انسان حیوان ہے یا انسان جماد نہیں ہے، [4] ابد جس کی انتہا نہ معلوم ہو، ابد الآباد ہمیشہ ہمیش [5] وہ وقت جس کی ابتدا نہ معلوم ہو۔ ازل اور ازل الازال ایک ہی معنی میں آتے ہیں [6] قرآن ۷: ۵۴ [7] قرآن ۲۲: ۴۷۔

پہلے سے ہے اور وہ حضرت آدمؑ کی ذات ہے، اس نے آدمؑ کا خمیر اپنے ہاتھ سے چالیس صبح تک گوندھا۔ پس کن فیکون (ہو پس ہو جاتا ہے)، جو چالیس ہزار سال سے وجود[۵] میں ہے اس کو کس طرح جانیں؟

تاج الدین اشنوی کے مرشد شمس الدین[۶] دیلمی تھے، وہ زمان و مکان کے بارے میں دقیق رائے رکھتے ہیں، ان کی اس رائے سے اشنوی بے حد متاثر تھے اور رسالہ غایۃ الامکان اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہے، اشنوی کا رسالہ کافی مشہور و مقبول ہوا، ہندوستانی عارفوں میں بھی یہ رسالہ مقبول تھا، نجیب مائل ہروی مولف مجموعۂ آثار فارسی تاج الدین اشنوی نے اس موضوع پر نہایت مفید مواد اکٹھا[۷] کر دیا ہے، اسی ضمن میں وہ لکھتے ہیں:[۸]

"چھٹی ساتویں صدی ہجری میں مورد بحث رسالہ (غایۃ الامکان) بر اعظم (ہند) کے صوفی مشائخ کے درمیان شہرت پا چکا تھا اور اس سرزمین کے بعض مشائخ کے ملفوظات، ور تصانیف میں اس رسالے کا تاثر نمایاں ہے، منجملہ ان کے شیخ محبوب الٰہی (م ۷۲۵ھ) ہیں، نذر[۹] صابری اور لطیف اللہ

---

[۵] فسرادید لفظ متن میں ہے جس کے معنی ظاہر نہیں ہیں۔ ....

[۶] ان کا پورا نام شمس الدین ابی ثابت محمد بن عبد الملک تھا، چھٹی صدی کے عارف تھے، لیکن ان کے حالات زیادہ نہیں ملتے، ان کی متعدد تصانیف کے نام ملتے ہیں، کچھ موجود بھی ہیں، لیکن کوئی چھپی نہیں، تفصیل کے لیے دیکھئے "مجموعۂ آثار فارسی" ص ۳۰۔ ۶۔ [۷] جزسہ نصوص تاریخی در معرفت زمان و مکان۔ مجموعہ آثار فارسی ص ۱۲۹۔ ۱۶۳ [۸] ایضاً ص ۲۰۔ ۲۱ [۹] نذر صابری صاحب نے ۱۹۶۱ میں غایۃ الامکان کا اردو ترجمہ مع ایک محققانہ مقدمہ کے (جس میں صحیح مصنف کا تعین ہوا ہے کیمبل پور سے شایع کر دیا، لیکن ۱۹۶۴ میں جناب (بقیہ حاشیہ ص ۴۱۲)

نے محبوب الٰہی کی غایۃ الامکان سے اثر پذیری تحریر[۱] اور "اقتباس" کے عنوان سے ظاہر کی ہے، لیکن راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ اثر پذیری تحریر یا اقتباس نہیں کہی جا سکتی، بلکہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زمان و مکان کے بارے میں خانقاہی مباحث کی غرض سے اشنوی کی تحریروں سے کچھ ناقص یادداشتیں تیار کر لی تھیں اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ "فضیلت مکان بر مکان و زمان بزمان" کے تعلق سے مستقلاً ان کے ملفوظات بھی ہیں[۲]، اور جب کہ سید محمد کرمانی معروف بہ میر خرد نے ان کے زمان و مکان کے متعلق ملفوظات کو اپنے تذکرہ میں شامل کیا تو ان کی یادداشتیں بھی میر خرد کے پیش نظر تھیں: چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں: "و بہ خط مبارک حضرت شیخ المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز بنشتہ (کذا) دیدہ ام"

سید اشرف سمنانی نے لطائف اشرفی میں جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ وہ اشنوی اور ان کے شیخ شمس الدین محمد بن عبد الملک دیلمی سے کتنے متاثر تھے ان کا قول[۳] ملاحظہ ہو:

"اور زمان کی حقیقت کے بارے میں کافی اقوال ہیں اور اس کی تحقیق شیخ شمس الدین محمد بن عبد الملک دیلمی کی کتابوں میں ہے جو اکابر مشائخ و محققین میں ہیں اور ان کے شاگرد شیخ محمود اشنوی نے ان حقایق کو رسالہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۱) لطیف اللہ نے اس رسالہ کو عین القضاۃ ہمدانی کے نام سے مع اردو ترجمہ چھاپا ہے یہ انتساب غلط ہے۔ مشکل کتابوں کو حشو و زوائد سے پاک کرکے آسان طرز میں لکھنا، تحریر اقلیدس، تحریر رصاف تحریر طوسی اسی قبیل کی کتابیں ہیں۔ [۱] دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی ص ۱۵۱-۱۵۴ [۲] ایضاً ص ۱۵۵، [۳]

غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان" میں جمع کردیا ہے اور یہ رسالہ اللہ کی معرفت اور اس کی صفات میں در یتیم ہے"۔

سید اشرف سمنانی آٹھویں صدی کے بزرگ ہیں، ان کا مزار کچھوچھہ ضلع فیض آباد (یو۔پی) میں مرجع خلائق ہے، ان کی دو تصانیف: لطائف اشرفی و مکتوبات اشرفی عرفانی، تاریخی و سیاسی معلومات کا خزانہ ہیں۔

(۲) **پاسخ بہ چند پرسش**: اشنوی کی دوسری تالیف دراصل وہ جوابات ہیں جو انھوں نے پانچ سوالوں کے دیے تھے، یہ سوالات ان سے ان کے بعض ساتھیوں نے مکہ اور مدینہ کی راہ میں کیے تھے، یہ جوابات عربی زبان میں تھے جن کو اسماعیل بن[۱] عبد المومن اصفہانی مرید شیخ زین الدین[۲] عبد السلام کاموی اور مترجم عوارف[۳] المعارف نے فارسی کا جامہ پہنایا تھا۔

رسالۂ پاسخ[۴] بہ چند پرسش کا موضوع تین لطایف سے متعلق ہے جن کی معرفت عارف کے نزدیک حق تعالیٰ کی معرفت کا زینہ ہے یعنی نفس و دل و سر، چنانچہ

---

[۱] ابومنصور ماشادہ اصفہانی کے خاندان سے تھے، جو چھٹی اور ساتویں صدی میں اصفہان کا مشہور علمی و سیاسی خاندان تھا، اس کا پورا نام اسماعیل بن عبد المومن بن اسماعیل بن ابومنصور ماشادہ تھا، اس خاندان کے دیگر افراد کے لیے دیکھئے مجموعہ اشعار فارسی ص ۳۰۔

[۲] شہاب الدین سہروردی کے مرید تھے، ان کے لیے دیکھئے' ایضاً ص ۳۰۔۳۴

[۳] یہ ترجمہ ۶۶۵ھ میں ہوا، اس کو سب سے پہلے راقم نے مجلہ بیاض میں ۱۹۶۵ میں متعارف کرایا ہے، اسماعیل بن عبد المومن کی دوسری تصنیف ترتیب تحریر و تقریر صدر الدین محمد اشنوی تھی، دیکھئے مجموعہ اشعار فارسی ص ۴۳ [۴] یہ ترجمہ ہے نجیب مائل ہروی کے خلاصہ کا، دیکھئے ایضاً ص ۴۳۔

دیدہ ور اور عارف محققین نے اشنوی سے حد نفس و دل و سر اور دل اور روح و ستر اور روح کے تعلق کے بارے میں اشنوی سے پوچھا ہے، اشنوی نے جو محققانہ جوابات دیے ہیں ان میں بڑا عمق ہے، اشنوی نے نفس کو ذات اور انسان کی حقیقت بتایا ہے، انسان کا فرض ہے کہ کسب معرفت کرے اور امانت الٰہی کو پہچانے، اور لطافت اور کثافت، شرافت اور خست کے اعتبار سے صفات و مراتب امارگی، لوامگی اور مطمئنگی کو قبول کرے اور دل کو غیبی لطیفہ سمجھے کیونکہ وہی روح حیوانی کا منبع اور وجود مطلق کی محبت کی جگہ ہے، سر دل کا لطیف و باریک اشارہ ہے جو روح انسانی کی قابلیت اور مکاشفات و مشاہدات کی صلاحیت رکھتا ہے، ان نکات کی تشریح و توضیح کے بعد اشنوی نے بیشتر اطوار قلب کی طرف توجہ کی ہے اور سر خفی جو نہایت لطیف ہے اور عارف کا انوار حق میں فنا ہو جانا اسی کی خاصیت سے وابستہ ہے، کی تحقیق کی ہے،

ذیل میں خود اصل سوال اور جواب بہت مختصر طور پر بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں۔

سوال اول[1]: آنست کہ حد نفس چیست و حقیقت و ماہیت آن چگونہ است؟"

سوال دوم: آنست کہ چون بیان کردی کہ حد نفس چیست.. بفرمای کہ حد دل چیست، این گوشت پارہ صنوبری کہ در پہلوی چپ است یا چیزی دیگر؟......

سوال سوم: حد سر چیست و حقیقت آن چیست؟

سوال چہارم: بعضی مشایخ اختلاف کردہ اند در نفس و دل و روح بعضی

---

[1] دیکھیے مجموعۂ آثار فارسی ص ۸۳ - ۹۵۔

گفتہ اند ہمہ یکی است و اختلاف نامہا بحسب مقام و احوال است و بعضی گفتہ اند ہر یکی را حقیقتی و ہر یک دیگر است، شیخ درین چہ فرماید ؟

سوال پنجم : مشایخ سوال کردہ اند رتبت سر و روح، بعضی گفتہ اند رتبت سر بالا ست و بعضی گفتہ اند رتبت روح بالا ست، شیخ درین چہ فرماید

جواب کا انداز یہ ہے ۔

بدانکہ این ہر پنج سوال فرع معرفت است، یعنی معرفت نفس اصل است و اینہای دیگر فرع و چون معرفت اصل حاصل آید معرفت فرع ظاہر گردد و معرفت نفس مسألۂ دشوار است و شرح آن بغایت غامض و باریک، چنانکہ مرغ سخن درین ہوائی پر و بال بماند و مرکب عبارت درین میدان از جولان باز ماند و این اشکال عجب نیست زیراکہ در عالم غیب و شہادت بعد از معرفت حق تعالیٰ ہیچ معرفت غامض تر و مشکل تر از معرفت نفس نیست و ہر آئینہ چنین باشد کہ معرفت نفس نردبان معرفت حق است ۔ الخ

آپ ملاحظہ کریں گے کہ ایسے عارفانہ مسائل کو جو بڑی حد تک فلسفیانہ طرز استدلال رکھتے ہیں، کیسے صاف اور سیدھے طرز میں بیان ہوئے ہیں، عام صلاحیت کا آدمی گو مطالب کی تہ تک نہ پہنچے گا لیکن عبارت کی تفہیم میں کوئی دشواری نہ ہوگی ۔

اشنوی کی شاعری | اشنوی بیشک شاعری کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور ان کے جو اشعار باقی رہ گئے ہیں ان سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ وہ صاحب دیوان شاعر ہوں گے، راقم حروف نے ۱۹۴۷-۸ میں ان کے اشعار جو اسمٰعیل

بن عبد المومن اصفہانی نے ترجمۂ عوارف المعارف (تالیف ۶۶۵ھ) میں درج کیے اور جن کی نسبت میں کوئی شک نہ تھا، الگ کر کے اپنے مضمون : ترجمہ قدیمی از عوارف المعارف (بیاض، ۱۹۷۰) میں شایع کر دیے تھے، البتہ مجھے کتابخانہ مجلس شورائے ملی کے سفینۂ اشعار کا مخطوطہ باوجود کوشش کے نہیں مل سکا جیساکہ میں نے اپنے مقالے کے ص ۱۳۱ کے حاشیے میں واضح کر دیا ہے، خوشی کی بات ہے کہ نجیب مائل ہروی کو یہ سفینہ بھی ہاتھ لگ گیا اور ان دونوں کی مدد سے انھوں نے ۲۵ فارسی غزلوں اور ایک عربی نظم کو شایع کر دیا ہے ان دو اہم ماخذ کے علاوہ رسالۂ غایۃ الامکان میں دو عربی بیت اور روح الجنان میں دو فارسی بیت اور خرابات ضیا پاشا دو فارسی بیت درج ہیں، ان سب کو ملا کر ۲۵ فارسی غزلیں اور دو عربی بیتیں ہوتی ہیں، راقم کو تین اور منابع کا پتا چلا ہے ایک روضۃ الناظر تالیف[1] عزیز کاشی اور دوسری کتاب نزہۃ[2] المجالس اور تیسرا ماخذ خلاصۃ الاشعار[3] ہے روضۃ الناظر میں مطبوعہ غزل ۳ کی تین ابیات درج ہیں اور نزہۃ المجالس[4] میں حسب ذیل

---

[1] اوائل قرن ہشتم کا مجموعہ ہے، دیکھیے نزہۃ المجالس ص ۶۸ [2] یہ رباعیات کا ایک قدیم مجموعہ ہے جس کا مرتب خلیل شروانی ہے اور سال ترتیب ۷۲۲ھ کے کچھ بعد ہے اس میں ۴۱۳۹ رباعیاں ہیں جو ۲۰۹ شعرا کی ہیں، شروان شاہ کے لیے ۱۰ باب کے ذیل میں مرتب ہوا، اسکا واحد نسخہ مکتوبہ ۷۳۱ کتابخانہ سلیمانیہ استنبول میں اس کی رو سے دکتر محمد امین ریاحی ۱۳۶۶ھ نہایت محققانہ انداز میں اس کو تہران سے شایع کر دیا ہے .... [3] خلاصۃ الاشعار کے اس نسخے میں جو بانکی پور پٹنہ لائبریری میں ہے اس میں تاج الدین اشنوی کی دو غزلیں ہیں، ایک تو عوارف المعارف و مجموعہ رسالہ فارسی میں درج ہے، دوسری عوارف میں (صرف ۵ بیت) بغیر شاعر کے ذکر کے (ص ۱۳۳ - ۱۳۵) ہے، جبکہ مکمل غزل خلاصۃ الاشعار میں نقل ہے [4] ص ۱۶۰ رباعی ۲۶

زاید عارفانہ رباعی ذیل شیخ تاج الدین اشنی درج ہے:

دوش این دل ما جامۂ جان شق می زد | خیمہ ز بر طارم ازرق می زد
اندر نظرش چو ہیچ موجود نماند | بی واسطۂ دم انا الحق می زد

اشنوی کی شاعری عارفانہ رنگ کی ہے، ان کا طرز سادہ و شگفتہ ہے، یہ غزلیں اتنی پر تاثیر ہیں کہ کبھی کبھی ان کا تامل میں مولانا رومی سے جا ملتا ہے، لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بیشتر غزلیں ترجمہ عوارف کے مطالب کی توضیح کے سلسلے میں نقل ہیں جن کو عارفانہ ہونا ہی چاہیے اور قدیم سفینہ میں جو نظمیں درج ہیں وہ بھی اسی رنگ میں ہیں، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اشنوی نے عارفانہ رنگ میں لکھا ہے اور چونکہ وہ ایک جانے پہچانے عارف اور صوفی تھے تو ان کی شاعری بھی اسی رنگ میں ہونا چاہیے، لیکن بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں توانائی اور کشش ہے اور باوجود سادگی کے اگر کوئی کلام پر کشش ہو تو اس سے شاعر کا کمال ظاہر ہوتا ہے، ذیل میں چند غزلیں[۱] درج کی جاتی ہیں:

اگر تن است بجز خستۂ بلائی تو نیست | دگر دلست بجز بستہ ولای تو نیست
ز فرق تا بقدم ذرۂ نمی بینم | کہ آن از آن تو ای دوست یا برای تو نیست
ز نقش نفس تہی کردہ ام سرا پۂ دل | ولی چہ سود کہ در خورد کبریای تو نیست
مرا ز غیرت گنجی ز غیر یار بہ بر | ز جان و دل ببرم گر در آن رضای تو نیست
اگر کسی است کہ قارون گنجہای غم است | بہ زیر گنبد گردون، جز این گدای تو نیست
بہ مرحبائی بنواز خستہ جان مرا | کہ ہیچ مرہمی او را چو مرحبائی تو نیست

[۱] ص ۹۵-۱۱۶-

ز راهش ای دل زنجیر پای باز مکش
اگرچه دانم کاین بادیه به پای تو نیست

زورد دل سر حسرت بر آستان می زن
که صدر صفهٔ دار الجلال جای تو نیست

تا[1] شور غمت ای بت عیار بر آمد
فریاد و فغان از در و دیوار بر آمد

جان رهگذر کوی تو بر آتش غم دید
زو نعرهٔ "انا رو[2] الله لنا" بر آمد

زنار مغان از غم عشق تو خبر یافت
دعوی انا الحق ز زنار بر آمد

عشق تو به بلغار و سقسین نظری کرد
فریاد به یکبار ز کفار بر آمد

یوسف به بوی[3] به بن چاه فرو شد
حلاج بوی به سر دار بر آمد

هر کو به زود زور بکوی تو فرو شد
با ناله زار از همه بزار بر آمد

در کوی فراموشان لطفت نظری کرد
صد غمزدهٔ دلشده را کار بر آمد

سجاده و زنار بیک نرخ فروشند
چون عزت قدس[4] تو به بازار بر آمد

اگر این تهمت هستی ز روی کار برخیزد
هزاران نعرهٔ مستی ز کوی یار برخیزد

و گر زنار شماسی ز عشق او خبر یابد
بسالات انا الحق کزان زنار برخیزد

دگر یکبار آن دلدار بر گلزار بخرامد
هم اندر حال رسم خار از گلزار برخیزد

و گر یک لحظه اندر کسوت عزت پدید آید
هزاران آه و داو یلاه از ابرار برخیزد

نگارینا سر موئی ز ذلت خویش پیدا کن
کزین یک کار تو ما را هزاران کار برخیزد

عجب نبود چو هدهد را سلیمان تاج می بخشد
که موری کور را قوتی ازین ایثار برخیزد

۱؎ یہ غزل خلاصۃ الاشعار نسخہ بانکی پور ۲۴۳ الف پر منقول ہے ۲؎ عوارف المعارف تصحیح قاسم انصاری ص ۲۴۳ ۳؎ مجموعہ اشعار اشنهی ص ۱۰۱؛ نویدی متن مطابق عوارف و خلاصۃ الاشعار ۴؎ لطف۔

هر خردمند که در دل غم ایمان دارد　　کار دنیا همه بازیچه و دستان دارد
دست دور دامن تقوی نبوند از سر صدق　　هر که او را هوس جاه گریبان دارد
لذت از عالم ارواح نیابد هرگز　　هر که در جستن جانانش غم جان دارد
بوی گلزار حقیقت به مشامی آید　　که ز غم ابر صفت دیدهٔ گریان دارد
دانکه چو مور قناعت به یکی دانه کند　　سزد ار باب خرد ملک سلیمان دارد
کار دنیا همه باد است بر آن دل چه نهی　　باد را هر که شود جفت پریشان دارد
سر میفراز بدین حشمت ده روزه که چرخ　　زیر گل چون تو سرافراز فراوان دارد
جانا دلی که با غم تو آشنا شود　　گر خون شود ز هجر تو بگذار تا شود
خود آنکه غمگسار دل او بود غمت　　شادان چرا نباشد و غمگین چرا شود
خلد برین ز رشک من آتش شود اگر　　خاک در تو تاج سر این گدا شود
دل بگسلد ز مهر تو آخر که بایدش　　جان بگذرد ز کوی تو آخر کجا شود
با شیر مادرم غم تو ز دل کرده است　　هرگز مباد روزی کز من جدا شود

آخری دو شعر خلاصة الاشعار میں ہیں:

آنست شرط عشق که جان را هدف کنم　　هر تیر درد را که ز شستت رها شود
نا ممکنست خود که صد تیر درد تو　　یک تیر ازین نشانهٔ جانم خطا کند
رمزی ز عشقت ای جان در عقل و جان نگنجد　　حرفی ز داستانت در صد زبان نگنجد
جان و خرد شریفند لیکن نه مرد عشقند　　دانی که بحر اخضر در ناودان نگنجد

۱؎ اس غزل کے پہلے ۵ شعر عوارف المعارف ص ۱۳۴-۱۳۵ میں بغیر ضبط نام شاعر درج ہیں البتہ خلاصة الاشعار نسخہ بانکی پور ورق ۲۴۳ الف پر یہ غزل تاج الدین اشنہی کے نام سے آتی ہے۔

ہاں تا جمال جانان در جان نہ جوئی زیرا کہ / منجوق ہودج او در کن فکان نگنجد

اندر حدث قدم را جستن محال باشد / عنقای قاف عزت در دودکان نگنجد

پای شگرف باید مردودۂ قدم را / رفتن بر اوج اعلی در نردبان نگنجد

سوی ازل چہ بازی گرد اندچہ تازی / کوتہ کن این درازی کاندر زبان نگنجد

در دست خلق بادی بہر کس بدان چو دنیا / وآنجا کہ ہست رادی در این و آن نگنجد

عمر خود ای بیخبر بر باد غفلت دادۂ / صدر راز پی دولت بر خویشتن بگشادۂ

عنکبوت شہوتت بتست بر دام غرور / آخر ای خر لنگری کاندر چہ دام افتادۂ

ننگ و عار مسجدی و اندر کنشتت جای نی / بہر نیکان باد تندی و بدان را بادۂ

وانگہی دعوی کہ جنت چیست دوزخ خود کدام / شاد باش ای بیست و شش سالہ کہ چون سادۂ

در خراب آباد دیو ایوان بہ کیوان بردۂ / این نمی دانی کہ جز بر یخ بنا ننہادۂ

راہ حق بس روشن است و کار او بس آشکار / زان نمی بینی کہ اندر پیش خویش استادۂ

تا تو در بند خودی ہم بندی ہم بندۂ / چون ز خود فارغ شدی آزادی و آزادۂ

یہ اشعار سادہ اور دلکش ہیں، ان میں شعریت موجود ہے لیکن شاعر بادۂ عرفان سے سرشار تھا اس لیے اسکی شاعری پر عرفان غالب آیا، تاج الدین اشنہی باقاعدہ خانقاہی صوفی تھے، ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی تربیت ہوتی تھی، فارسی شاعری کا مزاج عرفان سے بہت قریب ہے، اشنہی کی فارسی شاعری عرفانی شاعری بن جاتی ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ اگر تاج الدین اشنہی شاعری کیطرف پوری طرح متوجہ ہو جاتے تو انکا شمار اچھے شاعروں میں ہوتا۔ بخوبی ممکن ہے کہ انھوں نے کافی کلام چھوڑا ہو، تلاش جاری رکھنی چاہیے، ممکن ہے کہیں انکا کلام مل جائے نہ جانے کتنے ایسے بزرگ ہونگے جو خود اپنے کلام کیساتھ گوشہ گمنامی میں جا پڑے ہیں اگر تلاش و تحقیق کی جائے تو بہتوں سے گمنامی کا پردہ ہٹ جائے گا۔ عرفان و ادب کی یہ بڑی خدمت ہوگی۔

عقیدۂ توحید

اسلام کا بنیادی اصول

از
مولانا حبیب ریحان خاں ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم تاج المساجد بھوپال

اسلام ایک کلی نظام ہے جو اپنے اندر ہر زمانے، ہر ملک، ہر ماحول اور ہر سوسائٹی میں قیامت تک زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کی تعلیمات میں ہر شخص کے لیے سامانِ ہدایت ہے اور وہ ہمیشہ صراطِ مستقیم کی نشاندہی کرتا ہے، دنیا کی تمام مشکلات کا حل اس میں موجود ہے اور انسانیت کی تمام دیرینہ اور پیچیدہ بیماریوں سے شفایابی کا وہ کامیاب نسخہ ہے۔

زمان و مکان پر محیط چونکہ اسلام کا زمانی سلسلہ ازل سے ابد تک دراز ہے اور اس کا مکانی دائرہ کائنات کے ہر اس سیارہ تک محیط ہے جہاں زندگی کے نشان پائے جا سکتے ہیں یا جہاں تک انسان کی رسائی ممکن ہے، اس لیے اسلام کا نظام بھی زندگی کے ان تمام شعبوں پر حاوی ہے جنھیں خالقِ کائنات نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا ہے۔ اس لیے اسلام نہ صرف خالص روحانی (رہبانیت) نظام ہے نہ خالص مادی (جسمانی و جسدی) نظام، وہ صرف فردی یا اجتماعی نظام بھی نہیں ہے

بلکہ اس کی تعلیمات تمام روحانی، مادی، فردی اور اجتماعی امور پر مشتمل اور انکی اصلاحات کی ضامن ہیں جن کی پیروی کرکے اسلافِ امت نے زندگی کے ہر شعبے میں اعلیٰ مدارج طے کیے اور وہ ہر نقص وعیب سے مبرّا ہو گئے۔

توحید | اسلام کا ہر حکم اور اس کی ہر تعلیم ایک مستحکم ستون ہے جس کو مضبوطی سے پکڑ لینے کے بعد مسلمان ہمدوشِ ثریا ہو گئے تھے لیکن اس کی سب سے اہم بنیادی اور زندگی کی کایا پلٹ دینے والی تعلیم توحید ہے جو دوسری تمام تعلیمات کا اصل الاصول اور لب لباب ہے۔ یہاں اسی پر مختصر بحث کی جائے گی۔

مقصدِ تخلیق | کائنات خدا کی پیدا کردہ ہے اس کی تخلیق کا مقصد انسان کو نجات وسعادت سے ہمکنار کرنا ہے وہ اس دنیا میں خدا کی سب سے مکرّم اور محبوب مخلوق ہے اس کی پیدائش کی غرض وغایت عبادت ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ	میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف
إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات: ۵۶)	اس لیے پیدا کیا کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔

خدا کی عبادت کا اعتراف انسان کی سب سے بڑی صفت ہے جس سے انبیاء ورسل اور ملائکہ کو بھی انکار کی جرات نہیں ہوئی۔

لَنْ يَسْتَنْكِفَ الْمَسِيحُ أَنْ يَكُونَ عَبْدًا لِلَّهِ	مسیحؑ نے اسے عار نہیں سمجھا کہ وہ
وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۝	اللہ کا بندہ ہو اور نہ مقرب
(نساء - ۱۷۲)	ترین فرشتوں نے اسے عار سمجھا۔

عبادت کا حقیقی مفہوم | خدا کی عبادت کس طرح کی جائے، عبادت صرف اعضاء وجوارح کے

عمل ہی کا نام نہیں ہے بلکہ دل کے اس ایمان و عقیدہ کا نام بھی ہے جس کی اصلاح کے بغیر کوئی عبادت مقبول نہیں ہوتی مثال کے طور پر جس طرح نماز کے لیے وضو واجب ہے جس میں اعضا کے دھونے کا حکم ہے اور وضو کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی اسی طرح نماز سے پہلے قلب کی طہارت بھی ضروری ہے، حقد و حسد، کبر و غرور وغیرہ جیسے تمام قلبی امراض سے پاکی کے بغیر نماز کی حقیقی قبولیت ناممکن ہے۔

جب تک انسان اس حقیقت کبریٰ سے واقف نہ ہو کہ اس کا خالق و رازق مالک و رب اور مولیٰ و ماوی و ملجا خدائے پاک ہے وہ دل کی گہرائیوں سے اس کے رو برو سجدہ ریز نہیں ہو سکتا اسی ایمان و عقیدہ کا نام وحدانیت یا توحید ہے اور اسی پر ثواب و نجات کا دار و مدار ہے اور یہی کونین کی سب سے بڑی اور سب سے واضح حقیقت ہے چنانچہ جس دن پردۂ ہستی پر انسان نمودار ہوا ہے اسی دن اس کو توحید باری تعالیٰ کا درس بھی دیا گیا، دراصل توحید کی مثال اس تناور درخت کی ہے جس کی شاخیں اور برگ و بار اعمال صالحہ ہیں، اس لیے اگر تنا مضبوط اور زندگی بخش نہ ہوگا تو شاخیں سوکھ جائیں گی اور پھلوں کا تصور بھی ایسی صورت میں نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا	ہم نے ہر امت میں ایک رسول
أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا	بھیجا جس نے خبردار کر دیا کہ
الطَّاغُوتَ : (نحل ۳۶)	اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت
	(غیر اللہ) کی بندگی سے بچو۔

توحید تمام انبیاءؑ کی دعوت توحید کے بغیر زندگی بے رونق اور حیات بے نور ہے، اس لیے تمام انبیاء کرامؑ کی دعوت کا مرکزی نقطۂ فکر یہی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا
مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ	ہے اسے یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا
اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنَ	کوئی معبود نہیں ہے پس میری ہی
(انبیاء : ۲۵)	بندگی کرو۔

اس عمومی بیان کے بعد چند مخصوص انبیاء کے سلسلہ میں قرآن پاک کا ارشاد ملاحظہ ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ	ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کے پاس
فَقَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ	رسول بنا کر بھیجا اس نے کہا اے
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ	قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا
(مومنون ۲۳)	تمہارا خدا نہیں ہے۔
وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ	اور قوم عاد کے پاس ان کے بھائی
یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ	ہودؑ کو بھیجا انھوں نے کہا اے قوم
مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ	اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا
(اعراف ۶۵)	تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

الغرض تمام انبیاء کی دعوت توحید تھی عہد عتیق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ خدائے پاک نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو وصایائے عشرہ دیئے تھے ان میں سب سے اہم وصیت یہی تھی۔

"میرے حضور تو غیر معبودوں کو نہ ماننا، تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین پہ یا زمین کے نیچے پانی میں ہے تو ان کے آگے سجدہ نہ کرنا اور نہ ان کی عبادت کرنا کیونکہ

میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں" (خروج ۔ ۲۰ ۔ ۳ و ۵)

حضرت مسیح علیہ السلام سے جب ایک فقیہ نے پوچھا کہ

"سب حکموں میں اول کون سا ہے، یسوع نے جواب دیا اول یہ ہے اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ" (انجیل مرقس ۱۲ : ۲۹ ـ ۳۰)

اسی طرح حضرت مسیحؑ کا جو مکالمہ ابلیس لعین سے ہوا اس میں توحید خالص کا اسطرح اظہار ہے۔

"پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی اور اس سے کہا اگر تو جھک کر مجھے سجدہ کرے تو یہ سب تجھ کو دے دوں گا یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ: "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسکی عبادت کر" تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا" (انجیل متی ۴ : ۸ ـ ۹)

توحید سے محروم دنیا لیکن انبیاء علیہم السلام کی اس مسلسل دعوت توحید کے باوجود چھٹی صدی عیسوی میں دنیا توحید خالص کے اعتقاد سے نہایت دور ہو گئی تھی اور خدائے پاک کی ذات و صفات کے بارے میں پیچیدہ فلسفیانہ نظریات پیدا ہو گئے تھے یہانتک کہ وہ مذاہب بھی جو توحید کی دعوت دینے کے لیے اٹھے تھے کسی نہ کسی طرح کے شرک میں ملوث ہو گئے تھے، اس لیے اسلام نے توحید کے سلسلہ میں ایسا واضح دو ٹوک موقف اختیار کیا جس میں ذرا بھی شرک کی آمیزش نہ ہو اس نے توحید کی

حقیقت اس طرح واضح کی کہ اعتزال، ترکیب اور اجزاء وغیرہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہنے دی۔ اس کی بدولت خدائے پاک کی یکتائی کا وہ زندہ تصور پیدا ہوا جو بنی آدم کی وحدت اور اعمال صالحہ کے لیے محرک ہو۔

واضح عقیدۂ توحید | اسلام کا عقیدۂ توحید ہر قسم کے غموض، ابہام اور لاہوتی و میتافیزیقی جھگڑوں سے پاک وصاف اور نہایت سادہ، واضح اور دل نشیں ہے جس پر مغرب کے بڑے بڑے اہل علم و عقل کو بھی خراج تحسین پیش کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑا، اختصار کی غرض سے یہاں صرف دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں ہربرٹ جارج ولز اس طرح رقم طراز ہے:

"اسلام میں توحید میں کسی قسم کی ڈھیل نہیں ہے اور وہ یہودی اعتزال سے پاک ہے اور قرآن توحید کو بار بار پیش کرتا ہے اور دلائل سے ثابت کرتا ہے اسلام نے پہلے دن سے وہ دروازے بند کر دیے جن کے ذریعہ توحید میں لاہوتی اضافے ہوں، ایسے اضافے جنھوں نے مسیحیت کو بگاڑ دیا اور اس میں اختلافات پیدا کر دیے اور عیسیٰ کی روح کو ختم کر دیا اور مسلمانوں کے سامنے ہر وہ روشندان بند کر دیا جس سے کاہن قربانی کے لیے خدا اور بندے کے درمیان حائل ہو جائے، اس لیے اسلام میں فقہاء، علماء اور واعظ آج تک پائے جاتے ہیں لیکن کاہن اور پادری نہیں پائے جاتے ..... اسلام کی مخالفت یہودنے کی جنھوں نے خدا کی رحمت کو بنو اسرائیل کے لیے خاص کر لینے کا دعویٰ کیا تھا اس طرح اس کی مخالفت اس مسیحیت نے کی جس میں اس وقت تابوت مقدس کی حکمرانی تھی اور ایمان کے قوانین کی لاطائل بحثیں چھڑی

ہوئی تھیں جن میں ایک عام شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ سر کہاں ہے اور دُم کہاں ہے لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے توحید کا اصول انسانیت کے دل میں واضح طور پر بلا کسی ابہام وغموض کے اتار دیا۔[1]

حقیقی توحید | توحید کے سلسلہ میں کاؤنٹ ہنری ڈی کاسٹری کا ایک مختصر قول اور بیان کروں گا:

"اللہ احد اللہ احد کا کلمہ مسلمانوں کے پاس رہا ہم مسیحی قوموں سے غائب ہو گیا کیونکہ ہم توحید خالص سے دور ہو گئے، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا اسلامی عقیدہ اس اعتقاد کا نام ہے کہ خدا یکتا ہے، پالن ہار ہے، ہر اس نقص سے پاک ہے جس کا عقلی تصور کیا جا سکتا ہے اور یہی وہ صحیح اور مضبوط اعتقاد ہے جس کی وجہ سے مسلمان دوسری قوموں سے ممتاز ہیں اور وہی درحقیقت مومن ہیں"۔[2]

الغرض اسلام نے وحدانیت کا جو صاف صریح اور سادہ مفہوم پیش کیا وہ سورۂ اخلاص میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔	کہو وہ اللہ ہے یکتا، اللہ سب سے بے نیاز ہے سب اس کے محتاج ہیں، نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔

---

[1] "دی آوٹ لائن آف ہسٹری" کے عربی ترجمہ "معالم تاریخ الانسانیہ" ص ۹۳-۹۲-۹۴، سے تلخیص [2] اسلام سے متعلق ہنری دی کاسٹری کی کتاب فرانسیسی زبان میں ۱۸۹۶ء میں چھپی تھی فوراً اس کا عربی ترجمہ "الاسلام" کے نام سے قاہرہ میں چھپا تھا اس کے ص ۱۶-۱۷ سے یہ اقتباس لیا گیا ہے۔

براہین خلق ونظام وکمال | نزول قرآن کے وقت منکرین توحید کے متعدد گروہ تھے، ایک گروہ مظاہر قدرت یا بتوں کی پوجا کرتا تھا دوسرا گروہ خیروشر کے دو خداؤں (یزداں واہرمن) کا تصور لیے بیٹھا تھا، تیسرا گروہ ان نصرانیوں کا تھا جو تین خداؤں کو فلسفیانہ انداز پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے، قرآن پاک نے ان تمام گروہوں کے نظریات کا بطلان کیا اور ان کے عائد کردہ اعتراضات کا تشفی بخش جواب دیا۔

اس ضمن میں یہ عرض کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ قرآن پاک قیامت تک کیلئے اتارا گیا ہے اور یونانی حکما وفلاسفہ سے لے کر عرب کے امی تک اسی کے مخاطب ہیں اس لیے قرآن مجید نے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے وہی دلائل وبراہین پیش کیے ہیں جن کو فلسفہ وعلم پیش کرسکتا ہے لیکن اس کا اسلوب ادبی اور دل میں اتر جانے والا ہے اور اس میں بڑی حلاوت اور شیرینی ہے، وجود باری تعالیٰ کے منکروں کے بارے میں وہ اس طرح خطاب کرتا ہے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ	کیا یہ کسی خالق کے بغیر خود پیدا ہوگئے
هُمُ الْخَالِقُوْنَ (طور: ۳۵)	یا یہ خود اپنے خالق ہیں۔

اس کو فلسفہ کی زبان میں برھان الخلق یا (COSMOLOGICAL-ARGUMENT) کہتے ہیں۔

دوسری دلیل قرآن پاک نے یہ پیش کی۔

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ	تم رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی
تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ	نہ پاؤگے نظر پلٹ کر دیکھو کیا تمھیں کوئی
تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ (الملک: ۳)	خلل نظر آتا ہے؟

فلسفہ کی زبان میں اسے برھان النظام یا (TELEOLOCAL ARGUMENT) کہتے ہیں یہ ارسطو کی قدیم دلیلوں میں سے ایک ہے نیوٹن نے بھی اس کو اپنایا ہے اور سارے قدیم و جدید فلاسفہ کسی نہ کسی طرح اس سے استدلال کرتے ہیں۔

تیسری دلیل قرآن مجید نے یہ پیش کی ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ: ۱۱)	کائنات کی کوئی چیز اسکے مشابہ نہیں ہے
لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ	نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور
يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ	وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے وہ نہایت
اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ (انعام: ۱۰۳)	باریک بیں اور با خبر ہے۔

اس کو فلسفہ کی زبان میں برھان کمال کہتے ہیں، مغرب میں اسے (ONLOLOGICAL ARGUMENT ANSILM) کہتے ہیں، گیارہویں صدی کے مشہور مسیحی فلسفی سینٹ انسلم (۱۰۳۳ - ۱۱۰۹) کی طرف یہ دلیل منسوب ہے۔

یہ دلائل گو فلسفیانہ تھے لیکن قرآن پاک نے اپنے معجزانہ اسلوب بیان سے ان کو زندگی بخش دی ہے۔

مظاہر قدرت پر غور و فکر ان خاص دلائل کے بعد قرآن پاک نے جگہ جگہ اپنی قدرت کے مظاہر جمال و جلال، نور و نار، نباتات و اشجار، زمین و آسمان، پہاڑ و دریا، چرند و پرند سب پر غور کرنے کی دعوت دی اور ثابت کیا کہ یہ سب چیزیں صرف خدا کی قدرت خلاقی سے پیدا ہوئی ہیں، اس موضوع پر بے شمار آیتیں ہیں، ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں جس میں انسان کے قلب و ضمیر اور عقل کو سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝ اِنَّ
فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ
تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

(بقرہ ۲: ۱۶۳-۱۶۴)

تمھارا خدا ایک ہی خدا ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے وہ رحمٰن ورحیم ہے، بے شک آسمان و زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسانوں کے نفع کی چیزیں لیے سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے اور اس کے ذریعہ سے وہ زمین کو زندگی بخشتا ہے (اور اس انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان وزمین کے درمیان تابع فرمان ہیں (ان سب چیزوں میں) اہل عقل کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں۔

متعدد معبودوں کے عقلی نقصانات | خلق الٰہی کی ان اشیاء کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر دو معبود یا متعدد دیوتا بھی تو یہ کام کر سکتے ہیں،

یونانی وثنیت یا مجوسی ثنویت کا جواب قرآن پاک کس عقلی انداز سے دیتا ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ	اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا
لَفَسَدَتَا ۚ	دوسرے خدا ہوتے تو ان دونوں کا
(انبیاء: ۲۲)	نظام بگڑ جاتا۔

متعدد دیوتاؤں کے تصور سے نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا، علاوہ بریں ان سب رذائل اور بد اخلاقیوں کو جنم دے گا جس سے قدیم میتھالوجیا بھری ہوتی ہے اور جس میں دیوتاؤں سے متعلق ایسے ایسے قصے درج ہیں جن سے انسان کی پیشانی شرم سے جھک جاتی ہے، کتنا پیارا اسلوب ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ	کوئی دوسرا خدا اس کے ساتھ
إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا	نہیں ہے ورنہ ہر خدا اپنی مخلوقات
خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ	کو لے کر الگ ہو جاتا اور ایک
بَعْضٍ (مومنون: ۹۱)	دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

ہر مخلوق بندگی کا اقرار کرتی ہے

جن لوگوں کا اصرار تھا کہ خدا صاحب اولاد ہے ان کا جواب اس عقلی دلیل سے دیا گیا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اس کی ملکیت ہے اور ساری مخلوق اس کی بندگی اور عبدیت کی مقر ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا	وہ کہتے ہیں کہ رحمٰن نے کسی کو بیٹا
لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا تَكَادُ السَّمَاوَاتُ	بنایا ہے سخت بے ہودہ بات ہے
يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنشَقُّ الْأَرْضُ	جو تم گڑھ لائے ہو، قریب ہے کہ
وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا أَن دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ	آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق

وَلَدًا ..... اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝

(مریم - ۸۸-۹۵)

ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں اس بات پر کہ لوگوں نے رحمان کے لیے اولاد ہونیکا دعوی کیا.... اور زمین و آسمان میں جو بھی ہیں وہ اسکے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں اس نے ان کو شمار کر رکھا ہے اور فرداً فرداً قیامت کے روز اس کے سامنے حاضر ہوں گے۔

کائنات کے تمام اختیارات کا مالک الغرض اسلام نے توحید خالص کا وہ عقیدہ پیش کیا جس میں کائنات کے سارے اختیارات صرف خدائے واحد و لاشریک کے دستِ قدرت میں ہیں، وہ اکیلا تمام بندوں کی التجائیں اور دعائیں سنتا ہے اور ان کو قبول کرتا ہے، اس کے سوا نہ کسی کی عبادت کی جا سکتی ہے نہ کسی سے استعانت و مدد مانگی جا سکتی ہے، اسکے حکم کے بغیر نہ کوئی چیز نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔

توحید اسلامی شرک جلی و خفی کے تمام اثرات و مظاہر سے پاک ہے اس میں پرستش کی تمام شکلیں صرف مالک الملک اور رب العالمین کے لیے مخصوص ہیں، اس توحید میں نہ کوئی ابہام ہے نہ کوئی غموض و خفا، نہ خدا تک پہنچانے کے لیے کسی کاہن اور پادری کی ضرورت ہے یہ:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں

اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں

کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

عقیدۂ توحید کا فائدہ | اس واضح عقیدہ نے انسانی زندگیوں میں وہ کلی انقلاب برپا کر دیا تھا کہ تاریخ عالم کا ہر منصف مورخ اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور آج بھی انسانیت اپنی لا علاج بیماریوں کا علاج اور گوناگوں مشکلات کا حل اس عقیدۂ توحید میں پا سکتی ہے، یہ عقیدہ انسان کو خدائے وحدہ لاشریک لہ کی عبدیت کا معترف بناتا ہے اس کے بعد وہ کائنات کے ہر ذرہ پر خدا کے حکم سے حکمرانی کرتا ہے اور اس کا سر مظاہر قدرت کے سامنے جھکنے کے بجائے خالق کونین، مالک الملک اور رب العالمین کے دربار میں جھکتا ہے اس کا دل سکون آشنا ہو جاتا ہے اس کا ضمیر روشن، باطن پاک اور نفس متقی بن جاتا ہے اور ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے وہ اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے اشرف المخلوقات کا خطاب عطا ہوتا ہے ؎

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

ترقیاتی علوم اور دانش نبوی ﷺ

از جناب ریاض الدین احمد صاحب جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل یو۔پی الٰہ آباد

انبیاء کرامؑ کا علم تکمیلی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ علم کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ	اس طرح کہ تم لوگوں میں ہم نے
يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ	ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	ہماری آیات اور احکام پڑھ کر
وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا	تم کو سناتاہے اور تمہارا تزکیۂ نفس
تَعْلَمُونَ ۞	(اور رفع جہالت) کرتاہے اور تم کو
(۲/البقرہ ـ ۱۵۱)	کتاب الٰہی کا علم عطا کرتا ہے اور
	حکمت کی باتیں بتاتاہے اور ایسی
	مفید باتوں کی تعلیم کرتا ہے جن کی
	تمہیں خبر نہ تھی۔

معلوم ہوا کہ اگرچہ آپؐ امی تھے۔ مگر علوم میں آپؐ کو درجہ کمال حاصل تھا۔ تمام علمی ترقیات جو قیامت تک وجود میں آئیں گی ان کا منبع آپؐ ہی ہیں اور وہ کتاب معجزنما جو آپؐ کو عطا فرمائی گئی ہے، ہر زمانے میں لوگوں کی علمی صلاحیت اور فکری توانائی کے

مطابق افشائے راز کرتی رہے گی۔ اس کتاب عظیم کے الفاظ اٹل ہیں، اور اس کا ایک ایک حرف ناقابل ترمیم و تنسیخ ہے۔ اس کا علم نور ہے اور یہی نور انسان پر نئی نئی راہیں کھولتا ہے اور ظلمت کے بادل چھانٹتا ہے۔ اسی نور کے سائے میں ترقی کی راہیں تلاش کرنا حکمت ہے۔ اس حکمت میں دانش۔ تدبر۔ تدبیر۔ فکر تحقیق۔ معرفت۔ ایجادات عمل صالح وغیرہ سبھی چیزیں شامل ہیں چنانچہ :۔

"قرآن اور سنت کی روشنی میں عقل سے کام لینا حکمت ہے اور عقل کے دائرے میں قرآن اور سنت کو محدود کر دینا اتباع ہوا ہے[1]"

علم نافع حکمت ہی کی پیداوار ہے، حکمت قرآنی کے بغیر علم خسران ہے۔ جس نے نور قرآنی سے بے نیاز ہو کر علم حاصل کیا اس نے فساد کی بنا ڈالی۔ آج کے ترقیاتی علوم اور عروج سائنس نے دنیا کو نئی نئی آگاہیوں سے روشناس کر دیا۔ قدرت کے پوشیدہ رازوں کی عقدہ کشائی کی۔ نئی نئی ایجادات انسان کے لیے مسخر کیں۔ چاند و سورج تک علوم کے خزانے لٹا دیے۔ مگر اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ تمام ترقیات تباہی کا پیش خیمہ ہیں۔ عجب نہیں کہ آخری عالمی جنگ میں ایٹمی توانائی کا استعمال نئی سائنسی تہذیب کو خاکستر کر دے اور یہ عروج ایک افسانہ بن کر رہ جائے تہذیبوں کی تاریخ شاہد ہے کہ ہزاروں تہذیبیں عین حالت عروج میں تباہ ہو گئیں کیونکہ ان کا جوڑ حکمت قرآنی سے نہیں تھا۔ اس لیے قرآن نے زمانے کو گواہ بنا کر اعلان کر دیا کہ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ

حکمت قرآنی کا عملی نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کا علم وحی سے

---

[1] الفاظ القرآن ج ۳ ص ۹۵

حاصل ہوا تھا کسبی نہیں تھا۔ آپؐ نے کسی دنیاوی استاد کے سامنے دامن ادب طے نہیں کیا تھا۔ مگر آپؐ کو اللہ نے علوم کی اعلیٰ ترین منزلوں پر فائز کر دیا تھا۔ آپ کا علم رہتی دنیا تک مشعل راہ اور منزل مقصود بنا رہے گا۔ انسانی تجسس کیلئے یہ علم حد فاصل اور حد ادب ہے۔ دانش نبویؐ کے آگے انسان مجبور محض ہے۔

اس کے برخلاف دنیاوی علوم کسبی ہیں۔ یہ منزل بہ منزل آگے بڑھتے ہیں۔ انکی دو قسمیں بہ لحاظ استعمال ہو جاتی ہیں۔ علم نافع اور علم فاسد۔ جو علم ایمان اور حق کی روشنی میں استعمال کیا جاتا ہے وہ نافع ہے اور جو علم فساد اور تکبر کے سائے میں پروان چڑھتا ہے وہ فاسد ہے۔ علم نافع انسانیت کی تعمیر اور دنیا کی تطہیر کا حق تاقیامت ادا کرتا رہے گا۔ علم فاسد عروج و زوال کی منزلیں طے کرتا رہے گا اور شرافت نفس اور اعمال صالحہ کے لیے ایک بڑا چیلنج بنا رہے گا۔ حالیہ تحقیقاتوں کا ولولہ ایجادات کا غلغلہ۔ افلاک کی پروازیں۔ بجلیوں پر تصرف آواز پر قابو۔ رفتار کی سرعت اور علم الحساب کا جادو۔ یہ سب نور قرآنی کے بغیر تکبر علمی کا مظہر بن گئے ہیں اور خسران کے راستے پر چل کر دنیا کو نت نئی بے چینیوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔

دراصل انسان کی فکر کے لیے حدیں مقرر اور منزلیں متعین ہیں اور ہر امت اور ہر زمانے کے لیے عروج و زوال کا وقت ہے۔ لیکن علوم کا عروج دانش نبویؐ کے پرے کچھ نہیں اور علوم کا منبع قرآن کے سوا کہیں نہیں۔ چودہ سو برس پہلے جب جدید سائنس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا قرآن سائنسی معلومات سے بھرا پڑا تھا۔ جدید تفکر علمی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے قرآن کے بین السطور پوشیدہ علوم سائنسی کا پتہ لگا لیا۔ فرانسیسی ماہر سائنس موریس

بوکائیلے (Maurice Bucaille) اپنے مقالے "قرآن اور ماڈرن سائنس" کی تمہید میں تسلیم کرتا ہے کہ

"سائنسی مضامین جس وضاحت سے قرآن میں موجود ہیں ان کو دیکھ کر میرا اولین تاثر حیرت واستعجاب کا تھا۔ اس وقت تک میرے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایک کتاب جو تیرہ سو برس پہلے وجود میں آئی ہے ایسے مضامین پر روشنی ڈال سکتی ہے جو حالیہ تحقیقات کے بعد منظر عام پر آئے ہیں"۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علمائے حق نے اس نکتہ کو کیوں نہیں پہچانا اور افشائے راز کی خدمت منکرین حق کے ہاتھ میں کیوں چلی گئی۔ تو اصل بات یہ ہے کہ مشیئت ایزدی جس سے جو کام لینا چاہے لے سکتی ہے ؎

"پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے"

مگر ظاہر بیں آنکھوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ منکرین کے لیے عذاب جہنم کا جواز اسی میں تھا کہ نظائر بصائر اور شواہد کھل کر انکے سامنے آجائیں جو بلا دلیل اللہ کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سائنسی افکار نے اللہ کی نشانیاں برملا پیش کر دیں اور عقل و ہوش والوں کے لیے صراط مستقیم کا دروازہ کھول دیا۔ اب بھی جو انکار کرے اس نے خود جہنم کی زندگی اپنے اوپر مسلط کر لی۔

یقیناً اللہ تعالےٰ نے فکر و تجسس کو افشائے راز کا ذریعہ بنایا ہے اور اپنی آیات بینات میں ایسی نشانیاں رکھ دی ہیں جو رہنمائے منزل ہیں۔ مگر یہ قید نہیں لگائی کہ ماسبقہ صرف مومن کے لیے کھلا ہے، مومن ہو یا کافر جو چاہے اس میدان میں کود سکتا ہے اور نوادر کائنات کی خوشہ چینی کر سکتا ہے۔ دروازہ قاری قرآن کیلئے

بھی کھلا ہے اور غافل قرآن کے لیے بھی۔ مگر ایک کا تجسس تکبر اور مفسدات کی طرف لے جاتا ہے۔ دوسرے کا تجسس صراط مستقیم اور نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایک کا تجسس عالم رنگ و بو میں انتشار کی فضا پیدا کرتا ہے۔ دوسرے کا تجسس ایمان اور "تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" کی ہوائیں چلاتا ہے۔ ایک اعمال کی دنیا میں "یَتَرَدَّدُ مُنْذُ یَکُنْ" بنا پھرتا ہے اور دوسرا حکمت قرآنی سے جڑا ہوا "خَشْیَةُ اللّٰہِ" کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔ رحمت پروردگار کے دامن میں سر چھپانے کی تمنا رکھتا ہے۔

مفسدات علمی کے لیے سمت القرآن راہ نجات ہے۔ یہ صحیفہ اپنی خود دلیل ہے۔ چودہ سو برس گذر گئے عرب و عجم کے جادو بیان اس کی جادو بیانی کا مثل نہیں پیدا کر سکے۔ علمائے ادب اور دانشوران شرق وغرب اسکی سلاست اور بلاغت کو نہیں پا سکے۔ ماہرین صوت و نغمہ اس کی حلاوت اور وجدان کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ علمائے سائنس اور محققین کائنات انوار قرآنی کی ڈگر پر چلنے کے لیے مجبور ہو گئے ایک ماہر سائنس کو قرآن کے متن میں پہلے پہل چونکا دینے والی جو چیز نظر آتی ہے وہ ہے سائنسی موضوعات کا تنوع اور کثرت ایسی صحت کے ساتھ کہ موجودہ سائنس اس کی توثیق کرنے پر مجبور ہے۔

ایسا کیوں ؟ اس کی کوئی تاویل ممکن نہیں۔ لا قرآن اٹ لا سائنس (le coran et la science) کا مصنف اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:

" ان مشاہدات کے لیے کوئی دلیل سمجھ میں نہیں آتی کہ عین اس وقت جب شاہ داگوبرت (۶۲۹ - ۶۳۹) فرانس میں حکومت کر رہا ہے جزیرۃ العرب کا ایک باشندہ ایسے سائنسی موضوعات کا علم رکھتا ہے جو ہمارے زمانے سے بھی دس صدی

صدی بعد کے دور سے تعلق رکھتے ہیں"۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک اُمّی کے ہاتھ میں ایسا صحیفہ دے دیا گیا جس کا بنیادی موضوع ایمان۔ ایقان اور "خشیۃ اللہ" ہے پھر بھی وہ ایسے علوم کا مخزن ہے جو ہر زمانے کے ترقیاتی حوصلوں کا ساتھ دے سکتا ہے۔ آیئے ان قرآنی موضوعات پر ایک اجمالی نظر ڈالتے چلیں جو جدید ترین سائنس کا دائرۂ فکر ہیں۔

(۱) ارض و سمٰوٰت کی تخلیق: تخلیق کے چھ ۶ ادوار۔ نظام شمسی۔ کہکشائیں۔ تعدد عالمین کا تصور۔ بین کوکبی مادہ۔

(۲) علم ہئیت: آسمان کے متعلق عام تصورات۔ اجرام سماوی کی نوعیت ستارے اور سیارے۔ آسمان دنیا۔ نظام سماوی۔ چاند اور سورج کے مدار۔ خلاء میں چاند اور سورج کے محرکات۔ آسمانوں کا ارتقا۔ کائنات کا پھیلاؤ۔ خلاء کی تسخیر

(۳) زمین: زمین اور سمندر۔ جہازرانی۔ زمین کے نشیب و فراز۔ پہاڑ۔ زمین کا کرۂ بابصار تفاع۔ کرۂ باد میں بجلی۔ آب و ہوا۔ بر اعظموں کا ٹوٹنا۔ آبی غذائیں پانی کے اندر زندگی۔

(۴) عالم نبات: عالم نبات میں توازن۔ غذاؤں کی الگ الگ مقدار۔ عالم نبات میں افزائش نسل۔ نباتات کا دائرہ حکمرانی۔

(۵) حیوانات: حیوانی زندگی کی ابتدا۔ اور ارتقا۔ عالم حیوانی میں افزائش نسل۔ حیوانی برادری کا وجود۔ شہد کی مکھیاں۔ انکی افادیت۔ مکڑیاں۔ چونٹیاں اور پرندوں کا علم۔ دودھ والے جانور اور انکے اجزاے ترکیبی۔

(۶) انسان: تخلیق آدم، انسان کی افزائشِ نسل۔ انسانی مشین کا حیرت انگیز کردار

(احسن تقویم) بالیدگی کا عمل۔ رقیق مادۂ حیات۔ رقیق مادے کے اجزائے ترکیبی۔ رحم کے اندر جنین کا ارتقا۔

(۷) فنا کا تصور سائنس کی روشنی میں۔ فنا کے منازل وغیرہ

(۸) انعام واکرام۔ تسخیر کی سائنس۔ ہوا کا دائرہ عمل۔ خلاء کے حدود۔ کائنات پر انسانی تصرف کے حدود۔ نباتات اور جمادات پر انسانی تصرف کی شکلیں۔ پانی کا کردار۔ وغیرہ۔

پانی ایک ایسی عام شئے ہے کہ عرصہ دراز تک محققین نے اسکی طرف توجہ نہیں کی۔ جبکہ قرآن میں اس کا ذکر ۶۳ پچاس بار سے زیادہ آیا ہے۔ تخلیق آدم سے لے کر شعوری زندگی کے ہر گوشے میں پانی کا عمل دخل ہے۔ ہمارے اس کرۂ ارض کی ابتدا پانی سے ہوئی۔ انسانی اور حیوانی زندگی پانی سے وجود میں آئی۔ پانی کا ذخیرہ اب بھی خشکی پر حاوی ہے۔ پانی کی تہہ میں زندگی کی ایک عجیب وغریب دنیا بسی ہوئی ہے۔ پانی کے باہر زندگی بغیر پانی کے محال ہے۔ اب سے قبل کسے معلوم تھا کہ پانی بیک وقت رقیق بھی ہے۔ ٹھوس بھی اور گیس بردار بھی۔ اٹمی توانائی اسی پانی کا عطیہ ہے۔ زندہ پانی اور مردہ پانی کی دریافت نے سائنسی دنیا میں ایک ہلچل مچا دی ہے[۱] مگر اب بھی نہیں معلوم کہ پانی کا بنیادی ذخیرہ کہاں ہے کن کن راستوں سے پانی اوپر آتا ہے اور کون کون سی معدنیات اس میں شامل ہیں۔ اور کہیں کہیں اسمیں آتش فشانی مادہ کیوں پایا جاتا ہے۔

---

[۱] Physiology for Everyone by B.E. Seryee

حقیقتاً اہل فکر کے لیے قرآن خود ایک مجموعہ تحیرات ہے۔ یہ دنیا چودہ سو برس سے کسی دوسرے ایسے ادبی شہپارے کی تلاش میں ہے جو علمیت۔ ادبیت۔ سائنس سوشیالوجی۔ فلسفہ۔ قانون۔ نصائح وامر اور نواہی اور دیگر واردات زندگی پر مہد سے لحد تک۔ زمین سے آسمان تک۔ محدود سے لامحدود تک روشنی ڈال رہا ہو اس طرح کہ نہ روحانیت کا تار ٹوٹے۔ نہ فلسفہ گم شدہ راہ بن جائے۔ نہ تاریخ میں افسانویت ہو۔ نہ شواہد مٹے مٹے ہوں۔ نہ بنیات پردے میں ہوں۔ نہ اخلاق کی حدیں مجروح ہوں۔ نہ سائنس کے راستے مسدود ہوں۔ انبیائے کرامؑ کو جو صحیفے دیے گئے، قرآن جس میں حرف آخر ہے، انکی جامعیت تک پہونچنا بشری صلاحیت سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جس کی تازگی کسی عہد مخصوص سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہر زمانہ اسے اپنے علوئے فکری سے بالاتر پاتا ہے۔ ہر دور کی سائنس اسے اپنی عقدہ کشائیوں کا پیش رو پاتی ہے۔ ہر زمانہ کی ادبی کاوشیں قرآن پاک کی ادبیت سے نیچے نیچے رینگتی نظر آتی ہیں۔

قرآن مجید دنیا کی وہ واحد کتاب ہے۔ جس کے بلا تحریف ہونے کے دلائل عصر بہ عصر بڑھتے جا رہے ہیں۔ نزول قرآن پہ صدیاں گذر گئیں مگر تحریف قرآن کا دعویٰ کوئی ثابت نہیں کر سکا۔ علوم کی گہرائیاں بڑھتی گئیں۔ قرآن کی صداقت ابھرتی گئی۔ رفتہ رفتہ ایقان کی جگہ دلائل نے لے لی مگر آج تک کوئی دلیل قرآن کے ایک حرف کو بھی ہلا نہیں سکی۔ پندرہویں صدی میں سائنس کا عمل دخل ہوا تو قرآنی حقایق اور بھی چمک اٹھے۔ عصر حاضر میں موریس بوکائیے نے دلائل، شواہد اور قرائن کو اکٹھا کر کے قرآن کے بلا تحریف ہونے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر رشاد خلیفہ

اور بھی آگے بڑھے انھوں نے جدید تکنکی ذرایع کا استعمال کر کے کمپیوٹر کی مدد سے یہ ثابت کر دیا کہ جدید ترین ذرایع معلومات بھی قرآن کی حرف بہ حرف صداقت کی تصدیق کر رہے ہیں

نیز احمد ویدات نے ۱۹ کو ایک بنیادی ہندسہ مان کر یہ ثابت کیا کہ قرآن کا ایک ایک لفظ علم الحساب کی ڈوری میں بندھا ہوا ہے۔ لاکھوں الفاظ اور حروف کا اس طرح پیوند در پیوند ہونا کسی بشر یا مشین یا کمپیوٹر کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔ ان جدید ترین تحقیقات کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہر ترقی کے دور میں ترقیاتی علوم کا پیش رو قرآن ہی رہے گا۔

اسی طرح ترقیاتی علوم دانش نبویؐ کی سرحدیں کبھی پار نہیں کر سکیں گے۔ یہ زمانہ سرعت رفتار اور دور بینی کا ہے۔ انسان چاند کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے اور امریکی فضائی طیارہ پانیر ۱۰ معلوم سیاروں کے حدود سے باہر ۶،۷۰۰ ملین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے نظام شمسی کی سرحدوں میں داخل ہونے کی کوشش میں لگا ہوا ہے (U.S.I.S-Science Jounonal) اس حیرت انگیز سرعت رفتار کے مقابلہ میں رسول پاکؐ کا سفر معراج یاد کیجئے۔ آپؐ ساتوں آسمان کا سفر کر کے واپس تشریف لے آئے اس حال میں کہ زنجیر ہلتی رہی اور بستر کی گرمی زائل نہیں ہوئی۔ نہ سپر سانک (Suker Sonic) کا استعمال ہوا۔ نہ راکٹ داغے گئے نہ خلائے بسیط میں چکر لگانے کی ضرورت ہوئی۔ انسانی کوششیں پرواز کے ان مدارج کو چھو بھی نہیں سکتیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادو کے علم سے نوازا گیا اور انہیں اس پایے پر

پہونچا یا گیا کہ " سَاحِرٌ عَلِیْمٌ " پر غالب آگئے ۔ سحار علیم تھے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جادو ایک علم ہے اور اس میں بطور ایک علم (سائنس) کے ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ مگر انسانی صلاحیتیں حضرت موسیٰ ؑ کے درجے کو نہیں پہونچ سکتیں ۔ اس زمانے میں جادو کا استعمال بطور ایک تفریحی علم کے ہو رہا ہے ۔ جادو کی بہت سی قسمیں ہیں ۔ مگر ان میں فرار کا جادو (Escape Magic) اور دماغ کا جادو (Mentalist Magic) خاص اہمیت رکھتے ہیں (ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا ۔ جلد ۔ ۱۲) حضرت یوسف علیہ السلام کو تعبیر خواب کی اس مہارت سے نوازا گیا تھا جس کا ثانی ابھی تک دنیا میں نہیں پیدا ہوا ۔ آپ عزیز مصر کی جیل میں تھے تو قیدیوں کے خواب کی تعبیر بتا دیا کرتے تھے (پارہ ۱۲/یوسف آیۃ ۳۶)

یہ علم ان علوم میں سے تھا جو ان کے رب نے انہیں خاص طور پر عطا فرمایا تھا ۔ (۱۲/یوسف ۳۶) تاکہ دنیا کے تمام گم کردہ راہ انسانوں پر اللہ کی عظمت اور اس کی وحدانیت کا سکہ جما دیں اور ان کو ہزاروں آقاؤں کی بندگی سے آزاد کرا کے صرف ایک اللہ کی فرماں ۔ ۔ ائی میں داخل کر دیں (۱۲/یوسف ۳۸ ۔ ۳۹) اس نعمت کے لیے بطور شکر آپ نے فرمایا " اے میرے پروردگار آپ نے مجھ کو سلطنت کا بڑا حصہ دیا اور مجھ کو خوابوں کی تعبیر دینا تعلیم فرمایا (جو کہ علم عظیم ہے) ۱۳/ (۱۲) ۱۷ ا حضرت یوسف ؑ کے بعد تعبیر خواب کے علم نے بطور ایک سائنس کے ترقی نہیں کی ۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۰ء کے آس پاس آسٹرین ماہر جسمانیات فرائڈ (Freud) نے دعویٰ کیا ہے کہ خواب کی تعبیریں معلوم کرنے کے لیے سائنسی ذرایع استعمال کیے جا سکتے ہیں ۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ خواب انسانی خواہشات کے تکملے کا مظہر ہوتے ہیں

اس روشنی میں خواب کی زبان پڑھی جاسکتی ہے۔ مگر ۱۹۷۷ء میں ہارورڈ یونیورسٹی کے دو ماہرین سائنس رابرٹ مک کارلے (Robert Mc carley) اور الن ہابسن (Allen Hobsan) نے یہ بیان دیا کہ خواب محرکات جسمانی کی ایک شکل ہے اور ماہرین نفسیات اس سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ (ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا جلد ۵) مگر ابھی تک سائنس کسی واضح نتیجے پر نہیں پہنچ سکی ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو بولیوں کا علم عطا کیا گیا۔ وہ جنوں پرندوں اور حشرات الارض سے ہم کلام ہو سکتے تھے (پارہ ۲۰/النمل آیۃ ۱۵-۱۶-۱۷) اور ان کی حکمرانی میں سرعت رفتار کمال پر تھی اور یہ سب کچھ عطیہ تھا" مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ" آپ نے ہدہد سے باتیں کیں اور چیونٹیوں کی گفتگو سنی۔ عفریت جو ایک جن تھا ملکہ سبا کا تخت آنکھ جھپکتے میں اٹھالایا (۲۰/النمل ۳۹) خلائی سائنس سے قبل قصہ سلیمان ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ مگر آج جب ایک گرتے ہوئے خلائی راکٹ کو جو زمین کے گرد ½ ۱۰ لاکھ کیلومیٹر سفر طے کر چکا تھا ایک ۱۲ میٹر لمبے مصنوعی ہاتھ نے منٹوں میں کھینچ کر فضائی تباہ کاری سے بچا لیا۔ (خلیج ٹائمس مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۹۱ء) تو انبیاء کرام کی عظمت علمی پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا علم خلائی سائنسدانوں سے آگے تھا کیونکہ ان کی پرواز آلات کی محتاج نہیں تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام علوم طبیہ کی اس اونچائی تک پہونچا دیے گئے کہ وہ بحکم رب العالمین مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے اور مردوں کو زندہ کرتے تھے (المائدہ ۱۰۰) موجودہ میڈیکل سائنس اس عروج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے بھی بنیادی علوم سے انبیاء کرام کو

نوازا گیا۔ یہاں ہم صرف دو مثالیں پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے لیے اللہ تعالیٰ نے پگھلی ہوئی دھاتوں کا چشمہ جاری کر دیا (پارہ ۲۲/ سبا۔۱۲) اس چشمے کا خزانہ کہاں تھا؟ حالیہ دریافت سے پتہ چلا ہے کہ زمین کی اوپری سطح سے تقریباً ۷۰ کیلومیٹر نیچے ایک دوسری سطح تقریباً تین ہزار (۳۰۰۰) کیلومیٹر دبیز ہے۔ اس کی چٹان سلی کون (Silicon) آکسیجن (oxygen) ایلومونیم (aluminum) لوہا (iron) اور میگنیشیم (Magnesum) سے بنی ہوئی ہے۔ تیسری سطح تقریباً دو ہزار دو سو پچاس (۲۲۵۰) کیلومیٹر دبیز ہے یہ پگھلے ہوئے لوہے اور نکل (Nickel) سے بنی ہوئی ہے۔ چوتھی سطح جو تقریباً ایک ہزار تین سو (۱۳۰۰) کیلومیٹر دبیز ہے۔ ٹھوس لوہے اور نکل پر مشتمل ہے (ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۱۴-۱۵) کبھی کبھی یہ دھاتیں لاوا کی شکل میں ابل پڑتی ہیں۔ مگر چشمے کی شکل میں نمودار ہونا باعث برکت ہے اور لاوا کا پھوٹ پڑنا باعث زحمت۔

حضرت داؤدؑ کو لوہے کے استعمال کا طریقہ بتایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا (پارہ ۲۲/ سبا۔۱۰) اگر لوہے کو نرم کرنے کی ترکیب نہ معلوم ہوتی تو دنیا ایک بڑی نعمت کے استعمال سے محروم ہو جاتی اور لوہے کا کثیر خزانہ جو زمین کی تہہ میں موجود ہے اس پر کوئی رہنمائی نہ ملتی۔ حضرت داؤدؑ کو لحن و نغمہ میں بھی ید طولیٰ عطا کیا گیا۔ شاید اسی لیے پہاڑ اور طیور کو حکم دیا گیا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر تسبیح کریں۔ ان کی نغمگیں آواز کا ثبوت اس حدیث سے ملتا ہے جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کے لحن قرآنی کے بارے میں فرمائی تھی۔ لقد اوتی مزماراً من مزامیر آل داؤد (اس شخص کو داؤد کی خوش الحانی کا حصہ ملا ہے)

مگر یاد رہے کہ خوش الحانی کا صحیح استعمال تسبیح ہے نہ کہ تفریح۔

معلوم ہوا کہ انبیائے کرام کا علم کمالی ہے۔ اس کے عروج کو زوال نہیں۔ جبکہ انسانی تہذیب عروج و زوال کے دائرے میں سفر کرتی ہے۔ فلاسفہ۔ ماہرین تاریخ۔ سائنس اور آثار قدیمہ نے عروج و زوال کے بہت سے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ جرمن فلسفی اسپنگلر (Spengler) زوال کو عروج کا ایک فطری تو ارد قرار دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی زندگی کے لیے موت ہے اس نے پیش گوئی کی ہے کہ مغربی تہذیب زوال کے دہانے پر آ لگی ہے (زوال مغرب (Decline of the west) برطانوی مورخ ٹوائن بی (Toynbee) تاریخ کی روشنی میں دعویٰ کرتا ہے جب لوگ عصری تقاضوں سے بے نیاز ہو کر اپنی افادیت کھو دیتے ہیں تو تہذیب کا زوال ہو جاتا ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین متفق ہیں کہ ماحول سے بے رخی تہذیبوں کو مٹا دیتی ہے، سائنس کا خیال ہے کہ قدرتی سامان معیشت کے غلط استعمال سے تہذیب کو زوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حالتیں جو مختلف ماہرین نے پیش کی ہیں فساد فی الارض کی مختلف شکلیں ہیں۔ انکے متعلق قرآن عظیم کا ایک ابدی اور حتمی تجزیہ یہ ہے کہ تکبر علمی اور بداعمالیوں کی کثرت کی وجہ سے انسان خود اپنے اوپر تباہی مسلط کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ ایسی دنیاوی سزاؤں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جو تہذیبوں کے عروج کو زوال میں تبدیل کر دیتی ہیں ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ (۲۱/ الروم - ۴۱) خشکی

اور تہ بی پر فساد برپا ہوگیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے تاکہ مزا چکھائے ان کو ان کے بعض اعمال کا۔ شاید کہ وہ باز آجائیں) حالیہ ماہرین سائنس بھی انسانی بدکرداریوں کو ارضی تغیرات کا محرک سمجھنے کی طرف گریز کر رہے ہیں۔

ہاروے ڈے (Harvey Day) اپنی کتاب " اهتزاز کی پوشیدہ طاقتیں" (Hidden Powers of vibration) میں دعوی کرتا ہے کہ " جب دنیا میں بہت زیادہ برائیاں پھیل جاتی ہیں، تو زمین کا ہالہ (Aura) مکدر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے طغیانیاں۔ زلزلے اور لاوے کی شکل میں زمین سے اخراج دھماکے۔ حد درجہ گرمی اور سردی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔[1] یہ حالتیں ترقیات کا گلا گھونٹ دیتی ہیں اور تہذیبیں زمیں دوز ہو جاتی ہیں۔

اگرچہ اس سائنسی دعوے کی توثیق ابھی وقت کا انتظار کر رہی ہے۔ مگر حکمت قرآنی گویا ہو چکی ہے " لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ " اس کا جواز مشیت ایزدی کے علاوہ ابتذال کردار انسانی میں ملتا ہے۔ ابتذال کی وجہ سے دنیاوی سزائیں ہیں اور سزاؤں کے بعد ملیامیٹ۔ ترقیاتی کاروبار اتھل پتھل اور تہذیبیں الٹ پلٹ۔ سزاؤں کی ایک فہرست قرآن میں ملتی ہے۔ (۱) فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (پھر ہم نے کسی پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی) (۲) وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ (اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا) (۳) وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ (اور کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا) (۴) وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا (اور کسی کو غرق کر دیا) (۲۰) عنکبوت ۔ ۴۰) سزا ہے تہذیب کو عذاب کی پیشگی تیاری ہیں۔

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر منیر حسن۔ قرآن مجید میں سائنسی ترقی کے تذکرے۔ بشکریہ فاران مارچ ۱۹۸۲ء

اور سزاؤں کا دوام (Perpetuation) تہذیبوں کے لیے دعوت اجل ہے۔

آخر کلام یہ ہے کہ (۱) ترقیاتی علوم کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ مگر ترقی کی آخری حد دانش نبویؐ ہے (۲) حکمت قرآنی کے بغیر ترقیاتی علوم ترقی معکوس ہیں (۳) ترقیاتی علوم کا غیر معتدل استعمال فساد کی جڑ ہے (۴) اعتدال کی راہ قرآن سے ملتی ہے (۵) فساد فی الارض کے لیے عذاب فی الارض اور عذاب فی الآخرہ ہے (۶) عذاب انسانی بد اعمالیوں اور بد کرداریوں کا فطری نتیجہ ہے (۷) نظام فطرت میں عذاب ایک خود کار کیفیت ہے (۸) اس کیفیت کا ظہور تہذیبوں کے لیے پیمانۂ اجل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ترقی دعوت انتشار ہے۔ ترقی "تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ" کے لیے ایک بڑا چیلنج ہے۔ ترقی تہذیبوں کے لیے شاہراہ اجل ہے۔ الّا یہ کہ ان کی بنیاد حکمت القرآن پر ہو اور اس کا عمل درآمد سنت رسولؐ کا تابع ہو۔

مصر کے مشہور ادیب و صحافی احمد حسن الزیات

از جناب ابو سفیان اصلاحی شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

"ادب اللذت" سے ان کی مراد وہ ادب ہے جسے فرانسیسی (La-delectation literature) کا نام دیتے ہیں۔ اس قسم کے ادب سے حلاوت و لذت تو ملتی ہے لیکن اس کا کوئی تعمیری پہلو نہیں ہوتا۔ یہ ادب خوشگوار لیکن روحانیت سے خالی ہے۔ یہ صرف تضیع اوقات کا ذریعہ ہے اس سے نہ قوم میں بیداری آسکتی ہے اور نہ اس طرح کے غیر تعمیری ادب سے لوگوں کو روحانی سکون مل سکتا ہے[۱]۔

اس وقت غیر مفید ادب کے دام تنزویر میں مصری قارئین گم ہیں اور سطحی اور عامیانہ لٹریچر کے شیدائی ہو گئے ہیں۔ اس وبا اور بیماری کا علاج چیخ و پکار نہیں ہے بلکہ انداز فکر کی تبدیلی نصاب تعلیم کی اصلاح استاد کی تربیت ہے، درس و تدریس میں گہرائی اور مطالعہ کا خوگر بننے ہی سے اس کا علاج ہو سکتا ہے[۲]۔ غرض ادب اللذۃ سے معاشرہ کے اندر برائیاں پروان چڑھتی ہیں اور لوگوں میں بے راہ روی عام ہوتی ہے۔ زیات ادب المجون (غیر سنجیدہ ادب) کا تعلق زندگی

---

[۱] وحی الرسالہ ۳/۲۱۶-۲۱۷ [۲] ایضاً ۳/۲۱۷-

کی تمام چیزوں سے بتاتے ہیں۔ دراصل انسانی زندگی مختلف و متضاد اشیاء کا مجموعہ ہے۔ یہ شرم و حیا، بے حیائی و بے غیرتی، صلاح و پاکیزگی، فسق و فجور، بغض و عناد، محبت و الفت، امن و سکون اور خلفشار و بے اطمینانی جیسی متضاد صفات سے عبارت ہے۔ شاعر و مصنف اور مصور کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ان مختلف امیال و عواطف کی تصویر کشی کرے۔ البتہ جذبات کی سچی تعبیر کا نام فن ہے۔ ادب المجون دنیا کے تمام ادبیات میں موجود ہے۔ عربی ادب میں یہ اس وقت سے موجود ہے جب سے عربوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ امراء القیس، نابغہ، بشار، ابن ابی ربیعہ ابونواس، ابن ایاس، ابن سکرہ، ابن حجاز اور بعد کے شعراء میں حافظ الرصافی (۱۹۰۰۔۱۹۷۶) امام العبد اور الہرادی کے یہاں یہ صنف ادب موجود ہے۔ ان شعراء نے "ادب المجون" کو عام لوگوں کے بجائے صرف اپنے لیے کہا۔ وہ اپنی باتوں کو رازدارانہ انداز میں کہہ کر لطف اندوز ہوئے اور ان کو برسرِ عام بیان کرنے سے اجتناب کیا۔ اسے عام مجلسوں میں نقل کرنے کے بجائے اپنی مخصوص محفلوں تک محدود رکھا۔ حیا فطرت انسانی کا خاص جوہر ہے چنانچہ حضرت آدمؑ و حوا نے حیا کی وجہ سے ہی اپنے اجسام کو اوراق جنت سے چھپایا۔ انہیں اس کا علم تھا کہ جسم کے بہت سے اعضاء ستر عورت کے درجے میں ہیں جن کی نمائش مناسب نہیں۔ جب شعراء کو خدا نے ہدایت دی اور اسلام نے انہیں علم و تہذیب سے آشنا کیا تو انہیں بھی یہ معلوم ہوا کہ بہت سے افکار و خیالات بھی ستر عورت کے مثل ہیں۔ ان کی اشاعت اور نمود و نمائش جائز نہیں ہے۔ گو خلوت میں ان کے اظہار کی آزادی ہے لیکن دین، قانون اور معاشرے کے اصول و ضوابط کی رو سے

انھوں نے ان کو منظر عام پر لانے سے گریز کیا اور انسانیت اور معاشرے کی بھلائی کے خیال سے ان کی تصویر کشی پسند نہیں کی[۱]

"ادب مجون" کا تعلق ضمیر اور دین سے ہے اس لیے اس میں ہر موقع پر عام لوگوں کی رعایت ضروری ہے، الزیات نے واضح الفاظ میں ادب مجون کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ ہر چیز کو بر ملا اور علی الاعلان کہنے کا استحقاق ادبار و شعراء کو نہیں۔ موقع و محل کی نزاکت لازمی ہے۔ بشار نے جب اپنے بعض اشعار میں انسانی شرافت کا پاس و لحاظ نہیں رکھا تو عوام اس کی جان کے پیچھے پڑ گئے۔ تاکہ انسانی عظمت و کرامت محفوظ رہے اور پردہ نشین مستورات کی عزت و حرمت پر آنچ نہ آئے۔ مالک بن دینار نے بشار کی ضلالت کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔ ما شیئ ادعی لاهل هذه المدينة الی الفسق من اشعار هذا الاعمی الملحد ترجمہ: اس اندھے ملحد کے اشعار سے بڑھ کر کوئی چیز اس شہر والوں کیلئے موجب فسق و فجور نہیں۔ جب بشار کی شوخی اور غیر سنجیدگی حد سے تجاوز کر گئی تو خلیفہ مہدی نے یہ حکم صادر کیا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے[۲]

ادب لذت اور ادب مجون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ادب لذت میں لطف اندوزی کے لیے تمام بندشوں کو توڑ دیا جاتا ہے۔ مذہب، قانون اور معاشرہ کی گرفت سے ادبار و شعرا خود کو آزاد تصور کرتے ہیں اور ادب مجون میں فطرت و کائنات کی تمام چیزیں ہوتی ہیں، لیکن ادب مجون کا علمبردار ادیب معاشرے کی قدروں، مذہب کی نزاکتوں اور قوانین کی حکمتوں کو مدنظر رکھتے

---

[۱] وحی الرسالہ ۲۱۹/۳ [۲] ایضاً۔

ہوئے کچھ کہنے اور کرنے کی جرات نہیں کرتا ہے۔

معاشرتی مقالات | ادبی مقالات کے بعد معاشرتی مقالات پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے۔ الزیات مصری معاشرہ کی کئی پہلوؤں سے اصلاحات کے خواہاں تھے ایک تو ازہر کو اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ مصری قیادت اس کے ہاتھوں میں آسکے دوسرے عربوں کے اتحاد کو مستحکم کرنا چاہتے تھے اور تیسرے عربی زبان کو مصر اور بلاد عربیہ میں سرکاری حیثیت سے نافذ کروانا چاہتے تھے۔ وہ عربی زبان کو دوسری زبانوں کے مقابلے میں اعلیٰ خیال کرتے تھے۔

الزیات مقالہ "رسالۃ الازہر" میں رقمطراز ہیں کہ مصر کے اندر ازہر کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ زبان، مذہب اور رشد و ہدایت کا اسے منبع تصور کیا گیا لیکن افسوس کہ ازہر اپنی ذمہ داریوں کو نباہنے سے قاصر رہا۔ اللہ تعالیٰ نے تاریخی حیثیت سے ازہر کو نمایاں مقام عطا کیا۔ اسے بہت سی سہولتیں میسر ہیں، مالیات کا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تبلیغ دین پر پوری طرح قادر ہے۔ وہ امت مسلمہ کے رخ کو بآسانی تبدیل کر سکتا ہے اور دینی عقائد میں پیدا ہو جانے والی خرافات اور خرابیوں کو ختم کر سکتا ہے[۱]۔ ازہر کی عزت تمام مصریوں کے دلوں میں ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے ازہر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن افسوس کہ مصری معاشرہ کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے۔ اس بنا پر وہ اس کے مندرجہ ذیل فرائض بتاتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں جو غلط عقائد داخل کر لیے گئے ہیں انہیں نکالا جائے اور یہ

۱۔ وحی الرسالہ ۲/۳۰۔

اس وقت ممکن ہے جبکہ قرآن مجید کی صحیح تفسیر روایات واحادیث، سلف صالحین کے اقوال اور ائمہ اعلام کی مستند آراء سے کی جائے۔ صحاح ستہ سے حدیث کا ایک مستند اور جامع مجموعہ مرتب کیا جائے۔ اس کی تشریح و تبویب کے لیے علم تاریخ، فلسفہ، اخلاقیات اور معاشرتی علوم سے مدد لی جائے۔ اس کے بعد فقہ کی ایک ایسی جامع کتاب تیار کی جائے جو مذاہب حقہ پر مبنی اور قانونی درجہ رکھتی ہو۔ پھر اس کی ایسی شرح کی جائے جو قانون کے تمام اصول و فروع کا احاطہ کرلے۔ ان کتابوں کو نصاب میں داخل کر دیا جائے اور انہیں قانون کا مرجع قرار دیا جائے۔ انہی سے فتاوے صادر کیے جائیں۔ یہ کتابیں پہلے ازہر میں داخل کی جائیں اس کے بعد عوام تک لائی جائیں اور اس کے بعد ان کا مشرق و مغرب کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ کرکے انہیں اسلامی و غیر اسلامی ممالک میں پھیلایا جائے۔ میوزیم میں آثار قدیمہ کی حفاظت کی طرح ان سب کتابوں کو لائبریریوں میں رکھا جائے تاکہ محققین انہیں پڑھ سکیں اور جس طرح امیرالمومنین حضرت عثمان غنیؓ نے تمام مصحف کی جگہ صرف اپنے عہد میں تیار کردہ مصحف کو ملت اسلامیہ میں رائج کیا تھا۔ اسی طرح ان کو بھی رائج کیا جائے[1]

۲۔ دوسرا کام ازہر کا یہ ہے کہ اشاعت اسلام کے لیے ایسے مبلغین تیار کرے جو صاحب زبان، صاحب کردار اور صاحب تقویٰ ہوں۔ یہ بھی کوشش ہو کہ وہ جدید تہذیب اور زندہ زبانوں سے آشنا ہو جائیں۔ مہبط وحی اور عرب ممالک کے علاوہ انہیں دوسرے ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے پاس بھیجا جائے ازہر اسلامی وفود کی تشکیل و تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔

---

[1] وحی الرسالہ ۳۱/۲۔

۳۔ ازہر کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ عربی زبان کو دنیا کے تمام مسلمانوں کی قومی زبان بنانے کے لیے جد و جہد کرے۔ روئے زمین پر بسنے والے مسلمانوں کی دو قومی زبانیں ہوں۔ ایک وطن اکبر کی زبان اور دوسرے وطن اصغر کی زبان۔ اس کے لیے ازہر دنیا کے تمام مسلمانوں کو عربی زبان سکھانے کے لیے معلمین تیار کرکے بھیجے۔[1]

ان تینوں چیزوں سے الزیات کے بلند فکر کا اندازہ ہو سکتا ہے اگر ازہر مذکورہ تینوں خطوط پر گامزن ہوتا تو اب تک دنیا کی بیشتر آبادی آغوش اسلام میں آچکی ہوتی۔ ان کے ان پیغامات سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ وہ مذہب اسلام کے تئیں کس درجہ مخلص اور اشاعتِ اسلام کے لیے کس قدر فکر مند رہتے تھے۔

احمد حسن الزیات نے مقالہ "حل سم لمشکلۃ الازھر" میں بھی ازہر کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اسے نت نئی تبدیلیوں کا حل تلاش کرنے کے لیے جدید عصری تقاضوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسلام ایک آفاقی اور دائمی مذہب ہے۔

انھوں نے ازہر کی غرض و غایت یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں کے اندر دینی بصیرت پیدا کرے۔ تمام علوم کا مرجع دین کو قرار دیا جائے۔ تفہیم دین کے لیے زبان سیکھی جائے اور مختلف فنون میں مہارت حاصل کی جائے۔ دین اور عربی زبان کو اپنے وجود کی شناخت بنائے۔ اشاعت اسلام اور تدریسی زبان کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرے۔ مذہب اسلام حالات کی نزاکتوں اور تقاضوں سے صرف نظر نہیں کرتا۔ نئے علوم کا خیر مقدم کرکے زمانے کے دوش بدوش چلتا ہے تاکہ پیش آمدہ مسائل کے حل نکالے۔

---

[1] وحی الرسالہ ۲/ ۳۲۔

عربوں کو بھی نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اقوام عالم سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ اس وقت موجود مسلمانوں اور عربوں کو سخت حالات کا سامنا ہے، خلافت عثمانیہ گردش روزگار کی نذر ہو گئی۔ مسلمانوں نے اسلام کی لچک کی صلاحیت سے غافل ہو کر اجتہاد کے دروازے بند کر دیے۔ اس لیے مغرب میں علم کا بول بالا ہوا اور وہ مسلمانوں سے آگے نکل گیا۔ مسلمانوں پر جمود و تعطل طاری ہو گیا۔ مصری یورپ کے دست نگر ہو گئے اور وہ اب یورپ سے ان چیزوں کو لینے لگے جن چیزوں کے حصول کے لیے یورپ کل تک خود ان کا محتاج تھا۔ یورپ میں تعلیم کی ترقی ہوئی لیکن ازہر کے اندر کوئی حرکت نہیں آئی۔ ہر طرف سے اس پر یلغار ہوئی، لیکن وہ خواب گراں سے بیدار نہیں ہوا۔ لوگوں کا ازہر سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ ان کے لیے عالم دین اور قائد ملت پیدا کرے لیکن ان کاموں کی طرف اس نے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ ان حالات سے تنگ آ کر حکومت نے زبان کی تدریس و تعلیم کے لیے "دار العلوم" کو قائم کیا۔ قانون کے لیے "مدرسۃ القضاۃ" کی بنیاد ڈالی اور ازہر کو صرف ایک میوزیم کا درجہ دے دیا گیا۔ جس میں بوسیدہ کتابیں اور فرسودہ خیالات عجائب کے طور پر محفوظ کر لیے گئے[1]۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الزیات کو ازہر سے کس قدر لگاؤ اور اس کے فرسودہ نظام سے کتنا دکھ تھا۔ در اصل وہ ازہر کو نئی تہذیب، نئے افق اور جدید تعلیم سے آشنا کرنا چاہتے تھے لیکن افسوس کہ ازہری شیوخ اپنے خول سے باہر نہ آ سکے اور وہ زبان کے ارتقاء اور قوم کی سیادت سے بے پروا رہے۔

---

[1] وحی الرسالہ ۲/۶۸ - ۶۹ -

ازہر کے سلسلے میں ان کے دو مقالات "اصلاح الازہر"[1] اور "الازہر بین الماضی والحاضر"[2] بھی اہم ہیں۔ ازہر کی اصلاح کے سلسلے میں بے شمار مقالات تحریر کیے گئے، اس بارے میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دونوں نے ازہر میں کی گئی اپنی تقریروں سے ازہری شیوخ اور اس کے ذمہ داروں اور طلبا کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔

معاشرتی اصلاح سے متعلق الزیات کا ایک نہایت اہم مقالہ "الجامعۃ الاسلامیۃ" ہے، وہ دنیا کے تمام مسلمانوں کو جسد واحد کے مانند تصور کرتے تھے اور ان سب کے لیے فکر مند اور بے قرار رہتے تھے، انہیں ایک لڑی میں پرونا چاہتے تھے اور اسلامی وحدت کو وقت کا اہم تقاضا اور مسلمانوں کی بیداری کو ضروری بتاتے تھے۔ انہیں اس کا قلق ہے کہ عرب ممالک کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے، جب کہ اس وقت اس کی شدید ضرورت ہے ان کے نزدیک صرف اسلام ہی دنیا کی موجودہ تباہیوں اور پریشانیوں کو دور کر سکتا ہے اور اسے امن و امان دے سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس وقت دنیا انتشار انارکیت اور لاقانونیت کا شکار ہے۔ ان حالات میں وحدت اسلامی کا نعرہ بہت کامیاب ہوگا۔ جس کو حاصل کرنے کے لیے مکمل جد و جہد ضروری ہے وہ اسلامی وحدت کے تصور کا سرچشمہ قرآن کو بتاتے ہیں کیونکہ ارشاد ربانی ہے "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" اسی اسلامی وحدت کا مظاہرہ حج میں ہوتا ہے، بس نظام الٰہی کو باہمی محبت، مساوات اور تعاون علی الخیر سے ہی فروغ مل سکتا ہے۔ مذہب اسلام ہی طبقہ واریت اور رنگ ونسل کے امتیازات

---

[1] وحی الرسالہ ۳/۴۳۔ ۲۰ [2] ایضاً ۲۹۴/۲۔ ۲۹۷

ختم کر سکتا ہے۔[1]

وہ زبان و وطن کے نام پر وحدت اسلامی کو ختم کرنے کی کرنے کی کوششوں کی مذمت کرتے ہیں اور یورپ کے اس پروپیگنڈا کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں کہ وحدت اسلامی کے تصور میں تعصب اور تنگ نظری کارفرما ہے۔ ان کے نزدیک اسلامی وحدت نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے ایک عظیم دولت اور نعمت ہے جو دنیا میں پھیلی تاریکی اور بربریت کا واحد حل بھی ہے۔

الزیات اسلام، عرب قومیت اور اسلامی وحدت کی طرح عربی زبان کی قدر و منزلت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ اپنے مقالہ "العربیۃ جزء من حقیقۃ الاسلام" میں رقمطراز ہیں کہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ عربی زبان اسلام کا ایک اہم جزء ہے۔ عربی زبان وحی الٰہی کی ترجمان، کتاب مقدس کی زبان اور رسول خدا کا معجزہ نیز آپؐ کی تبلیغی زبان رہی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال سے اس زبان کو مزید زینت بخشی۔ اشاعت اسلام کے ساتھ عربی زبان کی بھی اشاعت ہوئی۔ تحفظ قرآن نے اسے دوام بخشا۔ یہ عرب نیز ملت اسلامیہ کی مقدس زبان ہے، اس زبان کو سیکھ کر اسلام کی اساس تک پہنچا جا سکتا ہے اور یہ اسلامی وحدت پیدا کرنے میں بھی مدد و معاون ہو سکتی ہے ان تمام وجوہ سے وہ عربی زبان کے تحفظ کیلئے ہر ممکن کوشش کو ضروری قرار دیتے ہیں

دینی مقالات | ادیب زیات کے جن ادبی اور معاشرتی مقالات پر بحث کی گئی ہے ان سب میں بھی دینی عنصر نمایاں ہے، وہ جس موضوع پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں اس میں قرآن و حدیث ہی سے دلائل پیش کرتے رہے، اس کی مزید وضاحت

---

[1] : ۱۔ الرسالہ ۲/۲۴۸-۲۴۹۔

کے لیے ہم ان کے دینی مقالات پر علیحدہ بحث کرتے ہیں۔

الزیات کا ایک مقالہ "القرآن والدستور" ہے اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ قرآن ایک ایسا مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے سامنے دنیا کے تمام ضوابط و قوانین کھوکھلے ہیں۔ جو لوگ قرآن کو مہلک مجموعہ قرار دیتے ہیں وہ ان کی عقل و دانش پر ماتم کرتے اور کہتے ہیں کہ اگر ان خطرات و اندیشوں کو ظاہر کرنے والے اہل ایمان میں سے ہیں تو انہیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ یہ الہامی کتاب ہے جو اب تک نہ تو منسوخ ہوئی اور نہ ہی اس میں ذرہ برابر کوئی تبدیلی ہوئی۔ چودہ سو سال سے محفوظ و مامون منتقل ہوتی چلی آرہی ہے۔ آج تک اس الہامی کتاب سے بہتر یا اس جیسی کوئی کتاب ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ اگر قرآن پر الزامات تھوپنے والوں کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اسے الہامی کے بجائے انسانی کتاب مانتے ہیں تو آخر وہ اس سے خائف کیوں ہیں؟ انہیں کم از کم ایک بار تجربتاً اس کتاب کے قوانین کا نفاذ کرکے دیکھنا چاہیے۔ یہ لوگ اگر تاریخ پر نظر ڈالیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ بعثت رسولؐ سے قبل دنیا کا حال کس قدر ابتر تھا مگر قرآن نے آکر دنیا کو ہلاکت سے بچایا اور انسانوں کو صراط مستقیم پر گامزن کیا۔ دنیا کے سامنے ایک خوشگوار زندگی کا نقشہ پیش کیا اور اس تاریک دور میں قرآن نے عدل و مساوات کا چلن عام کیا۔ جس کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں تھی۔[1]

غرض الزیات قرآن کریم کو دنیا کے لیے رحمت اور سکون کا ایک ذریعہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا کی عافیت اور لوگوں کی طمانیت قلب کا سامان

---

[1] وحی الرسالہ ۳/۸۹۔

اسی کے پاس ہے۔ دوسرے مقالہ" ثورۃ فیہا النبوۃ" میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ دنیا میں آنے والے تمام انبیاء و رسل نے برائیوں کو ختم کر کے بھلائیوں کو عام کیا آج بھی رسول کی اطاعت ہی سے دنیا میں سکون ممکن ہے۔ انبیا علیہم السلام وحی الٰہی اور ہدایت ربانی کی تعلیم و تلقین کے لیے دنیا میں مبعوث کیے گئے تھے، انکا مقصد اصلاح و انقلاب تھا۔ انھوں نے حصول اقتدار، مادی اغراض اور دنیاوی فوائد کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا، خاتم المرسلین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعٰلمین بنا کر مبعوث کیے گئے۔

الزیات نے اسوۂ رسول کو خیر و سلامتی اور فوز و فلاح کا ضامن بتایا ہے، وہ قرآن کریم اور احادیث رسولؐ پر کامل یقین رکھتے تھے۔

اسلوب الزیات کے معاشرتی، ادبی اور مذہبی مقالات ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور خود الرسالہ میں الزیات ہی کی کوششوں سے اکیس سال تک ہزاروں مقالات شایع ہوئے۔ الزیات اور الرسالہ اسکول کے عربی ادب پر گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ زبان، مقالہ نگاری، قصیدہ گوئی، قصہ نویسی، مباحثہ، تنقید نگاری اور تراجم کے ارتقا میں الرسالہ کا غیر معمولی کارنامہ ہے[1]۔ الزیات کے ان کارناموں کو دیکھتے ہوئے انور الجندی کی اس بات سے اتفاق ممکن نہیں کہ الزیات نے ادب میں کوئی نیا طریقہ ایجاد نہیں کیا[2]۔ کیا یہ الزیات کا اہم کارنامہ نہیں کہ الرسالہ کا اجرا انھوں نے ایک ایسے وقت میں کیا جبکہ علمی دنیا

---

[1] المجمع العلمی بدمشق (اکتوبر ۱۹۶۸ء) ص ۷۰۶ [2] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۴۶۶۔

کسی ادبی رسالہ سے محروم تھی۔

یہ بھی الزیات ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے الرسالہ کے ذریعہ ایک ایسے وقت میں عرب قومیت کی حمایت اور اسلام کا دفاع کیا جس وقت ہر طرف عرب قومیت اور اسلام کے خلاف شورش بپا تھی۔ انھوں نے عربی ادب اور مغربی ادب سے غور و خوض کے بعد کچھ لینے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ اس سے پہلے کے مجلات صرف مغربیت کے دلدادہ تھے۔ الزیات نے قدامت اور جدیدیت کے مابین ایک درمیانی راہ بنائی[1]

احمد حسن الزیات کی تحریروں میں جھول، ثقالت، ژولیدگی اور ابہام نہیں ہوتا وہ بات صاف ستھرے اور سلیس انداز میں کہنے کے عادی تھے۔ ان کے مقالات میں وقار، متانت اور سلاست موجود ہے۔ زبان میں وہ حلاوت ہے کہ قاری کو کہیں بار اور گرانی کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ سب چیزیں ایک ایسے مقالہ نگار کے یہاں ملیں گی جو حساس اور اختراعی ذہن کا مالک ہو۔ یہ چیز ریاضت و اکتساب سے نہیں حاصل ہوتی۔ الزیات کی اختراعی صلاحیت کا اندازہ "ربیعک فی نفسک" سے کیا جا سکتا ہے۔

وہ الفاظ اور جملوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور یہ بھی خیال رکھتے کہ الفاظ و جملوں کے درمیان بات گم نہ ہونے پائے، وہ ہر بات کو خوبصورتی سے پیش کرتے اور اسی کو اپنا مسلک بتاتے ہیں۔

الزیات کی تحریروں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ جہاں ان کے یہاں غوض

---

[1] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۶۶۷۔

نہیں ہے وہیں ان کی عبارتیں فکری تضاد سے بھی پاک ہیں۔ وہ اپنے موقف پر ہمیشہ ڈٹے رہے کبھی ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہ آئی۔ وہ ہمیشہ عرب قومیت، عربی زبان اور اسلام کی حمایت بہانگ دھل کرتے رہے۔ اس کے متعلق انھوں نے بیشمار مقالات تحریر کیے۔ وہ یورپین تہذیب اور غیر ملکی زبان کو اہمیت نہیں دیتے تھے اسکے لیے معاصرین اور با رسے انکی معرکہ آرائی بھی رہی لیکن زندگی کی آخری سانس تک اپنے موقف کی وکالت کرتے رہے۔

الزیات اپنے مقالات میں اپنے نظریات کی تبلیغ و ضاحت کے ساتھ کرتے رہے انھوں نے نظریاتی اعتبار سے خود کو فروخت نہیں کیا۔ مذہب پر قرآن و حدیث سے استدلال کرتے اور ادبی معاملات میں بھی قرآن و حدیث ہی کو معیار و محور قرار دیتے۔ وہ ایک آزاد صفت انسان تھے، انکے یہاں ضمیر فروشی غیر انسانی فعل ہے۔

الزیات کی تحریروں سے انکے نظریات پوری طرح عیاں ہیں اور انھوں نے ان تمام نظریات کو اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ انور الجندی کا خیال ہے کہ الزیات کے یہاں بلیغ اسلوب" صاف ستھری عبارت، ہلکے پھلکے جملے، تنقیدی بصیرت اور اختراعی ذہن پایا جاتا ہے[1]

لطفی منفلوطی کا انداز تحریر الزیات کے اسلوب تحریر سے بہت قریب ہے منفلوطی کی "النظرات" اور "العبرات" کے پس منظر میں زیات کے مقالات کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں کے سبک پن اور عبارت کی سلاست و روانی میں کافی یکسانیت نظر آئے گی[2] منفلوطی نے عربی ادب میں ایک نئے اسلوب کی بنیاد ڈالی اور انشاپردازی کا جو ایک نیا اسکول قائم کیا تھا۔ اس اسکول سے متاثر ہونے والوں میں رافعی، طٰہٰ حسین اور الزیات قابل ذکر ہیں[3]

---

[1] المحافظة والتجديد فی النثر العربی ص ۴۶۶ [2] ایضاً ص ۱۸۸ [3] ایضاً ص ۱۸۸۔

علامہ اقبال کی چند پیشین گوئیاں

جناب انعام الحق عسلی، عثمان دان فودیو یونیورسٹی سکوٹو۔ نائیجیریا۔

علامہ اقبال کو ہم سے رخصت ہوئے پچاس برس سے اوپر ہو چکے ہیں اور یہ نصف صدی "دگر دانائے راز" کی منتظر ہی رہی۔ اس مدت میں اقبال کے معتقدین اور ناقدین نے ان کی شخصیت اور کلام پر گراں قدر کام کیا اور انکے کلام کے کتنے پوشیدہ گوشے نمایاں کیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنے عرصہ بعد بھی ان کی فکر کی بلندی اور نظر کی گہرائی ہماری گرفت میں پوری طرح نہیں آسکی ہے مگر یہ ان کے قارئین کا عجز نہیں اقبال کا اعجاز ہے۔ دراصل اقبال کئی جہتوں کے شاعر تھے۔ گو قدرت نے ان کو فلسفی کا دماغ، صوفی کا دل، مورخ کی نظر اور شاعر کی زبان عطا کی تھی لیکن ان کی مملکت شعر پر ہمیشہ دل کی حکمرانی رہی اور اگرچہ وہ ایک مجذوب فرنگی کو خراج عقیدت بھی پیش کرتے ہیں اور ایک یہودی کے لیے 'نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب' بھی کہتے ہیں لیکن درحقیقت اسرار جاں انھوں نے رومی ہی سے پڑھے تھے

چوں بہ رومی در حرم دادم اذان من   از و آموختہ اسرار جان من

اور یہی وجہ ہے کہ گو وہ اپنے علمی، ادبی اور فکری سفر میں کئی مراحل سے گذرے لیکن بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچے کہ ع اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

چراغ مصطفوی کی روشنی میں فکر و فراست کی جو گذرگاہ اقبال نے طے کی اور جنوں کی رہنمائی میں آگہی کی جس منزل پر وہ پہنچے وہاں سے انہیں وہ وادیاں بہت صاف نظر آرہی تھیں جہاں پر مستقبل میں عشق کے قافلۂ سخت جاں کو گذرنا تھا۔ انکی دوررس نگاہ میں آنے والا جہاں پوری طرح روشن تھا اور اسی لیے انھوں نے دعوت دی تھی۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینہ گفتار میں آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

حقیقت بھی یہی ہے کہ مستقبل کے متعلق اقبال نے جو کچھ کہا آج سچ بن کر سامنے ہے۔

بلاشبہ غیب کا علم اللہ اور صرف اللہ کو ہے۔ یہ اسی کا منصب ہے کہ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعہ اور ہر حرکت کا مکمل علم اسے ہو۔ لیکن کبھی کبھی اپنے فیصلے وہ پہلے سے بھی ظاہر کر دیتا ہے۔ سورۂ روم کی اولین آیات میں ایران کی شکست اور روم کی فتح کا فیصلہ سنا دیا جو دس سال کے عرصہ میں ظاہر ہو گیا۔ تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ اور اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ میں دشمنان اسلام کی پسپائی اور نامرادی کا فیصلہ کر دیا اور وہ پورا ہو کر رہا۔ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کہہ کر آنحضورؐ کو مقام محمود کی خوشخبری دی جو یقیناً آپؐ کو مل گیا۔

اپنے علم غیب کا کچھ حصہ جب وہ اپنے پیغمبروں کو عطا فرماتا ہے تو وہ بھی آنے والے واقعات کی جانب اشارہ کر دیتے۔ جس کی سب سے بڑی اور روشن مثال 'نوید مسیحا' ہے۔ اس کے علاوہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی جو فوراً یا کچھ دیر بعد ظہور میں آئی۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کی شہادت کی نوعیت کے بارے میں آپؐ کی واضح اور صریح پیشین گوئی تھی جو آپؐ کی وفات کے تقریباً چوتھائی صدی بعد پوری ہوئی۔ اسی چشمۂ فیض کے کچھ

جرعات اللہ کے برگزیدہ بندوں کے نصیب میں بھی آتے ہیں"۔ "ہنوز دلی دور است" کا زبان سے نکلنا اسی علم کا فیضان ہے۔

پیشین گوئی کی ایک قسم ہوتی ہے جو مورخ کرتا ہے۔ مورخ سے مراد وہ تاریخ نگار نہیں جو ماضی کی داستانیں قلمبند کرتا ہے بلکہ وہ بالغ نظر، دور اندیش اور صاحب بصیرت مفکر ہے جو ماضی اور حال کے واقعات کو غیر جانبدار اور غیر جذباتی ہو کر دیکھتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر نظر رکھتا ہے اور منطقی طرز فکر سے ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہی صاحب بصیرت مفکر حال کے آئینے میں مستقبل کی دھندلی سی جھلک دیکھ کر اس سے دنیا کو آگاہ کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ تنبیہات یا پیشین گوئیاں جزئی تفصیلات سے خالی ہوتی ہیں لیکن آنے والے دنوں کے رجحانات کا پتہ یقیناً دیتی ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت عمرؓ کی اس پیشین گوئی میں ملتی ہے جو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی نرم طبیعت و صلہ رحمی کی عادت اور دوسری جانب عربوں کی قبائلی عصبیت کو سامنے رکھ کر ان کی شہادت کے بارے میں کی تھی یا جیسے کہ اس صدی کے شروع میں علامہ شبلیؒ نے کہا تھا کہ

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں کہ اب امن و امان شام و نجد و قیرواں کب تک

بظاہر یہ شعر الہامی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک صاحب بصیرت مورخ کی نظر تھی جس نے ستر اسی سال بعد آنے والے واقعات یا رجحانات کی نشاندہی کی تھی۔

اقبال پیغمبر تھے نہ ولی۔ ان کا تمام علم اکتسابی تھا۔ لیکن ان کے تاریخی شعور، فراست اور دور رس نگاہ نے باطنِ ایام ان پر روشن کر رکھا تھا۔ تاریخ کے عمل پر ان کی دوربینی نے ان سے کچھ ایسے اشعار کہلوائے جو اگرچہ حالات حاضرہ کی

روشنی میں دیکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہی واقعات کی خبر دے رہے تھے۔ ذیل کی سطور میں ایسی ہی چند پیشین گوئیوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

اشتراکیت اقبال کے آخری دور کی مشہور نظم ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ"۔ ابلیس اپنے مریدوں سے کہتا ہے

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

پھر مزید کہتا ہے

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
آشکارا ہو نہ جائے شرعِ پیغمبر کہیں

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

یہ واضح رہے کہ یہ اشعار اس دور کے ہیں جب تمام عالم اسلام پر ایک مایوسی کا عالم طاری تھا۔ خلافت کے خاتمہ کو چند سال ہی گذرے تھے اور کوئی ایسی تحریک عروج پر نہیں تھی جو امت مسلمہ کی شناخت بن سکتی۔ خاکستر اسلام میں چنگاریاں ضرور تھیں لیکن پھر بھی جس صورت حال نے حالی سے مسدس لکھوائی تھی کم و بیش وہی صورت حال اب بھی تھی۔ نمرود کی آگ ہر جگہ اولادِ ابراہیم کی منتظر تھی۔

اس کے برعکس یہ زمانہ کمیونزم یا اشتراکیت کے عروج کا زمانہ تھا پہلی جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت ایک فعال نظریۂ حیات کی صورت میں سامنے آئی تھی اور نہ صرف روس نے اس کو قبول کر لیا تھا بلکہ اُس وقت اس کے ہاتھوں ایشیا کا خرقۂ دیرینہ بھی چاک ہو رہا تھا۔ برصغیر میں اکثر تعلیم یافتہ مسلمان اپنے کو اشتراکی کہنا فخر سمجھتے تھے مارکس اور لینن کے حوالے سے بات کرنا دانشوروں کا فیشن تھا۔ خود مسلمان شعراء اور ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ اس نظریہ سے متاثر ہی نہیں بلکہ اس کا زبردست حامی

جرعات اللہ کے برگزیدہ بندوں کے نصیب میں بھی آتے ہیں"۔ "ہنوز دلی دوراست" کا زبان سے نکلنا اسی علم کا فیضان ہے۔

پیشین گوئی کی ایک قسم ہوتی ہے جو مورخ کرتا ہے۔ مورخ سے مراد وہ تاریخ نگار نہیں جو ماضی کی داستانیں قلمبند کرتا ہے بلکہ وہ بالغ نظر، دور اندیش اور صاحب بصیرت مفکر ہے جو ماضی اور حال کے واقعات کو غیر جانبدار اور غیر جذباتی ہو کر دیکھتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر نظر رکھتا ہے اور منطقی طرز فکر سے ان کا تجزیہ کرتا ہے۔ یہی صاحب بصیرت مفکر حال کے آئینے میں مستقبل کی دھندلی سی جھلک دیکھ کر اس سے دنیا کو آگاہ کرتا ہے۔ بلاشبہ یہ تنبیہات یا پیشین گوئیاں جزئی تفصیلات سے خالی ہوتی ہیں لیکن آنے والے دنوں کے رجحانات کا پتہ یقیناً دیتی ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت عمرؓ کی اس پیشین گوئی میں ملتی ہے جو انھوں نے حضرت عثمانؓ کی نرم طبیعت و صلہ رحمی کی عادت اور دوسری جانب عربوں کی قبائلی عصبیت کو سامنے رکھ کر ان کی شہادت کے بارے میں کی تھی یا جیسے کہ اس صدی کے شروع میں علامہ شبلیؒ نے کہا تھا کہ

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک

بظاہر یہ شعر الہامی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک صاحب بصیرت مورخ کی نظر تھی جس نے ستر اسی سال بعد آنے والے واقعات یا رجحانات کی نشاندہی کی تھی۔

اقبال پیغمبر تھے نہ ولی۔ ان کا تمام علم اکتسابی تھا۔ لیکن ان کے تاریخی شعور، فراست اور دور رس نگاہ نے باطنِ ایام ان پر روشن کر رکھا تھا۔ تاریخ کے عمل پر ان کی دوربینی نے ان سے کچھ ایسے اشعار کہلوائے جو اگرچہ حالات حاضرہ کی

روشنی میں دیکھے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہی واقعات کی خبر دے رہے تھے۔ ذیل کی سطور میں ایسی ہی چند پیشین گوئیوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

اشتراکیت اقبال کے آخری دور کی مشہور نظم ہے "ابلیس کی مجلس شوریٰ"۔ ابلیس اپنے مریدوں سے کہتا ہے

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

پھر مزید کہتا ہے

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
آشکارا ہو نہ جائے شرع پیغمبر کہیں

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

یہ واضح رہے کہ یہ اشعار اس دور کے ہیں جب تمام عالم اسلام پر ایک مایوسی کا عالم طاری تھا۔ خلافت کے خاتمہ کو چند سال ہی گذر رہے تھے اور کوئی ایسی تحریک عروج پر نہیں تھی جو امت مسلمہ کی شناخت بن سکتی۔ خاکستر اسلام میں چنگاریاں ضرور تھیں لیکن پھر بھی جس صورت حال نے حالی سے مسدس لکھوائی تھی کم وبیش وہی صورت حال اب بھی تھی۔ نمرود کی آگ ہر جگہ اولادِ ابراہیم کی منتظر تھی۔

اس کے برعکس یہ زمانہ کیمونزم یا اشتراکیت کے عروج کا زمانہ تھا پہلی جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت ایک فعّال نظریۂ حیات کی صورت میں سامنے آئی تھی اور نہ صرف روس نے اس کو قبول کر لیا تھا بلکہ اُس وقت اس کے ہاتھوں ایشیا کا خرقۂ دیرینہ بھی چاک ہو رہا تھا۔ برصغیر میں اکثر تعلیم یافتہ مسلمان اپنے کو اشتراکی کہنا فخر سمجھتے تھے مارکس اور لینن کے حوالے سے بات کرنا دانشوروں کا فیشن تھا۔ خود مسلمان شعراء اور ادیبوں کا ایک بڑا طبقہ اس نظریہ سے متاثر ہی نہیں بلکہ اس کا زبردست حامی

تھا اور بالآخر اپنے گروہ کو 'ترقی پسند تحریک' کا نام دے کر اشتراکی نظریہ کی تبلیغ کو اپنا مسلک اور شعار بنا لیا تھا۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا تھا کہ اشتراکیت کا سیلاب سب کچھ بہا لے جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد حالات اور ابتر ہو گئے۔ روس مزید طاقتور اور اشتراکیت مزید فعال ہو گئی۔ سوائے تحریک پاکستان کے اس زمانے میں کوئی اور تحریک اسلام کے نام پر مبنی نظر نہیں آتی۔ خود یہ تحریک بھی ہندوستان کے رندان قدح خوار کی مستی تھی۔ بلاد عرب کا حلقہ زہاد تو ابھی تک مزاج خانقہی سے ہی آشنا تھا۔

ایک ایسی صورت حال میں ۔۔۔۔۔۔ ابلیس کے مشیر کار اس کو اشتراکیت کے خطرہ کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ مارکس کی تعلیمات کے نتائج سے آگاہ کرتے ہیں لیکن خود ابلیس کسی اور خیال میں ہے اسے علم ہے کہ جن نظریات کی بنیاد محض مادی آسودگی پر ہو وہ دنیا کو کہاں تک اور کب تک امن و سکون دے سکیں گے۔ اسی لیے وہ اپنے رفقاء کو اصل خطرہ سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد ۔۔۔ یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ مو

اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اقبال کے ان دونوں اشعار کی روشنی میں پچھلی دہائی کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے گویا ہر آنے والے واقعہ کا عکس ان کے آئینۂ ادراک میں موجود تھا۔ ایران کے انقلاب سے موجودہ عرب اور خلیج کی سیاسی صورتحال تک جس رفتار سے امت مسلمہ میں بیداری آئی ہے اور جس تیزی سے عالمی اخوت کا جذبہ مسلمانوں میں ابھرا کم سے کم

اس کا تصور اقبال کے زمانے میں تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب امت کے دین کی حقیقت کائنات کا احتساب ہو ابلیس کا اس کو فتنۂ فردا کہنا بے جا نہ تھا۔

دوسری جانب اشتراکیت ایک ایسی رقاصہ ثابت ہوئی جو اپنی دلکشی بھی کھو چکی ہو اور افادیت بھی۔ نئے چاہنے والوں کا تو سوال ہی کیا پرانے عشاق نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ مشرقی یورپ کے حالیہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ نظریہ جمہوریت کے دو تین تھپیڑوں کو بھی نہ سہہ سکا اور ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گیا۔

فلسطین | فلسطین میں اسرائیل کی ریاست کا قیام وہ تیر نیم کش ہے جو ابھی مسلمانوں کے جگر کے پار نہیں ہوا ہے۔ اس کا وجود کئی مسلم ممالک کی نااہلی اور کسی حد تک دینی بے حمیتی کی داستان بھی ہے۔ اگرچہ اسرائیل کا وجود اقبال کی موت کے دس سال بعد عمل میں آیا لیکن سیاسی افق پر جو بادل منڈلا رہے تھے اور صیہونیت کی عالمی تنظیم کی کوششیں جس انداز سے جاری تھیں اقبال ان سے ناواقف نہیں تھے۔ انھوں نے خبردار کر دیا کہ

رندانِ فرانسیس کا مے خانہ سلامت — پُر ہے مے گلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق — ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور — قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا

ابھی دوسری جنگ عظیم نہیں ہوئی تھی نہ ہی جرمنی کے یہودی نازیوں کا نشانہ بنے تھے، اسرائیل کے قیام کو ابھی کئی سال باقی تھے لیکن اقبال نے فلسطینیوں سے کہا کہ

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ — میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں — فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات   خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

اسرائیل کے قیام کو چالیس سال سے اوپر ہو گئے اس درمیان میں ہر روز کسی نہ کسی فلسطینی نے عروس وطن کو لہو کا نذرانہ پیش کیا ہے ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد سے انتفاضہ ایک جس خون کے دریا سے فلسطینی گذرا ہے اس کا دوسرا کنارہ ابھی نہیں آیا یہ سب کیا ہے۔ فقط خودی کی پرورش اور لذت نمود اور کچھ بعید نہیں کہ کل اسکے صلہ میں دنیا اس سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے! افراد کی زندگی میں جو نشیب و فراز چند برسوں میں وقوع پذیر ہوئے ہیں قوموں کو انہی کے لیے ایک صدی درکار ہوتی ہے۔

لیگ آف نیشنز | اقبال کی ایک اور پیشینگوئی لیگ آف نیشنز کے متعلق تھی۔ لیگ آف نیشنز کا خاتمہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۵ء میں ہوا یعنی اقبال کی موت کے سات سال بعد۔ لیکن انہیں پورا یقین تھا کہ یہ غیر موثر اور بڑی طاقتوں کی آلہ کار تنظیم زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے گی۔ ان کے خیال میں یہ کفن چوروں کی ایک جماعت تھی جس کا اصل کام آپس میں قبروں کی تقسیم تھا۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے   ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن   پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ   ابلیس کے تعویذ سے کچھ اور سنبھل جائے

مگر ابلیس کا تعویذ بھی اس داشتۂ پیرک افرنگ کو چند سال سے زیادہ زندہ نہ رکھ سکا۔

متفرقات | اس کے علاوہ اقبال کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جو ہو سکتا ہے ان کے زمانے میں کسی اہمیت کے حامل نہ ہوں لیکن موجودہ حالات کی روشنی میں الہامی نظر آتے ہیں۔

پچھلی دہائی میں افغانستان پر روس کے حملے اور اشتراکی حکومت کے باعث لاکھوں افغانوں کا ترک وطن کر کے جہاد کا اعلان کرنا ان کی اسلامی حمیت کی آئینہ دار ہے۔ اقبال ان اسلامیوں کے "سوز و ساز" سے ناواقف نہیں تھے۔ انکی ایک نظم میں ابلیس صاف صاف اپنے مریدوں سے کہتا ہے کہ

افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

اور ابلیس کے مریدوں نے اپنے پیر و مرشد کو مایوس نہیں کیا۔

ایران کا انقلاب اس صدی کی مسلم تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ہے۔ اسی کے اسباب و عواقب سے قطع نظر یہ بات مسلم ہے کہ جتنا اس تحریک نے مغربی دنیا کو اسلام اور مسلمانوں سے روشناس کرایا شاید اتنے کم عرصے میں کسی اور تحریک نے یہ کام نہیں کیا۔ عام طور سے ایک عام امریکن یا یورپین کا مسلمان کے بارے میں بس اتنا ہی علم تھا کہ یہ لوگ چار شادیاں کرتے ہیں اور غالباً شراب نہیں پیتے۔ بس۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے ہی انہیں یہ خبر دی کہ یہ قوم احتساب بھی کر سکتی ہے۔ خدا معلوم اقبال نے کس عالم میں کہہ دیا تھا کہ

طہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

یہاں طہران ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا بعض شعرا لہامی ہوتے ہیں۔

ایک حالیہ حادثہ سرزمین عرب پر امریکی بلکہ صحیح الفاظ میں غیر مسلم افواج کی آمد ہے جو وہاں کی حکومت کی دعوت پر اسکی حفاظت کے لیے آئی ہے۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کوئی مورخ یا مفکر مستقبل کی جزئی تفصیلات نہیں بتا سکتا اسی طرح اقبال کو بھی بلاشبہ یہ علم نہیں تھا کہ حالات بعینہٖ اس طرح پیش آئیں گے لیکن آیندہ رجحان کا اندازہ ہوتا ہے،

خودی کی موت سے پیر حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی

وفیات

آہ! مولانا عبدالمجید ندوی

از ضیاء الدین اصلاحی

افسوس ہے کہ ۲۳ مئی کو مولانا عبدالمجید ندوی صدر مدرس مدرستہ الاصلاح سرائے میر ایک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے تھے، رانی کی سرائے میں کوئی بچہ ان کی گاڑی کی زد میں آگیا، مگر ڈرائیور کی ہوشیاری سے وہ بالکل بچ گیا اور اسے کوئی چوٹ نہیں آئی، اس کے باوجود بعض شرپسند لوگوں نے پتھراؤ کیا۔ جس سے مولانا کے دماغ پر ضرب شدید آگئی اور اعظم گڈھ اسپتال میں انھوں نے دم توڑ دیا۔

مدرستہ الاصلاح میں متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہوئے، فراغت کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، پھر بی۔ ایڈ کے لیے شبلی کالج اعظم گڈھ میں داخلہ لیا۔ ندوہ کی آخری جماعت میں تفسیر کا درس مولانا عبدالباری ندوی فلسفی سے لیا۔ جن کی تعلیم و تربیت کا غیر معمولی اثر ان پر پڑا، وہ کئی برس تک ان کے ساتھ بھی

ان کے مکان میں رہے، اس سے ان کو بڑا علمی و دینی فائدہ پہنچا مگر باقاعدہ بیعت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے ہوئے۔

اعظم گڈھ میں وہ میرے ساتھ رہتے تھے، ان کے دینی ذوق و رجحان، مذہبی حمیت، شعائر دین اور ارکان اسلام کے احترام خصوصاً نماز کی پابندی اور اہتمام کی بنا پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور شاہ صاحب نے دارالمصنفین میں لائبریرین کی حیثیت سے ان کا تقرر بھی کیا مگر وہ اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہیں کر سکے۔ اس کے بعد مختلف وقتوں میں مدرستہ الاصلاح، جامعۃ الرشاد اور شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور ہر چند برس سے وہ مدرستہ الاصلاح کے مہتمم تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت تھی مگر اس کے لیے جس یکسوئی اور دلجمعی کی ضرورت ہے وہ انہیں میسر نہیں ہو سکی۔

ان میں اچھی انتظامی صلاحیت بھی تھی اور وہ ہر کام کو بڑے سلیقہ اور پوری ذمہ داری سے انجام دیتے تھے، نظم و نسق کے معاملہ میں کسی کے ساتھ بھی رو رعایت نہ کرتے اپنے اعزہ کو بھی کوتاہی کرنے پر معاف نہیں کرتے تھے، اسکی وجہ سے بعض لوگ انکے شاکی رہتے تھے مگر وہ کبھی کسی کی شکایت اور ناراضگی کی پروا نہ کرتے اپنی سخت گیری، ایمانداری اصول پسندی، ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ اور انتظامی لیاقت کی بنا پر اداروں کے منتظمین اور ذمہ داروں میں بہت مقبول تھے، ان کی صحت بہتر نہیں تھی۔ مگر ابھی پچاس برس سے زیادہ عمر نہیں رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

ادبیات

غزل

از جناب وارث ریاضی صاحب مغربی چمپارن بہار

گریۂ شبنم، گلوں کی چاک دامانی کی بات
کس نے سمجھا نکہتِ گل کی پریشانی کی بات

ذکرِ تاجِ خسروی، تختِ سلیمانی کی بات
اب تو چرچا ہے یہی کرتے ہیں جہاں بانی کی بات

جب سے بدلا ہے زمانے کا نظامِ اقتدار
راہزن کرتے ہیں منزل کی نگہبانی کی بات

خوگرِ جور و جفا ہیں ہوں مگر انکے لیے
بارِ رنج و غم اٹھانا ہے پریشانی کی بات

محفلِ زاغ و زغن میں نغمۂ دلکش عبث
ان کی بزمِ ناز میں ایثار و قربانی کی بات

شکوۂ جور و جفا بے سود ہے ان کے حضور
ذکرِ اخلاص و وفا ہے جہل و نادانی کی بات

آستینوں میں لیے پھرتے ہیں جو خنجر مدام
وہ بھی کرتے ہیں فلاحِ نوعِ انسانی کی بات

ہے زبانِ برہمن مصروفِ وردِ لا الٰہ
شیخ کے لب پر ہے زنّارِ سلیمانی کی بات

علم سے ناآشنا ہوں، عقل سے ہوں بے خبر
میں نہیں کرتا کسی صورت ہمہ دانی کی بات

عنصری و فرخی، بوالفضل و فیضی کی طرح
میں نے کب کی ہے امیروں کی ثناخوانی کی بات

باعثِ تسکیں ہے وارث! ہر گھڑی میرے لیے
مدحتِ خیرالبشرؐ، محبوبِ ربانی کی بات

مطبوعات جدیدہ

موضوعاتِ قرآن اور انسانی زندگی } مرتبہ جناب خواجہ عبدالوحید صاحب مرحوم، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۲۶۶، قیمت درج نہیں

پتہ: ادارۂ تحقیقات اسلامی، پوسٹ باکس ۱۰۳۵، اسلام آباد، پاکستان۔

خواجہ عبدالوحید مرحوم اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود اردو اور انگریزی کے اچھے اہلِ قلم تھے، ان کو قرآنی علوم سے بھی مناسبت تھی اور انھوں نے مشہور مفسر قرآن مولانا احمد علی لاہوری مرحوم سے تفسیر اور قرآنیات کا باقاعدہ درس بھی لیا تھا۔ زیرِ نظر کتاب ان کے تفسیری و قرآنی ذوق کا ثبوت ہے، اس میں انھوں نے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور شعبوں سے متعلق قرآنی آیات کا معنی خیز ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب مندرجۂ ذیل سات ابواب پر مشتمل ہے جن سے اسکی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ زندگی کا انفرادی پہلو، زندگی کا عائلی پہلو، معاشرتی زندگی، زندگی کا قومی اور بین الاقوامی پہلو، زندگی کا ثقافتی پہلو، زندگی کا معاشی پہلو، زوال و بربادی اقوام کے اسباب، ہر باب کے اندر مختلف فصلیں ہیں، جن کے تحت قرآنی تعلیمات بیان کی گئی ہیں، اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی ہدایت و رہنمائی کا مکمل سامان موجود ہے، یہ مفید کتاب خصوصیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین } مرتبہ پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۷۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت پچاس روپیے، پتہ: پبلی کیشن ڈویژن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

فلسفہ و طب میں شیخ ابن سینا کے کمالات و کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس کی سب سے مہتم بالشان اور شہرۂ آفاق تصنیف القانون ہے، جو شیخ کے دور سے لے کر اب تک کے طبیبوں کی تحقیق و دلچسپی کا خاص موضوع رہی ہے، ہر دور کے طبیبوں نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کی متعدد شرحیں اور حواشی ہر زمانے اور ہر دور میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ حکیم سید ظل الرحمٰن صدر شعبۂ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان گنتی کے لوگوں میں ہیں جن کے دم سے اب بھی طب یونانی کا چراغ مخالف ہواؤں میں روشن ہے، وہ ایک ذی علم اور صاحب ذوق شخص ہیں جو درس و تدریس کی مشغولیتوں اور اپنے شعبہ کی گوناگوں ذمہ داریوں کے باوجود تصنیف و تالیف میں بھی منہمک رہتے ہیں، اس کتاب میں انھوں نے تحقیق و محنت اور تلاش و جستجو سے قانون پر ہونے والے کاموں کا جائزہ لیا ہے اس سلسلہ میں عربی، فارسی، ترکی، اردو، پنجابی، لاطینی، عبرانی، انگریزی اور ازبکستانی زبانوں میں قانون کی جو شرحیں اور حواشی لکھے گئے ہیں یا اس کا جو ترجمہ و اختصار ہوا ہے انکے اور انکے مصنفین کے بارے میں مختصر معلومات فراہم کیے گئے ہیں، اس سے جہاں ابن سینا کی کتاب کی غیر معمولی اور بے مثال مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں خود لائق مصنف کی دیدہ ریزی اور ابن سینا

سے شغف کا پتہ چلتا ہے، فن طب اور ابن سینا سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

حیات کرم حسین مرتبہ حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۵۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے، تجارہ ہاؤس، دودھ پور علی گڑھ۔

راجستھان میں میوات سے متصل تجارہ مسلمان شرفا و رؤسا کی ایک نامور بستی تھی جو عرصہ تک اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ اور اہل علم و ادب اور اصحاب رشد و ہدایت کا مرکز تھی، یہاں کے ذاتی کتب خانے بیش قیمت کتابوں، اہم مخطوطات اور علمی نوادر کا مخزن تھے، اس کے پرشکوہ محل اور عظیم الشان حویلیوں سے بھی اسکے مکینوں کی ثروت و امارت کا پتہ چلتا تھا، مگر ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں یہ گہوارہ علم وثقافت ویران وتباہ اور مسلمانوں کے وجود سے یکسر خالی ہوگیا، کچھ لوگوں نے پاکستان کی راہ لی اور کچھ بھوپال میں متوطن ہوئے جہاں اس خانوادے کے بعض حضرات پہلے سے آباد تھے، حکیم سید کرم حسین بھی ۱۹۰۸ء میں تجارہ چھوڑ کر بھوپال منتقل ہوئے تھے، انھی کے پوتے حکیم پروفیسر سید ظل الرحمٰن صدر شعبہ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہیں جن کو علم و فن، تصنیف و تالیف اور طبابت کا ذوق اپنے ممتاز خاندان سے وراثتہً ملا ہے، اس کتاب میں انھوں نے اپنے جدامجد کے حالات و واقعات زندگی قلمبند کیے ہیں، پہلے ہندوستان میں اس خاندان کی آمد و اقامت کا ذکر کیا ہے جس کے ضمن میں اس کے بعض مشاہیر کا تذکرہ بھی کیا ہے، پھر صاحب ترجمہ کی ولادت، تعلیم، طب کی تحصیل، طبی مرگرمیں،

روزمرہ زندگی کے معمولات، علمی وادبی ذوق، تصنیفات، مذہبی شغف، قومی و ملی خدمات، بھوپال میں سکونت، علالت و وفات اور پس ماندگان وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں تجارہ اور اس کے گرد و نواح کی مختصر تاریخ اور تہذیبی و معاشرتی حالات بھی بیان کیے گئے ہیں، تجارہ اور اس کے اس خانوادہ کی یہ سرگزشت عبرت سے خالی نہیں۔ صفحات ۳۶ تا ۵۶ مکرر ہو گئے ہیں اور صفحات ۸۱ تا ۸۸ شامل نہیں ہیں۔

محمد علی جوہر مرتبہ جناب حمیدہ ریاض صاحبہ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۶۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: ڈاکٹر حمیدہ ریاض۔ ۱۰ اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور ۴۴۰۰۱۰ مہاراشٹر۔

مولانا محمد علی جوہر گوناگوں اور متضاد اوصاف و کمالات کا مجموعہ تھے، وہ ادیب و شاعر، انگریزی اور اردو کے ممتاز انشا پرداز، مومنانہ و مجاہدانہ خصوصیات کے مالک، جری، نڈر، بے باک، مذہبی جوش و حمیت سے سرشار اور قوم و ملت کے عظیم رہنما تھے، حمیدہ ریاض صاحبہ کو مولانا کی ذات سے خاص تعلق اور انس رہا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لیے ان کو موضوع بنایا جو چھ ابواب پر مشتمل ہے، ان میں مولانا کے حالات و کمالات اور سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں، پہلے باب میں مولانا کے عہد و ماحول کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے جو ۱۸۵۷ء سے بیسویں صدی کے اوائل تک کے قومی و سیاسی حالات و واقعات کا مرقع ہے، دوسرا باب مولانا کی زندگی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے، تیسرے باب میں ان کی سیرت و اخلاق، دینداری، مذہبی پختگی، قومی جد و جہد،

سیاسی سرگرمی اور قومی رہنماؤں سے تعلقات زیر بحث آئے ہیں، چوتھا باب صحافتی خدمات کا مرقع ہے، پانچویں باب میں مولانا کی نثر نگاری اور چھٹے میں شاعری پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، اس کتاب کی ترتیب و تبویب اور بہتر انداز سے کرنے اور مواد کو سمیٹ کر لکھنے کی ضرورت تھی، تاہم مصنف کی محنت تحسین و ستائش کی مستحق ہے۔

دبستان شبلیؒ کے نامور انشاپرداز مرتبہ جناب اثر انصاری صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۱۵ روپیے ڈیلکس ایڈیشن ۲۵ روپیہ پتہ، نکھار پبلی کیشنز، مئو ناتھ بھنجن۔ یو۔ پی۔

علامہ شبلیؒ جامع کمالات تھے، ان کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت ان کی انشاپردازی ہے جس کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوا ہے، ان کی یہ وراثت ان کے لائق تلامذہ اور انکی یادگار دارالمصنفین سے وابستہ رفقاء مصنفین کے حصہ میں بھی آئی، زیر نظر کتاب میں علامہ شبلیؒ کے علاوہ ان کے دبستان کے ان ممتاز مصنفین اور نامور انشاپردازوں کے حالات اور کارناموں پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم۔ لائق مصنف نے ان سب کے مختصر حالات تحریر کرنے کے بعد ان کے تصنیفی و تحریری کاموں کا مختصر جائزہ لیا ہے اور بعض اہم کتابوں کے مشمولات نقل کر کے ان کی قدر و قیمت دکھائی ہے، شروع میں دارالمصنفین کی تاسیس کا ذکر اور انشاپردازی کی خصوصیات نیز فصاحت و بلاغت کی تعریف و تشریح کی ہے،

جناب اثر نظم و نثر دونوں میں اپنا جوہر دکھاتے رہے ہیں اور وہ پختہ مشق شاعر ہونے کے علاوہ نثر نگاری کا بھی اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ انہیں علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین سے مخلصانہ تعلق ہے اس لیے ان کی یہ کتاب دو آتشہ بن گئی ہے۔

۱۔ عالم عربی کے لیے سب سے بڑا خطرہ
۲۔ امت اسلامیہ کا مستقبل خلیجی جنگ کے بعد

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۳۲ و ۲۴، قیمت درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ باکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

ہندوستان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے زیادہ کسی کو عربوں کے گذشتہ اور موجودہ حالات ورجحانات سے واقفیت نہیں ہے، پہلے رسالہ میں مولانا نے عرب قومیت کو عربوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بتایا ہے جس کو صلیبی عیسائی اور صہیونی یہودی برابر ہوا دے رہے ہیں۔ حال میں ہونے والی خلیجی جنگ اسی سازش کا نتیجہ ہے، جس میں عربی قومیت کے علمبرداروں اور البعث العربی کے قائدین نے کویت، کرد اور عربوں کو اپنا نشانہ بنایا تھا، مولانا کا یہ رسالہ عربی میں بھی چھپا ہے، دوسرا رسالہ قاہرہ میں ہونے والی ایک کانفرنس کے لیے عربی میں لکھا گیا تھا جس کا مولانا عبدالنور ندوی نے سلیس اردو ترجمہ کیا ہے، اس میں خلیج کی جنگ کے اسباب و نتائج اور نقصانات کی نشاندہی کرکے بعض بنیادی اصول اور اہم حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ تاکہ آئندہ پیش آنے والی اس طرح کی صورت حال کا مقابلہ اور خطرہ کا سدباب

کیا جاسکے، یہ دونوں رسالے مولانا کے دردمند دل سے نکلنے والی وہ آہ سوزناک ہے جو دوسروں کے قلب و روح کو بھی گرما اور تڑپا دیتی ہے۔

حیات احمد مرتبہ مولانا عثمان احمد قاسمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۶، قیمت ۱۰ روپیے، پتہ: مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج، جونپور۔

مولانا احمد صاحب مرحوم کی زندگی مدرسہ بدرالاسلام شاہ گنج کی خدمت و ترقی کے لیے وقف رہی جس کو ان کے بزرگوں نے قائم کیا تھا اور جو اس علاقہ کا مشہور دینی مدرسہ ہے، مولانا عرصہ سے اس کے مہتمم تھے اور انھوں نے اپنے دور میں اس کو بڑی ترقی و وسعت دی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولانا عثمان احمد صاحب نے ان کے فضل و کمال اور ان کی عملی و سبق آموز زندگی کا یہ مرقع شایع کیا ہے جس سے ان کی عظمت، عزت، مقبولیت، خدمت، علمی و خاندانی وجاہت، دینداری اور نیک نفسی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

شعور و ادراک از جناب محمد ایوب واقف صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۶۶، قیمت ۸۰ روپیے، پتے: مکتبہ جامعہ۔ دہلی، بمبئی، علی گڑھ (۲) دانش محل، لکھنؤ۔

یہ جناب ایوب واقف کے تیرہ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ایک رپورتاژ اور دو خاکے ہیں، بعض میں ادیبوں اور شاعروں سے اپنی ملاقات کی روداد بیان ہے، اردو کا ایک نایاب مرثیہ اور دانند داوت اور اس کا مصنف میں مرثیہ نگار سید قادر میاں شتر احمد آبادی اور اندراوت کے مصنف نور محمد شاہ کامیاب جونپوری کے حالات تحقیق و جستجو

ہے، جدید مرثیہ اور اندازہ [illegible] پر تبصرہ سیر حاصل نہیں ہے، پارو ایک منظوم افسانہ میں جناب [illegible] زیدی کی ایک مثنوی کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ ایک مضمون میں اردو کے مشہور قدیم ادبی رسالہ "زمانہ" اور اس کے لائق مدیر منشی دیانرائن نگم کا ذکر خیر اور اس کے مستقل عنوان "رفتار زمانہ" کے مشمولات کا جائزہ لیا ہے، محمد قلی قطب شاہ اور جوش ملیح آبادی کی شاعری پر اچھی بحث کی گئی ہے لیکن جوش صاحب کے کلام پر تبصرہ میں توازن نہیں قائم رکھا جا سکا ہے اس کے محاسن کا کم اور معائب کا ذکر زیادہ ہے، ہندی، ہندوستانی اور اردو اور اس کے رسم الخط کے بارے میں مصنف کے خیالات سلجھے ہوئے ہیں، ایک مضمون قرۃ العین حیدر کے خدمات ادب پر تبصرہ کے لیے مخصوص ہے، اختر الایمان سے دو ملاقاتوں کا حال بیان کرتے ہوئے انکے فن پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔ "سیتا محل سے اندس کورٹ تک" میں اپنے محبوب جگن ناتھ آزاد کے ساتھ بمبئی کی ایک سیر کا حال تحریر کیا ہے جس میں مختلف ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بعض عجیب اور دلچسپ انکشاف و اظہار ہے آزاد کے علاوہ واقف کی شیفتگی کا ایک مرکز دارالمصنفین بھی ہے، اس کا اور اس کے ارباب علم و قلم کا ذکر جا بجا کیا ہے، خاکہ نگاری اور شخصیت کی مرقع کشی سے واقف صاحب کو خاص دلچسپی ہے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمن پر مضمون لکھکر انھوں نے ان سے اپنی محبت و عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے، خواجہ احمد عباس پر بھی ان کا مقالہ اچھا ہے، ہر مضمون دلچسپ، شعر و ادب کے مفید نکتوں اور ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہے، دیباچہ بھی اہم ہے اس میں ترقی پسند ادب اور جدیدیت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ قابل غور ہے، نامساعد حالات میں بھی علم و ادب کی خدمت میں منہمک رہنے پر مصنف ستائش کے مستحق ہیں، ان کے قلم میں پختگی بھی آگئی ہے ص۲۴ پر درج رباعی کو خواجہ معین الدین چشتی کی بتانا فاش غلطی ہے، بعض لفظوں کا املا غلط دیا گیا ہے جیسے کھیسے (ص۲۹)، خراساں (ص۳۶) جنت عرضی (ص۲۱۲) اسی طرح بالاستیعاب کو کئی جگہ بالاستعیاب لکھا ہے۔

"ض"

تصنیفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

۱. سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔
۲. سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔
۳. سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔
۴. سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔
۵. سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔
۶. رحمت عالم۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔
۷. خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔
۸. سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔
۹. حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔
۱۰. ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔
۱۱. ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔
۱۲. خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔
۱۳. عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔
۱۴. عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی)
۱۵. نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی)
یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات
۱۷. مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔
۱۸. مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔
۱۹. مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں)
۲۰. برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ سے خطوط کا مجموعہ۔
۲۱. دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے

"منیجر"

VOL. No. 147 MAARIF JUNE 1991 (6)

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہونچ چکا ہے۔ اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

جلد اول اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری اور وطن دوستی کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔

جلد دوم اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سرجدوناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلیؒ کی مضامین عالمگیر اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیرؒ کے بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ پر دوسری اہم اور پُر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرماں روائی کی پوری تاریخ آگئی ہے۔

اسلام میں مذہبی رواداری اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا اسوہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن

نیجر